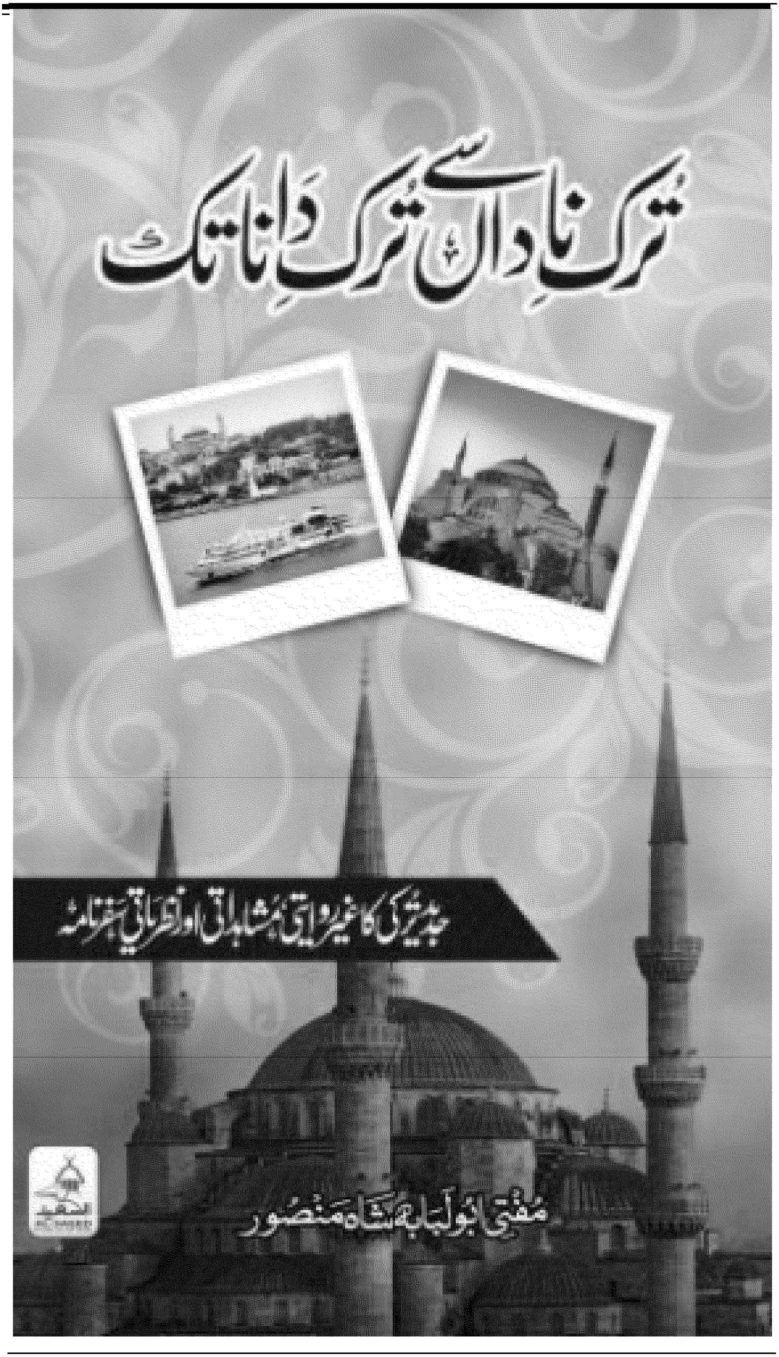

ترکِ ناداں سے ترکِ دانا تک

جدید ترکی کا غیر روایتی، مشاہداتی اور نظریاتی سفرنامہ

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

تُرکِ ناداں سے تُرکِ دانا تک

جدید تُرکی کا غیر روایتی مُشاہداتی اور نظریاتی سفرنامہ

تازہ ترین تصویروں اور نقشوں کے ساتھ

مُفتی ابو لبابہ شاہ منصور

السعید
AL-SAEED
PUBLICATION

فہرست

انتساب 6
مقدمہ..........ترکِ ناداں سے ترکِ دانا تک 7
ایک ہوں مسلم.. 11
متاعِ گم گشتہ کی تلاش.. 17
ہم خرما و ہم ثواب... 23
دو چہرے ایک ملک... 27
سوچ کا فرق.. 34
نقل فسق فسق نباشد.. 40
عقیدت کا ایک انداز... 49
سبق آموز جگ بیتی.. 55
روداد اس زمانے کی... 64
زندان سے پارلیمان تک.. 70
ہیملن سے گولن تک.. 79

آر گنا کون 85

داستان اسلام پسندوں کی 93

ترکی میں انقلاب کی کہانی 98

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے 106

اقتدار میں آنے کے بعد 112

طیّبی نسخے 121

تعاقب اور تعاون 144

عالمی معاشی غارت گروں کی تاریخی شکست 148

دنیا کا دروازہ 154

گولڈن ہارن کے کنارے 158

پھولوں کا ٹیلہ 163

ٹوپی اور تلوار 168

روٹ نمبر 23 173

زوال کی گھٹا کیسے چھٹی؟ 180

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات 186

صبر و شکر......آسان زندگی کا آسان نسخہ 24

سیسی سے گولن تک 200

کے ایف جی اور سی آئی اے 209

صبر و شکر......آسان زندگی کا آسان نسخہ 214

دو جڑواں تحریکیں 221

دیکھا جو تیر کھا کے...... 232
پاک ترک اسکول کی جانب سے خط 241
ایک حل طلب معمّہ 244
اور جب مٹی جھڑنے لگی 248
قالین صاف کرنے والی مشینیں 255
بدلتی رُتوں کی داستاں 261
عجوبے کا ظہور 267
انتہا پسندی کی ایک مثال 273
اسلامی تاریخ کے چند المناک ورق 279
دل کش نعروں کی آڑ میں 286
جان بیٹا خلافت پہ دے دو 293
تاریخ کے چند سبق 301
پاکستان کو ہم نے کیسا پایا؟...... ترکی وفد سے گفتگو 309
تین مسائل تین سبق 322

ترک ناداں سے ترکِ دانا تک

ترکی سے تعلق ترکی کی بنا پر نہیں، عثمانی ترکی کی بنا پر، ہر مسلمان کے دل میں پایا جاتا ہے۔ ہم نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے اکابرِ ہند کے شاندار ماضی میں جہاں اور کئی مثالی کارنامے موجود پائے...... جو دنیا میں اور کہیں کم ہی ملتے ہیں...... وہیں تحریک خلافت، تحریک ترکِ موالات اور تحریک ریشمی رومال کے عنوان سے ''خلافت عثمانیہ'' کی حمایت اور اس کے لیے دل و جان، مال وآن قربان کرنے کے جذبات بھی سنے اور پڑھے۔

جب شعور کی آنکھ کھلی تو حضرت والد صاحب دامت برکاتہم کی کتابوں میں ترکانی عثمانی کی تاریخ پر ایک کتاب موجود تھی۔ اسے نجانے کتنی بار پڑھا اور سلطان غازی خان سے لے کر سلطان سلیمان عالی شان، سلطان بایزید یلدرم اور سلطان محمد فاتح جیسی شخصیات کی خدمات اور کارنامے طبیعت میں نقش ہو کر رہ گئے۔ مصطفیٰ کمال کے لیے ''اتاترک'' کا لقب گھڑنے والوں نے اس ترک ناداں سے جو کام لیے، وہ بھی زندگی کے مختلف ادوار میں پڑھنے کو ملے، حتیٰ کہ ہزاروں ستاروں کے خون اور عظیم قربانیوں سے شبِ تاریک کا پردہ چاک ہوا اور پہلے استاد اربکان پھر طیب اردگان کی شکل میں سحر کے آثار نمودار ہونے کی

اطلاع آنے لگی۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس دوران لکھنے لکھانے کا مشغلہ شروع ہو چکا تھا۔ ترک حضرات سے سفر حرمین کے دوران ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اتنے میں کراچی میں ہماری مسجد واقع گلشن اقبال کے قریب ایک ترکی طالب علم ''اسماعیل کمال اوغلو'' جامعہ احسن العلوم داخلے کے لیے آئے۔ طلبہ نے بتایا کہ ان کو داخلہ تو مل گیا ہے، لیکن رہائش اور کھانے کا نظم نہیں بن سکا۔ احقر نے انہیں اپنی مسجد کے ایک حجرے میں قیام کی سہولت فراہم کی۔ پھر جوان سے گاڑی چھنی تو کئی سال ہمارے ساتھ گزارے۔ تخصص بھی کیا۔ ہم سب انہیں نام سے پکارنے کے بجائے ''ترکی بھائی'' کہتے تھے۔ ان کے ذریعے بہت سے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ جب ترکی جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ دین دار یا غیر جانب دار ترک پاکستانیوں کو ''اکاردش'' یعنی پاکستانی بھائی کہتے ہیں۔ اس توافق پر جو مسرت ہوئی وہ ظاہر ہے۔ بات یہ ہے کہ نظریاتی آدمی کو اپنے تعلقات رنگ، نسل یا زبان کی بنیاد پر نہیں، بلکہ نظریات اور متفقہ مقاصد کی بنا پر تشکیل دینے چاہییں۔ اتفاق سے گلشن میں ہمارے پڑوس کی دوسری گلی میں ''پاک ترک اسکول'' کی قدیم شاخ واقع تھی، جو آج بھی ہے۔ ان کا ہمارے پاس آنا جانا تھا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوگیا کہ یہ ''نادان ترکوں'' کے وارث ہیں، جبکہ ہمارے درد کی دوا تو ''دانا ترکوں'' کی جدوجہد میں ہے۔

ترکی ایک مرتبہ سے زیادہ جا چکا ہوں، لیکن آج تک ''آیا صوفیہ'' دیکھنے بھی نہیں گیا، چہ جائیکہ دوسرے مشہور تفریحی مقامات؟ وجہ یہ تھی کہ آیا صوفیہ کو تو سلطان محمد فاتح نے فتح کرلیا تھا۔ ''بابائے ترک'' مصطفیٰ کمال پاشا نے ''فری میسن'' کے آزاد اصولوں پر عمل کرتے

ہوئے یہاں نماز پر پابندی لگادی۔ اب سلطان فاتح کے ورثا اسے دوبارہ فتح کرنے کے لیے کس طرح کی نظریاتی محنت، کس انداز سے اور کس خشکی پر جہاز چلا کر کر رہے ہیں؟ یہ دیکھنے کی ضرورت تھی۔ عوامی رش کی جگہوں پر ایسے بھی فقیر کا دل گھبراتا ہے، خصوصاً جہاں غیر ملکی سیاح کھڑے ہوکر ''اتاترک'' کے اس کارنامے کی داد دیں کہ اس نے آیا صوفیہ میں نماز منع کر کے اسے دوبارہ ''نمائش گاہ'' میں تبدیل کر دیا ہے، وہاں تو انسان کا دم گھٹنے لگے گا۔

لہٰذا اس سفر نامے میں آپ کو کہیں ترکی کے تفریحی مقامات، قدرتی مناظر، وغیرہ کا تذکرہ نہیں ملے گا، نہ فقیر ایسی جگہوں پر جا سکا۔ اس میں آپ کو صرف اسی تلاش اور جستجو کے نتائج ملیں گے جو مصطفیٰ کمال اتاترک کے خلافتِ قبا چاک کرنے کے بعد اس چاک کو رفو کرنے کے لیے ''دانا ترکوں'' نے انجام دیے یا انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس دوران راقم نے کوشش کی ہے کہ اپنی جستجو اور تفقد کے نتائج بیان کروں۔ بے جا حمایت یا مبالغہ آمیز تعریف نہ ہمارے بڑوں کا وطیرہ ہے نہ طبیعت کو بھاتی ہے۔ مستقبل میں نجانے کیا ہو؟ کیونکہ تحریکوں پر ہر طرح کا وقت آتا ہے، ان پر شب خون بھی مارا جاتا ہے اور ان کے ''فضائی اغوا'' کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ پھر چونکہ ''دانا ترکوں'' کا سفر بہت دھیما، نہایت پھونک پھونک کر ہے۔ اس لیے عام آدمی کو ترکی کی آنکھوں سے نظر آنے والے حالات کے پیچھے چھپے آنکھوں سے نظر نہ آنے والے حالات کا علم نہیں ہو پاتا۔ وہ ترکی میں اسلامی مظاہر کے بجائے مغربی لباس واطوار کو دیکھ کر ستر سالہ جبر سے گذری قوم کی مجبوریاں نہیں سمجھ پاتا، اور وہاں کے تحریکی لوگوں کے متعلق باتوں کو اسلام پسندوں کی بڑک یا مبالغہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے بے جا مبالغہ آمیز حمایت اور معتدل تنقید کے درمیان کا راستہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ مضامین چل پھر کر حاصل کیے گئے سفری مشاہدات ہیں اور کچھ بعد میں لکھے گئے تاثراتی مقالات۔ مقصد اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ آخر میں چند ترک علماء

کے انٹرویو کے بعد وہ مختصر سا مضمون ہے (تین مسائل تین سبق) جس میں کتاب کا عرق کشید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اصل مقصد یہ ہے کہ ہم آنکھیں کھلی رکھیں، کانوں سے ڈاٹ نکالیں، اور سیکھنے کی کوشش کریں کہ ہم جیسے حالات میں، ہم جیسے لوگ، ہماری دنیا میں کیا کر سکتے ہیں؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والوں پر فرشتے نہیں، شیطان اترتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ فرشتہ نہ بنیں تو شیطان کے خلاف جنگ سے پیچھے بھی نہ رہیں۔ ترک دانا فرشتے نہیں، لیکن انسان بننے کی کوشش ہم سے بہتر انداز میں کر رہے ہیں۔ ان کی کوششوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا! اس غیر روایتی سفرنامے کا حاصل ہے۔

☆☆☆

ایک ہوں مسلم ....

گزشتہ دنوں (دسمبر 2012ء) معاصر اخبارات نے ''افغان مسئلے کے حل کے لیے ترکی کی کاوشیں'' کے عنوان سے مؤثر اور پُر مغز اداریے لکھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ترکی اور سعودی عرب دونوں ایسی حیثیت رکھنے والے برادرانہ ملک ہیں جو پاکستان اور افغانستان جیسے دو برادر ممالک کو وقتی دوریاں اور عارضی اختلافات ختم کر کے قریب لانے میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان مذہب و مشرب، جہاد و نصرت اور مشترکہ علاقائی و عالمی مفادات کے علاوہ کئی حوالوں سے ایک دوسرے کے ساتھ گہرے رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں کہ خیر القرون کی اخوت اسلامی اور ہجرت و نصرت کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ قیامت تک کے لیے دونوں ملکوں یا قوموں کو ایک رشتے میں پرو دیا ہے۔ دوسری طرف ترکی کا تاریخی ماضی بھی بڑا شاندار ہے۔ ماضی قریب میں وہ سیکولرازم کے بالجبر مسلط کیے جانے کے بعد جھرجھری لے کر بیدار ہوا ہے اور بہت حوصلہ و ہمت اور حکمت و فراست کے ساتھ اپنی اصلی شناخت کی طرف لوٹنے اور مسلم برادری کی وحدت کے لیے اپنی سی کاوشیں بروئے کار لا رہا ہے۔ ہم

پاکستانی چونکہ ''تحریک خلافت''، ''تحریک ترک موالات'' اور ''تحریک ریشمی رومال'' کے وارث ہیں، اس لیے ترکی اور ترک عوام کی ہم سے قربت اور فطری انسیت بھی محتاج بیان نہیں۔ معاصر ترکی کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کے لیے اس کی گزشتہ سو سالہ تاریخ کے مطالعے کے ساتھ موجودہ ترکی معاشرے میں اسلام پسند قوتوں کے طریق کار اور طرز جُہد کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے استفادہ ہمیں بہت سی بند گرہیں کھلنے اور دبیز حجابات کے ہٹنے میں مدد دے سکتا ہے۔

ترکی میں 70 سالہ طویل جابرانہ لادینی نظام... جس کے سنگدلانہ جبر و قہر پر پڑوس میں موجود یورپ کے انسانی حقوق پرست اور دنیا بھر میں موجود ڈرّاتی این جی اوز مکمل طور پر خاموش رہیں... کے دوران وہاں کے اسلام پسندوں پر کیا گذری؟ اور انھوں نے کس طرح اپنے دین و مذہب سے چمٹے رہنے اور رفتہ رفتہ قومی ملّی دھارے میں واپس آنے میں کامیابی حاصل کی؟ اس کے لیے ہم اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں تو کئی عناصر ایسے ہیں جن کی کوششوں سے امید افزا حالات پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سرفہرست وہاں کے مشہور عالم دین اور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت شیخ محمود آفندی حفظہ اللہ ہیں۔ اس وقت روئے زمین پر خواجہ خواجگان حضرت خواجہ خان محمد صاحب قدس سرّہ کے بعد دو ہی ہستیاں ہیں جو سلسلۂ نقشبندیہ کی شرق و غرب میں امام ہیں۔ ایک ہمارے شیخ و مرشد حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی دامت برکاتہم العالیۃ اور دوسرے حضرت شیخ محمود آفندی الخالدی المجدّدی دامت فیوضھم۔ جس طرح ہمارے حضرت سے اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر میں، تمام آباد براعظموں میں، دین کی اشاعت و تبلیغ اور تزکیۂ نفوس کا کام لیا، اسی طرح نقشبندی سلسلے کے ان دوسرے بزرگ سے بھی اللہ تعالیٰ نے ترکی میں... یعنی اس ملک میں جو خلافت کی بلندی سے سیکولرازم کی پستی میں چلا گیا تھا... تجدید و احیائے دین کا کام لیا۔ آپ ترکی

کے مشہور بزرگ حضرت علی حیدر اخسخوی کے خلیفہ مجاز تھے جو حضرت علی رضا البزار کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ یہ سلسلہ آگے جا کر حضرت مولانا خالد نقشبندی قدس سرّہ سے جا ملتا ہے، جو دیارِ شام سے برصغیر آئے اور شیخ المشائخ حضرت مرزا مظہر جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۰۶ھ - ۱۲۴۰ھ) کی خدمت میں رہ کر اجازت و خلافت پانے کے بعد واپس جا کر اس سلسلے کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ مشہور فقیہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے 30 رسالوں میں سے ایک رسالہ انہی کے مناقب و حمایت کے لیے لکھا گیا ہے، جس کا نام "سلّ الحسام الهندی لنصرة مولانا خالد النقشبندی" ہے۔ تاریخ دعوت وعزیمت (۳۶۸/۴) میں حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔

حضرت شیخ محمود آفندی 1929ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر 83 سال کے لگ بھگ تھی۔ فقیر کو جب ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو وہ نہایت علیل تھے۔ یہ عاجز دو دن تک ان کی اقامت گاہ پر حاضری دیتا رہا، لیکن طبیعت اس درجے ناساز تھی کہ محض زیارت سے بھی مشرف نہ ہو سکا۔ تیسرے دن ان کے اجل خلیفہ جناب حضرت شیخ حسن آفندی دامت برکاتہم نے بندہ پر شفقت فرمائی اور خود میرے ساتھ گئے۔ حضرت الشیخ کے تعلیمی امور کے ذمہ دار جناب محمود شوکت آفندی بھی ساتھ ہو گئے۔ ان کی معیت میں حضرت کے حجرے میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مسنون کروٹ پر لیٹے تسبیح ہاتھ میں تھامے ذاکر و صامت تھے۔ ہماری خوش نصیبی کہ کافی دیر زیارت اور توجہات سے سعادت مند ہونے کا موقع ملا۔ آپ کے دو جلیل ترین خلفاء کو شہید کیے جانے کے بعد حضرت کے حفاظتی اقدامات بھی نہایت سخت کر دیے گئے ہیں۔

آپ کے شیخ کا تعلق جارجیا اور شام کی طرف واقع ترکی کے مشرقی علاقے سے تھا۔

آپ ان کے مشورے سے سرحدی علاقے سے اٹھ کر مرکزی شہر استنبول تشریف لے آئے۔ یہاں سلطان محمد فاتح سے منسوب علاقے ''فاتح'' میں ''اسماعیل آغا'' نامی علاقہ شہر کے پوش علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں شیخ الاسلام حضرت اسماعیل آغا آفندی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد تھی جو خلافت عثمانیہ کے زمانے میں ''شیخ الاسلام'' کے لقبِ جلیل سے ملقب تھے۔ سلطان محمد فاتح کے زمانے میں قسطنطنیہ فتح ہوا تو اس مسجد کے قریب ایک قدیم چرچ تھا جو عیسائی حضرات کے نزدیک آیا صوفیہ کے بعد عظیم حیثیت رکھتا تھا۔ عیسائیوں کے دو مشہور فرقوں میں سے کیتھولک فرقے کا مرکزی مقام ''ویٹی کن سٹی'' روم میں واقع سینٹ پیٹر کا کلیسا ہے۔ آرتھوڈکس فرقے کے نزدیک یہی مقام اسی چرچ کو حاصل تھا جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔ اس میں ایک وسیع وعریض گول مینار ہے جس کے اوپر گنبد کی شکل میں چاروں طرف ہوا اور روشنی کے لیے خوبصورت کھڑکیاں اور روشن دان ہیں۔ حضرت جب اس محلے میں آئے تو آپ کو بیک وقت دو چیلنج درپیش تھے۔ ایک تو یہ کہ آرتھوڈکس فرقے کے عیسائی حضرات اس چرچ کے گرد واقع تمام عمارات کو خرید کر ویٹی کن سٹی کے متوازی عیسائی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لیے دنیا بھر میں موجود اس فرقے کے لوگوں نے تجوریوں کے منہ کھول رکھے تھے۔ یہ علاقہ ''گولڈن ہارن'' کے قریب اور شہر کے قیمتی ترین علاقوں میں سے ایک تھا۔ دوسرا یہ کہ حضرت کی جو مسجد اس علاقے میں تھی، یہ گیارہویں صدی میں تعمیر کی گئی ایک تاریخی مسجد ہے۔ اس کے اندرونی ہال کو عین خانہ کعبہ کی اندرونی پیمائش کے مطابق بنایا گیا تھا اور یہ اپنے وقت کے شیخ الاسلام کی مسجد تھی، لیکن سیکولرازم کی تباہ کاریاں دیکھیے کہ آپ کو یہاں کام کرتے ہوئے 18 سال ہو گئے تھے، کوئی نمازی مسجد میں نہ آتا تھا۔ گویا دوسرا چیلنج آپ کو اندرونی طور پر درپیش تھا کہ غیروں کی دست برد سے اپنی میراث کو بچانے کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں کو کس طرح متوجہ کیا جائے کہ اگر وہ مذہب چھوڑ بیٹھے ہیں تو

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے دوسرے مذاہب سے جو ہم سے مکالمہ اور مقارنہ یا مقاربہ کے لیے بے چین رہتے ہیں، اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے یا سیکولر کہلوانے کے بعد اپنے مذہبی منصوبوں سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ وہ تو صبح شام اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور خطرہ ہے کہ فلسطین میں اسرائیل کی طرح استنبول (اسلام بول) میں دوسرا ''ویٹی کن سٹی'' نہ بن جائے۔

حضرت کے خلفاء فرماتے ہیں کہ حضرت الشیخ نے اس مسجد میں 30 سال امامت کے فرائض انجام دیے۔ پہلے 18 سال تک کوئی مسجد نہ آتا تھا۔ حضرت خود گھر گھر جاتے اور ساکنان محلّہ سے کہتے کہ میں ہمہ وقت مسجد میں ہوتا ہوں۔ اگر کوئی کام پڑ جائے تو مجھے یاد رکھنا، خادم کو ہر مشکل میں اپنے ساتھ حاضر پاؤ گے۔ اٹھارہ سال کے بعد اللہ اللہ کر کے برف تڑخی، جمود پگھلا، شیخ کی توجہات اور دُعائیں رنگ لائیں اور مسجد میں باجماعت نماز شروع ہوگئی۔ آج یہ عالم ہے کہ اس محلے میں کوئی گھر، ایسا نہیں جہاں سے ڈاڑھی اور عمامہ کے مسنون حلیے میں مرد اور مکمل شرعی پردے میں خاتون آ جا نہ رہے ہوں۔ حضرت نے اپنے مریدوں کو تاکید کی کہ اس پورے علاقے پر کڑی نظر رکھیں۔ کوئی بھی مکان، جائیداد بکنے لگے تو اسے خریدنے میں پہل کریں۔ مذکورہ چرچ کے قریب ایک اور مسجد تھی۔ حضرت نے اس میں ''مثنوی شریف'' کا درس شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ یہ درس اتنا مقبول ہوا کہ اس مسجد کا نام ہی ''مثنوی خانہ'' پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دونوں محاذوں پر کامیابی عطا کی۔ آپ کے اپنے مسلمان بھائی مسجد سے ایسے جڑے کہ اس کے ساتھ عظیم خانقاہ، مدرسہ اور فلاحی ادارہ تعمیر کر ڈالا جو آج ملک بھر میں احیائے اسلام یا رجوع الی الاسلام کا استعارہ وعلامت سمجھا جاتا ہے۔ عیسائی حضرات قریب کی جگہیں کیا خریدتے، تالا لگے چرچ کو بیچنے تک کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس جدوجہد میں حضرت کے دو اجل خلفا شہادت

پا گئے۔ جیسا کہ بندہ نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان کو نامعلوم قاتلوں نے پاسبانیٔ حرم کی پاداش میں ناگہانی حملہ کر کے شہید کر ڈالا...... لیکن علم بلند رہا، قافلہ چلتا رہا اور بہت سے خوش نصیب اس میں جوق در جوق شامل ہوتے رہے۔ حضرت کو جو بعض معاصرین ''مجدد'' کہتے ہیں، اس کی وجہ محض اتنی نہیں کہ آپ نے ''عیسائی ریاست'' بنائے جانے کے خطرے سے دو چار علاقے کو مساجد، مدارس، خانقاہ اور فلاحی مرکز سے پُر کر ڈالا، جس مسجد میں اذان نہ ہوتی تھی، وہاں آج جمعہ کی اذان سے پہلے مسجد بھری ہوتی ہے اور نماز کے بعد ذکر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ بلکہ حضرت کا کام اس سے بھی آگے کا ہے، جس کا تذکرہ نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

متاعِ گم گشتہ کی تلاش

ایک معاصر قوم کی طرف سے ماضی کی تلاش کے سفر کی دل گداز داستان

☆

پاکستانی مدارس ترکی کے طلبہ کو اعلیٰ دینی تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ ان حضرات کی متاع گم گشتہ کی بازیابی کی جدوجہد میں برادرانہ حصہ ڈالا جاسکے۔

☆☆☆

مسجد کو آباد کرنے کے ساتھ حضرت شیخ محمود آفندی دامت فیوضہم کی توجہ مدرسہ کے قیام پر تھی جو پہلے ہدف سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ مسجد میں صف بھر نمازی تو آ ہی گئے تھے لیکن ایک سیکولر قانون والے ملک میں جہاں فوج کو سیکولر قانون کے نفاذ کا آئینی طور پر ذمہ دار بنایا گیا تھا، دینی تعلیم گاہ کی بنیاد رکھنا یا دینی تعلیم کا آغاز کرنا شوریدہ سر دریا کی لہروں میں تختہ بند ہو کر اُلٹی سمت تیرنے کے مترادف تھا۔ بالخصوص جبکہ 1924ء میں خلافت کے ادارے یا اصطلاح کو باقاعدہ اسمبلی سے منسوخ کروا دینے کے بعد 1926ء میں فقہ اسلامی بھی بحیثیت قانون عدالتوں سے ختم کر دی گئی تھی۔ پھر ترکی کا عربی و فارسی سے مشابہہ رسم الخط تبدیل کر کے انگریزی جیسا بنانے اور بچوں کو سرکاری تعلیم لازماً دلوانے کے قانون کی وجہ

سے دینی تعلیم کا آغاز بھاری چٹان اُٹھا کر ڈھلوان پر چڑھنے جیسا جاں گسل کام تھا۔ حضرت شیخ نے ہمت نہ ہاری۔ خطرہ یہ تھا کہ یہ صورتِ حال مزید ایک عشرہ تک جاری رہی تو پڑھنے والے تو ویسے بھی نہیں، آیندہ پڑھانے والے بھی نہ ملیں گے۔ بڑے بڑے علماء شہید کیے جا چکے تھے۔ کچھ نظر بند تھے۔ ''آفندی'' کے لفظ پر پابندی تھی۔ یہ لفظ فارسی کے ''اخوند'' جیسے الفاظ سے قریب المعنی ہے۔ لفظی مفہوم تو ''صاحب جناب'' کا ہے، لیکن استعمال میں علماء ومشائخ کے ساتھ خاص ہے۔ الغرض علمی سلسلہ جاری نہ رہنے کی وجہ سے ''بلیک آؤٹ'' جیسی صورتِ حال پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اللہ اللہ کر کے ''موسیٰ امجا'' نامی حضرت کے ایک مرید اپنے گھر کے تہہ خانے میں مکتب کھولنے پر تیار ہو گئے۔ ''امجا'' ترکی زبان میں ''چچا'' کو کہتے ہیں۔ موصوف چونکہ پورے محلے میں معمر اور معزز تھے، اس لیے ہر چھوٹا یا بڑا ان کو ''امجا'' کہتا تھا اور یہ لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا تھا۔ اس زیرِ زمین مکتب سے شروع ہونے والا سلسلہ آج ماشاء اللہ بڑے بڑے مدارس کی شکل میں ڈھل چکا ہے۔ زیرِ زمین سے برسرِ زمین تک کے سفر کی داستان ایمان افروز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ ہم اس کے تذکرے سے فارغ ہوں تو پھر حضرت آفندی حفظہ اللہ کی محنت کے تیسرے رُخ یعنی عوام یا جدید تعلیم یافتہ طبقے پر محنت کی طرف آتے ہیں۔

اس عاجز کو وہ تہہ خانہ یا گھر دیکھنے کا موقع تو نہ مل سکا جہاں سے اس مبارک سلسلے کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن حضرت کے خلفاء یا وکلاء کے علاوہ ثقہ لوگوں سے علم دین کے احیا کے لیے کیے جانے والے مجاہدات بتواتر سننے کو ملے۔ حضرت اپنی دُعاؤں اور توجہات کے ساتھ کمال درجے کی حکمت وفراست سے کام لیتے تھے۔ کامل درجے کے اخفاء کے ساتھ بچوں کو اعلیٰ انعام اور ان کے والدین کا مسلسل اکرام جاری رہتا تھا۔ ترکی کا نورانی قاعدہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ نقشبندی سلسلے کے ایک بڑے شیخ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اس

قاعدے کے بعد عربی شروع ہوتی تھی۔ جو طلبہ ''نصر ینصر'' کی گردان یاد کر لیتے، ان سے فرماتے تم ''والی شہر'' سے افضل ہو۔ جو طالب علم ''حروف جر'' پڑھ لیتا، حضرت اس سے کہتے کہ تم اب جا کر کہیں پر یہی حروف جر پڑھاؤ، پھر تمہیں اگلا سبق دیں گے۔ وہ عرض کرتا: حضرت کیا پڑھاؤں اور کیسے پڑھاؤں؟ حضرت فرماتے: ''ہمارے ہاں علم اصل نہیں، عمل اور تبلیغ اصل ہے۔ تم انہیں تصوف پڑھاؤ اور تربیت کرو۔ یہ علم نہ عوام کو آتا ہے نہ علماء کو۔ تم نے جتنا تصوف سیکھ لیا ہے، اسے قلیل علم کے ساتھ جوڑ کر پڑھاؤ گے تو مرجع خلائق بن جاؤ گے۔'' آج ترکی کا دینی نظام تعلیم تعلیم و تربیت یا تعلیم و تصوف کے حسین امتزاج پر مشتمل ہے۔ اس میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات با قاعدہ سبقاً پڑھائے جاتے ہیں۔ تمام اساتذہ و طلبہ بالالتزام ذاکر و شاغل ہوتے ہیں۔ اس کی برکات ہیں کہ علم کم ہے، لیکن اس کی افادیت و قبولیت ماشاء اللہ توقعات سے زیادہ اور روز افزوں ہے۔

حضرت کے ابتدائی زمانے کے ایک شاگرد نے ان سے 8 سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا اور 16 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ اب ماشاء اللہ وہاں کے ''استاد الکل'' جیسا مقام رکھتے ہیں۔ بندہ کی ان کے ساتھ ایک سے زیادہ نشستیں رہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس زمانے میں کتابیں تو ہوتی نہیں تھیں، جو تھیں ان کا رسم الخط نئی نسل نہ سمجھتی تھی۔ پولیس اور خفیہ والے چھاپے مارتے تھے کہ بچہ اسکول جا رہا ہے یا نہیں؟ اس لیے حضرت کی ایک تاکید تو یہ تھی کہ جو بچہ ہمارے پاس شام کو پڑھے، وہ فی الحال اسکول سے ناغہ نہ کرے۔ دوسرے انہوں نے کم وقت میں آسان اور زیادہ مقدار میں تعلیم کے لیے دینی تعلیم کو آسان بنانے کے لیے جہاں تک ممکن ہو، دینی شعائر و ارکان کو اشارے کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لیے دینی مفاہیم کو اشارہ پر ڈھالنے کے لیے خصوصی

محنت کی گئی۔ مثلاً: اسلام کے پانچ ارکان ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کے لیے پانچ اشارات مقرر کیے گئے۔ موصوف نے مجھے اشاروں کے ذریعے تمام ارکان سمجھا کر دکھائے اور فرمایا کہ حضرت کا کہنا تھا اس طرح بات آسان بھی ہو جاتی ہے اور دل و دماغ میں نقش بھی دیرپا انداز میں ہوتی ہے۔ صرف ونحو کی گردانوں کے لیے انہوں نے انگلیوں پر پڑھنے کا ایک خاص طریقہ بتایا اور ماضی مضارع کی گردان پڑھ کر سنائی۔ احقر نے جب یہ سنا تو عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کے ہاتھوں ایک نصاب ترتیب دلوایا ہے، جس میں پوری عربی زبان چار قسم کے الفاظ اور آٹھ قسم کے اشاروں میں سمٹ گئی ہے۔ اس کو انہوں نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنا۔ پھر تقاضا کیا کہ کیا آپ ہمارے کچھ علماء کو تربیت دے سکتے ہیں؟ بندہ کے پاس نہ کتاب تھی نہ لیپ ٹاپ۔ عذر کیا، مگر انہوں نے ہاں کروا کے ہی چھوڑا۔ اگلے دن مقررہ وقت پر علمائے کرام تشریف لے آئے۔ بندہ نے یادداشت کے سہارے زبانی ہی تربیت کروانے کی اپنی سی کوشش کی۔ پہلا موقع تھا کہ تربیت عربی میں دینی تھی اور کتاب وغیرہ کچھ ساتھ نہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ بخیریت کورس اختتام کو پہنچا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اگلے روز جبکہ احقر کی واپسی کی پرواز تھی، اصرار ہوا کہ تبلیغی مرکز میں کچھ مزید علماء بھی یہ کورس کرنا چاہتے ہیں۔ واپسی کی تیاری، کچھ کتابوں کی خریداری اور ایک دو اہم ملاقاتیں نمٹانی تھیں، لیکن معلوم ہوا کہ ان علماء میں کچھ معمر حضرات بھی ہیں اور کچھ انڈونیشیا، ملائشیا وغیرہ سے آئے ہوئے حضرات بھی شوق رکھتے ہیں تو وہاں بھی حاضری دینی پڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا اور ایک حقیر سی کاوش پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

بات دور چلی گئی۔ جبر وقہر کے اس دور میں جو انسانی حقوق کے علمبرداروں کے ناک تلے پورے زور وشور سے جاری تھا، علمائے کرام کی حیرت انگیز قربانیاں، اپنے مقصد سے لگن کی روشن مثالیں ہیں۔ جو حضرات دیہات میں بچوں کو پڑھاتے تھے، وہ کاشت کاری کا

لباس پہنتے اور کتابوں کے ساتھ کھیتی باڑی کے آلات تیار رکھتے۔ گاؤں سے باہر اونچی جگہ یا درخت پر دو بچوں کو بٹھا دیا جاتا تھا۔ جیسے ہی فوجی جیپ آتی نظر آتی، تمام طلبہ کتابیں چھوڑ کر کھیت میں پہنچ جاتے اور دل جمعی سے قومی زرعی پیداوار کے اضافے میں جت جاتے۔ شہر کے اساتذہ نے تو عجیب ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ترکی میں یورپ کی طرح ریل کا سفر سستا اور آرام دہ ہے۔ یہ حضرات سستی قیمت پر مستقل نشستیں لے لیتے۔ صبح صبح شاگردوں سمیت ریل گاڑی کا ایک ڈبہ مخصوص کر کے سفر شروع کر دیتے۔ سفر جاری رہتا اور زمینی سفر کے ساتھ علمی سفر چلتا رہتا۔ آخری منزل پر اُترنے کے بعد یہ لوگ کچھ دیر سستاتے اور پھر استاد اور شاگردوں پر مشتمل ’’مسافروں کی یہ جماعت‘‘ واپسی والی ریل پر سوار ہو جاتی اور وقفے کے بعد والے اسباق مکمل کرتے ہوئے شام کو بخیریت گھر پہنچ جاتے۔ اس دور کے بہت سے طلبہ ایسے ہیں جنہوں نے اسی طرح آہنی چھکڑے پر بیٹھ کر ’’سفر در سفر‘‘ کی شکل میں تعلیمی مراحل طے کیے۔

علم دین پر کیا موقوف ہے! نماز پر بھی اسی طرح کی پابندی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے سالہا سال تک اشاروں سے نماز پڑھی۔ دفتر میں مصطفیٰ کمال پاشا جس نے معبود حقیقی کے سامنے عابد کے جھکنے پر پابندی لگا رکھی تھی، کی تصویر دیوار پر ٹنگی اپنی بے بسی اور بدبختی پر گریہ کناں رہتی اور تلواروں کے سائے میں سجدہ کرنے والی قوم کے فرزند سنگینوں کے سائے میں اپنے مالک کے سامنے اشاروں اشاروں میں سر بسجود ہوتے رہتے۔

ترکی کے موجودہ دینی نظام تعلیم کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ پہلے پانچ سال ’’ابتدائیہ‘‘ شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ایک سال ’’تکامل‘‘ کا ہوتا ہے۔ اس میں بعض علوم اختصاصی طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پانچ سال ’’تخصص‘‘ کے نام سے ہوتے ہیں۔ اس میں بعض منتخب طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ پڑھانے والے اساتذہ کی اکثریت تو وہی ہے

جنہوں نے شمال یا شمال مشرقی ترکی میں جو دارالحکومت اور بڑے شہروں سے دور کوہستانی علاقوں پر مشتمل ہے، کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کرلی۔ ایک قلیل تعداد پاکستان سے پڑھ کر گئی ہے۔ کچھ حضرات نے شام کے مدارس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ بہرحال بہت کچھ ضرورت ہے کہ پاکستانی مدارس میں ترکی کے طلبہ کو اعلیٰ دینی تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ ان حضرات کی متاعِ گم گشتہ کی بازیابی کی جدوجہد میں برادرانہ حصہ ڈالا جاسکے۔

ہم خرما وہم ثواب

ترکی کے تعلیمی نظام میں دینی تعلیم کے کسی نہ کسی درجے میں بقا کا ایک سبب ''امام وخطیب اسکول'' تھے۔ یہ اسکول اس نظریے پر قائم کیے گئے تھے، جسے ہمارے ہاں سعودی تعلیمی نظام کے ڈھانچے کے تعارف کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ شروع میں ایک حد تک.... مثلاً دسویں جماعت.... تک پورے ملک کو اکھٹے تعلیم دی جائے۔ بعدازاں جس نے عالمِ دین بننا ہو وہ ''کلیۃ الشریعۃ'' میں جائے، طبیب بننے کا شوقین ''کلیۃ الطب'' میں اور انجینئرنگ کا مزاج رکھنے والا ''کلیۃ الھندسہ'' میں، وغیرہ وغیرہ۔ ترکی میں اس طرح کے اسکولوں کے ذریعے یہ فائدہ ہوا کہ دینی تعلیم کے ٹھیٹھ روایتی مدارس معدوم یا کالمعدوم ہونے کے باوجود کسی نہ کسی شکل میں علمِ دین کا چراغ جلتا رہا۔ دینی طبقے نے ''امام وخطیب اسکول'' کو اپنی محنتوں کا محور بنالیا اور اس کے ذریعے بچی کھچی پونجی کو سنبھالے رکھنے پر توجہ دی۔ اس سے جہاں مساجد کو جیسے تیسے امام وخطیب میسر آجاتے تھے، وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ آگے کالج اور یونیورسٹیوں میں جانے والی نسلِ نو کی تربیت بھی کسی حد تک ممکن ہو جاتی تھی۔ اس وقت ترکی کے وزیرِاعظم سمیت اسلام پسندوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے

جس نے شروع میں ان اسکولوں میں پڑھا اور پھر وہاں کے ان لوگوں کے فیض کی بدولت جو سیکولرازم کی تیز آندھی میں دین و مذہب کا ٹمٹماتا چراغ روشن رکھنے کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے تھے، انہیں دینی ذہن اور اسلامی سوچ ملی اور آج وہ جدید ترکی کے بہت سے شعبوں میں خدمات انجام دینے کے ساتھ نظریاتی و تبلیغی محنت میں بھی جڑے ہوئے ہیں۔

یادش بخیر! ہمارے کمانڈر صدرِ مشرف جناب پرویز مشرف صاحب ترکی کے سیکولرازم کے بڑے دلدادہ اور اس سیکولرازم کو مرکزِ خلافت میں نافذ کرنے والی ''برادری'' کی تاریخی شخصیت مصطفیٰ کمال پاشا صاحب کے بڑے گرویدہ تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ ''مدرسۃ الامام والخطیب'' کے ماڈل کی پاکستان میں شجرکاری کی جائے۔ یہ ''قومی خدمت'' اگر پاکستان کے دنیوی تعلیمی نظام کی جگہ پر کرنے کے لیے ہوتی تو کیا بات تھی کہ ترکی کا دنیوی نظامِ تعلیم اپنے معیار میں چند ایک یونیورسٹیاں چھوڑ کر بقیہ مغربی تعلیمی اداروں کے پائے کا ہے۔ لیکن یہ کوشش تو پاکستان کے اعلیٰ دینی نظام کو سبوتاژ کرنے کے لیے تھی، کہ اس کا معیار گھٹ کر نیم عالم جیسا ہو جائے۔ لہٰذا وہی حشر ہوا جو اللہ رب العزت کے تکوینی نظام سے ٹکرانے والوں کا ہوتا ہے۔ آج دیکھا جا سکتا ہے کہ نیک نیت فقیر منش علماء کے بنائے ہوئے کچی دیواروں اور بوسیدہ چھتوں والے مدرسے جگہ جگہ شان سے اپنے کام میں لگے ہیں، جبکہ خانہ کعبہ میں چھ مرتبہ داخلے کا دعویٰ کرنے والے ابوجہلِ زمان کا کراچی کے حاجی کیمپ کے ساتھ متصل بنائے گئے عظیم الشان ''ماڈل مدرسہ'' میں الّو بول رہے ہیں۔ کوئی شک نہیں روحانیت پر مشتمل کام روح کے اخلاص سے ہی چلتے ہیں۔ مادّیت پرست جب اپنی بری نیتوں کے ساتھ اس میدان میں مٹرگشت کرنے آئیں تو ان کی کھوٹی پونجی لپیٹ کر ان کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔

برسبیل تذکرہ سنتے چلیے! ہمیں ترکی کی دنیوی جامعات اور وہاں پڑھنے والے ملکی و غیر

ملکی طلبہ سے بھی نشست کا موقع ملا۔ یہ دیکھ کر نہایت خوشگوار حیرت ہوئی کہ ایک تو ترکی کا نظامِ تعلیم قابلِ تعریف حد تک معیاری ہے۔ ہمارے پاکستانی طلبہ بلا وجہ یورپ، امریکا و آسٹریلیا کی چند کمروں پر مشتمل ‘‘یونیورسٹیوں’’ کے دیوانے ہوتے ہیں، جبکہ وہاں چند ایک نامور یونیورسٹیوں کو چھوڑ کر دال کا حال کافی پتلا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب سابق صدر آئی بی اے اور حالیہ وائس چانسلر محمد علی جناح یونیورسٹی نے ایک سیمینار میں بتایا کہ ہمارے یہاں کے اشتہارات میں عظیم یونیورسٹیاں کہلانے والے مغربی تعلیمی ادارے چند کمروں پر مشتمل تجارت گاہ میں تعلیم کا بیوپار کر رہے ہوتے ہیں۔ ترکی میں ایک طرف تو پاکستانی حضرات کے لیے قدم قدم پر دل و آنکھیں بچھائی جاتی ہیں۔ ‘‘تحریکِ خلافت’’ اور ‘‘تحریکِ ریشمی رومال’’ کی وجہ سے ترک پاکستانیوں کو ‘‘اکاردش’’ کہتے اور سمجھتے ہیں۔ ‘‘اکاردش’’ کا معنی ترک زبان میں اس چچازاد بھائی کا ہے، جو آپ کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر دشمن سے لڑے اور پشت سے ہونے والے وار کو خود پر لے لے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں اور ہوٹل مالکان تک کو دیکھا گیا ہے کہ پاکستانی حضرات سے انتہائی محبت بھرا سلوک کرتے ہیں اور بعض اوقات ان سے اجرت یا قیمت بھی وصول نہیں کرتے۔ تعلیم یافتہ اسلام پسند طبقہ تو صدقے واری جاتا ہے۔ اس عاجز کو کراچی اختر کالونی کے ایک رہائشی طالب علم ملے، جو سرکاری خرچ پر طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ترکی حکومت انہیں تعلیم، رہائش اور علاج کے علاوہ 500 لیرے ماہانہ جیب خرچ دے رہی تھی۔ ایک لیرا 52 روپے کے برابر تھا۔ یورپ میں ہماری تحقیر و تذلیل بھی کی جاتی ہے اور ہمیں تعلیم کے نام پر ایسی بدتہذیبی اور وطن بیزاری سکھائی جاتی ہے کہ ہمارے نوجوان وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں، واپس اپنے آنگن میں آ کر کم ہی کوئی چہچہانا پسند کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ترکی کی تعلیم بھی معیاری ہے اور وہاں ہم سے سلوک بھی بہت بہتر بلکہ قابلِ فخر ہوتا ہے۔ اگر کوئی پڑھ لکھ کر وہیں رہ جائے تو کوئی

برائی نہیں۔ دو برادر ملکوں کو قریب لانے اور روحانی رشتوں کا پل تعمیر کرنے میں حصہ ڈالنا دین و دنیا کی سرخ روئی یا ''ہم خرما و ہم ثواب'' والی بات ہے۔

استنبول کی پاکستانی برادری نے جو ماحول وہاں مل جل کر قائم کیا ہے، وہ بھی دل موہ لینے والا ہے اور ترک بھائیوں کا ان سے تعاون ایسا خوش کن اور دل رُبا ہے کہ انسان کو پاکستانی ہونے پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔

دو چہرے ایک ملک

موجودہ ترکی کے دو چہرے ہیں۔ ایک وہ بجھا ہوا داغدار چہرہ ہے، جسے سیکولرازم کے جبری تسلط نے ترکی کے کینوس پر بکھیرا اور دوسرا وہ روشن اور تابدار چہرہ ہے جسے حضرت شیخ محمود آفندی حفظہ اللہ و اکرمہ اور ان جیسے دوسرے علماء و مشائخ (بدیع الزمان سعید نورسی، شیخ سلیمان پاشا، شیخ سکندر پاشا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ سب کی مساعی کو قبول فرمائے) اور ان کے ہاتھوں تربیت پانے والے اسلام پسند تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان حضرات کو ''بابائے ترک'' کے پھیلائے ہوئے کانٹے چننے میں جتنی بھی دقت پیش آ رہی ہے، یہ اپنی بصیرت و روحانیت اور تدبیر و فراست کے بل بوتے پر تحمل و بردباری کے ساتھ اس کا سامنا کر رہے ہیں۔ مشکلات کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف ترکی دنیا کا واحد ملک ہے جس میں فوج ملکی آئین کی محافظ ہے اور ملک کا آئین ہر حال میں سیکولر رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ کمال اتاترک انتظام کر گئے کہ ملک کا قانون سیکولر ہو اور فوج اس قانون کی نگہبان رہے کہ کہیں اسے بدل نہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے آج ترک فوج افغانستان میں برسرِ پیکار ہے، جبکہ ترک کے اسلام پسندوں کے دل، چاہے وہ حکومت میں ہوں یا عوام میں، افغان مسلمانوں کی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ دوسری طرف سیکولر سیاست دان اور مراعات یافتہ طبقہ

عالمی طاقتوں خصوصاً بعض نادیدہ طاقتوں (جنہوں نے خلافت کے خاتمے اور اسرائیل کے قیام کے لیے ہر حربہ آزمایا) کی مدد سے اسلام پسندوں کا راستہ روکنے اور کامیابیوں کو ناکامی سے بدلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بائیں بازو والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بیرون ملک بھی اپنے ملک کی اس ثقافت سے دنیا کو روشناس کروائیں جو اَب خود ترکی میں بھی تھکتی ہارتی جا رہی ہے۔ وہ باہر کی دنیا کو “تقسیم اسکوائر” کی سڑکوں پر ہونے والی عیش پرستوں کی مٹرگشت سے ہی واقف کروانے میں فخر اور عافیت محسوس کرتے ہیں۔ “فاتح” کے علاقے “چہار شنبہ” میں “اسماعیل آغا” نامی محلے کی روحانیت ونورانیت سے آگاہی نہیں ہونے دیتے۔ ہمارے ملک کا ایک جانبدار طبقہ بھی اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ترکی کے یک چشم فلم سازوں کی فلمیں اُردو میں منتقل کر کے ناظرین کو دکھائے۔ کچھ لوگ یہی کام مصر کے حوالے سے بھی کر رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے حضرات کے پیچھے اسرائیل نواز بھارتی ہندو مارواڑی سیٹھوں کی بھاری سرمایہ کاری ہے جو اسرائیل کی آشیرباد سے مصر اور ترکی کے ستم زدہ دیندار طبقے کو پاکستان و افغانستان کے اسلامی ذہن رکھنے والوں سے دور کرنے اور ان کی بہتر ہوتی ہوئی ساکھ کو خراب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودہ حرکتوں کے دو مقاصد ہیں:

(1) جو حضرات اس ملک کے اسلام پسندوں کی کامیابی سے خوش ہوں، انہیں یہ باور کروایا جائے کہ یہ دونوں ملک آج بھی وہی ہیں جو کبھی ماضی قریب یا بعید میں تھے۔ اس لیے ان سے دلی قربت یا قلبی تعلق اگر کسی درجے میں پیدا ہو رہا ہے تو اسے بھی دل میں ہی دفن کر دو۔ عالمی اسلامی برادری میں کسی سے اچھی اُمید کی گنجائش نہ رکھو۔

(2) نیم دینی ذہن رکھنے والوں کو یہ باور کرانا کہ مصر اور ترکی جیسے ابھرتے ہوئے اسلامی ملکوں کی تہذیب وثقافت تو وہ ہے جو ہم آپ کو دکھا رہے ہیں، نہ وہ جو رجعت پسند

مولوی، مفتی تمہیں بتاتے ہیں۔ لہٰذا جس چیز کو تم مغرب کی نقالی سمجھ کر جھجکتے تھے، اب اسے ترک یا مصری بھائیوں کی تہذیب سمجھ کر اپنا لو۔ بالجبر مسلط کیے گئے گندے اور بے ہودہ ماضی سے جان چھڑوا کر بلندیوں کی طرف کوہ پیمائی جیسی مشقت سے گزرنے والے اسلام پسندوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے اس عمل میں ہمارے ہاں کے کچھ چینل مالکان تن دھن سے مصروف ہیں۔ اب ہمارے پاکستانی ناظرین یا قارئین کو کون بتائے کہ ترکی ہی میں ''فاتح'' اور ''یلدرم'' جیسی دستاویزی تاریخیں بھی نقش کی گئی ہیں۔ وہاں کے علماء و مشائخ اور سیاسی و فلاحی کارکن جدوجہد اور حسنِ عمل کی تاریخ رقم کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کے تجربات سے استفادہ اور ہماری مہارتوں سے انہیں فائدہ پہنچانا، یہ ملت کی خدمت ہے یا لادینوں کے گندے پوتڑے لا کر انہیں سرِعام سکھانا دانشمندی ہے؟

ترکی کے اسلام پسندوں نے سیاست اور فلاحی کاموں کے امتزاج یا دوسرے لفظوں میں فلاحی سیاست کے ذریعے کس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھنے کی حکمتِ عملی اپنائی؟ اس کی طرف جانے سے قبل ہم ترکی میں دینی و دنیاوی نظامِ تعلیم پر ایک آخری نظر ڈالتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے اندھیری رات کی تیز آندھی میں بھی کیسے چراغ بجھنے سے بچایا جا سکتا ہے، بلکہ اس کی دھیمی لو میں اپنا کام بھی جاری رکھا جا سکتا ہے۔ مغرب کے حمایت یافتہ اور صیہونیت کے پروردہ طبقے کی طرف سے جبر و قہر کے بل بوتے پر نافذ کیے گئے لادین قوانین کے دور میں جب اذان و نماز، عربی زبان، ترک ٹوپی اور حج و عمرہ پر پابندی لگی۔ مدارس و خانقاہیں تو کجا، مساجد بھی بندش کا شکار ہوئیں۔ علماء شہید، نظر بند یا جلاوطن کر دیے گئے، تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مردے نہلانے کے لیے بھی افراد کم پڑ گئے۔ آخری رسومات کے آداب جاننے والوں کا کال پڑ گیا۔ اس پر سیکولر حکومت کو خطرہ ہوا کہ کوئی ایسا انتشار نہ پھیلے جو کسی بڑے ردِعمل کا سبب بن جائے۔ انہوں نے سوچا اتنی تو چھوٹ دینی چاہیے کہ لوگوں کی

مذہبی یا معاشرتی رسومات چلتی رہیں۔ سماج میں کوئی خلفشار نہ پھیلے اور معاملہ ہمارے قابو سے باہر نہ ہو۔ لہٰذا اس غرض کے لیے واجبی سی دینی تعلیم پر مشتمل ''امام وخطیب اسکول'' سرکاری نگرانی میں شروع کیے گئے۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے حل کے لیے ''الٰہیّات فیکلٹی'' کی اجازت بھی دے دی گئی، جن میں ''تقابلِ ادیان'' جیسے موضوع پر ''ماہر مستشرقین'' کی خدمات حاصل کی گئیں۔ دین پسند حضرات نے اسی کو غنیمت جانا۔ انہوں نے ان اسکولوں کے ذریعے بچی کھچی پونجی کی حفاظت پر توجہ مرکوز کردی۔ ستر کی دہائی میں جب اسلام پسندوں کا ایک نمایندہ دوسری سیاسی پارٹیوں سے اتحاد کرکے نائب وزیراعظم بن گیا تو اس نے تعلیم، صحت اور صفائی پر خصوصی توجہ دینے کے ساتھ ''امام وخطیب اسکول'' کی قانونی اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ''امام وخطیب اسکول'' کھولے۔ دینی مدرسوں کی اجازت تو تھی نہیں، نہ اس طرح کے اسلامی اسکولوں کو نجی طور پر کھولا جاسکتا تھا، اس لیے عوام نے اس کا ذہن بھانپتے ہوئے بھرپور ساتھ دیا۔ اپنے طور پر جائیدادیں وقف کیں، چندے کیے، عمارتیں بنائیں اور سرکار سے معلّم لے کر اسکول شروع کیے۔ ترکی میں اسکولوں کی عمارتوں کا معیار اور وہاں بچوں کو فراہم کی جانے والی سہولتوں کا معیار کافی بہتر ہوتا ہے اور اس کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ اس لیے اس پر کافی زیادہ اخراجات ہوتے ہیں۔ عوام کثیر رقم خرچ کرکے ایسے اسکول بناتے تھے اور انہیں سرکاری قانون کے دائرے میں لانے کے بعد وقف کردیتے تھے۔ اس طرح جگہ جگہ ایسے اسکول بننے شروع ہوگئے، جن سے نسل کو دین سے آگاہی کی ضرورت پوری ہونے کی ایک اُمید پیدا ہونے لگی۔

لادین طبقے کو یہ پیش رفت ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے اس مہم کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے دو طرح کے قانون بنا ڈالے:

(1) سرکاری اسکولوں میں صرف پرائمری تک تعلیم لازمی تھی۔ پرائمری کے بعد لوگ اپنے بچوں کو حفظِ قرآن کریم کے لیے اسکولوں سے اٹھا لیتے تھے۔ حفظ پر قدغن لگانے کے لیے تعلیم کی مدت بڑھا کر مڈل تک کر دی گئی، تاکہ بچے کے حفظ کی عمر نکل جائے اور وہ حفظ کے بجائے اسکول پڑھنے کو ہی ترجیح دے۔ جو بچے حفظ کے بجائے سرکاری اسکول سے نکل کر ''امام وخطیب اسکول'' میں آجاتے تھے اور کچی عمر کے ان تین سالوں میں عربی پڑھ لیتے تھے، اس قانون کے ذریعے ان کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ (2) یہ قانون بنایا گیا کہ ''امام وخطیب اسکول'' میں پڑھنے والا صرف ''الٰہیّات فیکلٹی'' میں پڑھ سکے گا۔ طب، وکالت، سیاسیات، معاشیات، تعلقاتِ عامّہ، انجینئرنگ وغیرہ کے شعبے اس پر بند کر دیے گئے۔ اس قانون نے ''امام وخطیب اسکول'' کا مستقبل ہی محدود نہ کیا، اس کی تعداد بھی محدود کرنی شروع کر دی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ قانون منظور تو سیاست دانوں نے اسمبلی میں کیا تھا، لیکن اس کو منظور کروانے والی فوج تھی، جو دین پسند طبقے کے معاشرے میں پھیلنے اور نمو پانے کے اسباب کا جائزہ لیتی اور ان کا سدّباب کرنے کے لیے سیکولر سیاست دانوں کو استعمال کرتی رہتی تھی۔ اسلام پسند ہر شعبہ زندگی میں کام کر رہے تھے۔ فوج کی طرف سے دوسرے شعبوں میں تو ان پر قدغن لگانا مشکل تھا، البتہ فوج میں ان کے داخلے اور ترقی کو مسدود کرنے کے لیے مزید سختی شروع کر دی گئی۔

الغرض اس کشمکش کی داستان طویل اور دلچسپ ہے۔ کئی قسطوں کی متقاضی ہے۔ دنیوی تعلیمی اداروں میں تو اسلام پسندوں کو اس سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا تھا۔ مگر 70 سالہ جلادصفت دور نے انہیں سکھا دیا تھا کہ ناموافق ماحول میں کیسے کام کیا جاتا ہے؟ تحمل و بردباری اور حکمت وتدبیر کے ساتھ ان کا سفر جاری رہا۔ انہوں نے حتی الامکان براہِ راست تصادم کی نوبت نہیں آنے دی اور کسی طرح کی رکاوٹ کو خاطر میں لائے بغیر ذہن سازی،

افراد سازی اور معاشرہ سازی کا عمل جاری رکھا۔ تدریجی حکمتِ عملی کے ساتھ تعلیم و صحت میں اعلیٰ خدمات اور فلاح و بہبود کے عوامی کاموں کے ذریعے عوام کا دل جیتنے کے ساتھ اپنے تربیت یافتہ افراد اہم عہدوں پر تعینات کرتے گئے۔ آج صدر و وزیر اعظم سمیت بہت سے وزراء اور اسلام پسند حکومت کے بہت سے عہدیدار انہی ”امام و خطیب اسکولوں“ کے پڑھے ہوئے اور یہاں کے نظریاتی اساتذہ کے ہاتھوں تربیت پائے ہوئے ہیں۔ ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کے طلبہ کے لیے ترکی کے اعلیٰ معیار کی یونیورسٹیوں سے اسکالرشپ جاری کی گئی۔ اس سال مسلم ممالک کے پانچ ہزار طلبہ کو اسکالرشپ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اعلیٰ دنیوی تعلیم کے خواہش مند طلبہ کو اس کا علم نہیں کہ ترکی میں یورپ کے معیار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور یہاں پاکستان کے لیے وافر کوٹہ مقرر کیا گیا ہے۔ داخلے کی کاروائی ای میل کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ یہاں کی یونیورسٹیوں میں اسلام پسند طبقہ انتہائی نفاست اور سلیقے سے نئے طلبہ کو ہاتھوں ہاتھ لیتا اور نہایت محبت و حکمت سے نظریاتی ماحول میں جوڑتا ہے۔ آخر میں اس نکتے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ فلاحی سیاست کے ساتھ اصلاحِ احوال اور تصوف و تزکیہ کی محنت وہ اصل چیز تھی جو اس نیم یورپی نیم ایشیائی خطے کے اسلام پسند باسیوں کو معاصر اسلامی تحریکوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بہت سے اعلیٰ سیاسی عہدیدار پنج وقتہ نماز کے ساتھ نقشبندی سلسلے کے تمام اذکار و اشغال پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ وظائف و اوراد نے انہیں بیرونی مشکلات میں سہارا دینے کے ساتھ بہت سی اندرونی مشکلات سے بچائے رکھا ہے۔ ان کی برکت سے نظریہ، مفادات پر مقدم رہا اور اس طرح یہ عظیم الشان سفر ہمہ جہتی انداز سے طے ہوتا رہا۔

المیہ یہ ہے کہ جس وقت ترکی میں یہ معرکۃ الآرا کشمکش چل رہی تھی، معاصر تحریکوں سے انہیں کسی قسم کی تقویت پہنچی، نہ کسی نے باہر سے آ کر ان کے کام کا جائزہ لے کر اسلامی

برادری کو آگاہ کیا۔ یہ معرکہ ابھی جاری ہے۔ موجودہ اسلام پسند حکمران پر متعدد حملے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام دینی شخصیات اور تمام دینی تحریکات کی حفاظت فرمائے اور انہیں ایسے اعمال کی توفیق دے جن سے اس کے خصوصی نصرت و مدد اُترتی ہے۔ بالآخر مشرق و مغرب میں حق کے بول نے ہی بالا ہونا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیّت کی تعمیل میں کسی شکل میں بھی استعمال ہو جائیں۔

سوچ کا فرق

سچ یہ ہے کہ کسی حد پر بھی ہار نہیں ماننی چاہیے۔ اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے۔ جیت اور ہار کا حتمی فیصلہ یہاں نہیں، کہیں اور ہونا ہے۔

☆

کاتبِ تقدیر نے آخری فتح اور حتمی غلبہ جس کے لیے لکھا ہے، اسے فاتحین کی شان کے ساتھ دنیا میں رہنا اور شہدا کی آن کے ساتھ دنیا سے جانا چاہیے۔

☆☆☆

کشمکش عروج پر ہے۔ بلّی تھیلے سے باہر آنا شروع ہوگئی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے جنوری 2013ء کے شمارے میں ان حقائق کا کسی قدر انکشاف کیا گیا ہے، جن کی طرف ''دو چہرے ایک قوم'' میں کسی قدر اشارہ کیا گیا تھا۔ کسی صاحب نے اس طرف توجہ دلائی تو راقم نے شمارہ منگوا کر تفصیل سے دیکھا۔ ویسی ہی محنت اور سلیقے سے لکھی گئی تحریر ہے جیسا کہ اس جریدے کا خاصا ہے، لیکن ترکی میں جاری دونوں طبقوں کی کشمکش سے براہِ راست عدم واقفیت کی بنا پر کہیں کہیں بات الجھ گئی ہے یا خلطِ مبحث ہو گیا ہے۔

احقر کو چونکہ ترکی میں ماضی کی طرف رجوع کی تحریک سے انتہائی دلچسپی رہی اور قریب

سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے ارادہ ہوا کہ کچھ کھل کر اس کشمکش کا پس منظر اور پاکستان میں سیکولر ترک ثقافت کی یلغار...... جسے ترک ثقافت کی یلغار کہا اور سمجھا جا رہا ہے...... کی وجوہات پر بات ہو جائے۔ اس کے بعد آخر میں راقم اردو ڈائجسٹ کے مقالے کی تلخیص کچھ بین القوسین اضافی تشریحات کے ساتھ پیش کرے گا۔

ترکی میں ایک تحریک تو فتح اللہ گولن صاحب کی ہے۔ یہ تعلیم، فلاح، بہبود، ابلاغ اور تجارت میں بیک وقت کام کرتی ہے۔ اس کے سربراہ خیر سے امریکا میں قیام پذیر ہیں اور اسرائیلیوں کے لیے کافی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جواباً ان کے لیے بھی کافی زیادہ نرم گوشہ اور بہتا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ اس تحریک نے دنیا بھر میں اسکول قائم کیے ہیں۔ جہاں بڑے پیار سے خلافت عثمانیہ کے بجائے جمہوریت رائجہ کی بیج کاری کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ''پاک ترک'' اسکول کے نام سے ان کے اداروں کا جال بچھ رہا ہے۔ انہوں نے مسلم امہ کی فکری تربیت کے لیے چار اخبار نکالے ہیں اور 8 ٹی وی اسٹیشن قائم کیے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ نے یہاں لکھا ہے: ''تاکہ ترک حکومت کی سوچ عوام تک پہنچائی جاسکے۔'' جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس لیے ہیں کہ موجودہ اسلام پسند حکومت کی سوچ اور ساکھ کو مسخ کر کے لادین سیکولر طبقے کی سوچ میں پھر سے بے ضمیری کی روح پھونکی جائے۔

غضب یہ ہے کہ طیب اردگان والی جماعت نے سلطان بایزید یلدرم پر ایک شاہکار قسم کی ڈاکومنٹری بنائی۔ اس گروپ نے اس کے مقابلے میں سلطان سلیمان عالی شان جیسے اولو العزم عثمانی حکمران...... جس کی بے مثال تاریخی خدمات کی بنا ''عالی شان'' کا لفظ اس کے نام کا حصہ بن گیا...... کے حوالے سے ایک انتہائی متنازع ڈرامہ بنایا۔ اس میں خود اپنے عثمانی اسلاف کے بارے میں جن کی بنا پر پوری اسلامی دنیا ترکوں سے عقیدت رکھتی ہے، ایسی ہرزہ سرائی کی گئی ہے کہ متحمل مزاج ترک وزیر اعظم جو نہایت دھیمے پن اور مفاہمت

سے چل رہے ہیں، کو بھی کھلے لفظوں ناپسندیدگی کا اظہار کرنا پڑ گیا۔ اسی تحریک کے ہمنواؤں نے وہ ڈرامے بنوائے ہیں جنہیں ہمارے نادان پاکستانی فلمی تاجر اُردو میں ڈب کر کے دھڑا دھڑ چلا رہے ہیں اور موجودہ اسلام پسند حکومت کی بحال ہوتی ہوئی ساکھ کو خراب اور قریب آتی ہوئی اسلامی دنیا کو متنفر کرنے کے ساتھ پاکستانی معاشرے کے بچے کھچے اخلاق کے بخیے ادھیڑ رہے ہیں۔

دوسری طرف طیب اردگان جیسے فلاحی سیاست کرنے والے متحمل مزاج اسلام پسند تحریکی کارکن اور شیخ محمود آفندی، شیخ سلیمان پاشا جیسے علماء و مشائخ ہیں جو انتہائی نامساعد حالات میں مدبرانہ سیاست اور سچی روحانیت کی خوشبو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی تعلیم، فلاح و بہبود، سیاست اور تجارت ہر شعبے میں بنیاد سے چوٹی تک ہر سطح پر جان مار کر محنت کی ہے۔ انتہائی حزم و احتیاط اور سوچ سمجھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھ کر چل رہے ہیں۔ وزیر اعظم طیب اردگان استنبول کے 8 سال ناظم رہے۔ اس گندے شہر کو انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بہت خوب صورت بنا دیا۔ اسی دوران انہوں نے مستقبل کی صورت گری کی اور اپنے ساتھیوں کا انتخاب کیا کہ کون کون کیا کیا کرے گا؟ اپنے عمدہ کاموں کی وجہ سے عوام میں حکومت کی مقبولیت تیسری بار بھی 51 فیصد سے زیادہ ہے۔ اللہ کی شان ہے کہ ان کے پاس دین کی طرف رجوع کا جذبہ ہے اور حلم و فراست کا ہتھیار بھی۔ انہوں نے ترکی کا اسلامی تشخص بہتر بنانے کے لیے اور برصغیر کے مسلمانوں کی خلافت کے تحفظ کے لیے دی گئی بے مثال قربانیوں کے اعتراف میں...... جنہیں عام ترک بھی آج تک نہیں بھولے...... حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات و خدمات کے اعتراف میں ایک بین الاقوامی اجتماع کروایا جو دنیا کی کسی بھی حکومت کی طرف سے اپنی نوعیت کا منفرد اور شاید واحد اقدام ہے۔

سلطان محمد فاتح اور سلطان بایزید یلدرم کی زندگیوں پر شاندار قسم کی دستاویزی معلومات ترتیب دلوائیں۔ استنبول میں ایک ''پینوراما'' بنوایا جس میں فتح قسطنطنیہ کے واقعے کو انتہائی ایمان افروز اور روح پرور اسلوب میں دکھایا گیا ہے۔ اس مرکز سے رخصت ہوتے وقت وہاں کے ایک خادم سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے احقر نے کہا: ''دنیا آپ سے فتح قسطنطنیہ جیسی ایک اور مہم کے انتظار میں ہے۔'' تصور کریں ایک عام آدمی جو شکل وصورت سے ہمارے عرف کے مطابق قطعاً غیر متشرع تھا اور عام سے عہدے پر فائز تھا، اس نے برجستہ کہا: ''ہمارے آباؤ و اجداد میں ایمان کی طاقت تھی۔ بس ہم میں ایک یہ چیز آجائے تو ہم ان شاء اللہ پھر ایسا کر سکتے ہیں۔''

ان سب چیزوں کا پاکستان میں یا عرب و افریقہ اور روس کے ذرائع ابلاغ میں کہیں ذکر نہیں۔ اسلامی چینل نجانے کہاں ہیں کہ ان چیزوں کے ذریعے ترکی کا روشن اور تابناک ہوتا ہوا چہرہ ہمارے عوام کو دکھا سکیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اس مشہور اختلاف کے سائے تلے آئے گا جو ہمارے ہاں عکسی تصویری ابلاغ کے حوالے سے پایا جاتا ہے، لیکن امت کے اختلاف میں بہرحال رحمت ہوتی ہے۔ میں اس پر اصرار نہیں کرتا، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں ترک اسلام پسندوں کی محنتوں سے صرف نظر کر کے سیکولر طبقے کو دہری چال کا موقع دینا کس قدر شاطرانہ مہم ہے۔ اس کا دفاع کرنے والے کہاں ہیں؟

''اردو ڈائجسٹ'' نے بڑی اچھی کوشش کی ہے، لیکن اس مؤقر جریدے کے مقالہ نگار کو مرکزی خیال کی عدم وضاحت اور ترکی میں جاری دو طبقاتی کشمکش سے قریبی واقفیت نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں ابہام، التباس اور خلط مبحث ہو گیا ہے۔ وہ صحافیانہ سوچ و بچار اور تقابلی و تنقیدی جائزے سے کام لیتے تو ترکی کے معاشرے کا مشاہدہ کیے بغیر دو باتیں یہاں رہ کر بھی از خود سمجھ سکتے تھے:

(1) ایک یہ کہ ترکی صدر عبداللہ گل اور وزیر اعظم طیب اردگان دونوں نے اس طرح کے ڈرامے چلائے جانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اسے ترکی کے تشخص کے لیے شدید نقصان دہ بتایا ہے۔ چونکہ آئین سیکولر ہے اور فوج اس سیکولر آئین کی محافظ ہے، اس لیے ایک حد سے آگے وہ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے پوری ترک قوم کی نمایندہ ثقافت قرار دے دیا جائے۔

(2) ترکی کے سرکاری میڈیا پر اس طرح کے ڈرامے ممنوع ہیں۔ اگر یہ تمام ترکوں کی سوچ یا کم از کم موجودہ حکومت کی سوچ ہوتی تو ان خرافات کی وہاں کے سرکاری میڈیا میں اجازت ہونی چاہیے تھی۔ بہر کیف! احقر کوشش کرے گا کہ اس مضمون کی تلخیص بمع ضمنی تشریحی توضیحات کے جو مربع قوسین میں ہوں گی، پیش کر سکوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام پسند اور محبّ ملت افراد اور تحریکیں ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں کہ پورے ملک سے ایک تحریر آتی ہے اور وہ بھی واضح اور دوٹوک نہیں۔ کسی قدر موہم اور موجب التباس ہے۔ ضرورت ہے کہ وسیع تناظر اور آفاقی فکر کے ساتھ مہربانوں اور نامہربانوں پہ نظر رکھی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وقت کے تقاضے کو سمجھنے اور اس کے مطابق راست اقدام کو برتنے کی توفیق وافر عطا فرمائے۔

اب آپ ہمارے مؤقر اور ممدوح جریدے، جس کی قوم اور قومی زبان کے لیے خدمات لائق تحسین ہیں، کی تحریر کسی قدر ترمیم و تشریحی اضافات کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں جو......: ''عشق ممنوع'' سے ترکی کا ''امیج'' بری طرح متاثر ہوا ہے۔ ترک سیکولر ڈراما کی مقبولیت پر اٹھتے اہم سوال۔ 2013 ترکی دسویں بڑی طاقت بننے کو ہے! سیاسی و معاشی استحکام کے بعد دنیا پر ترک ثقافتی یلغار کیا رنگ لائے گی؟'' ......کے مرکزی عنوان اور ذیلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

''عشق ممنوع [نامی بدنام زمانہ ڈرامہ] اُردووَن نے ترکی سے حاصل کیا۔ سیکولر ترکی سے آنے والے اس ڈرامے نے دیکھنے والوں کی آنکھیں ہی چندھا دیں۔ [یہاں چندھیا دیں ہونا چاہیے۔ چندھانا لازمی ہے اور چندھیانا متعدی۔] جن موضوعات پر کبھی کوئی شائستہ اطوار بات کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ کبھی ذکر بھی ہوتا ہوگا تو سات پردوں میں، وہ ذکر ٹی وی اسکرین پر روز ہونے لگا۔ جس چینل کا کبھی ذکر نہیں ہوا تھا، کسی گنتی شمار میں نہیں تھا، ایک ڈرامے نے اسے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرامے کے نئے رجحان کا امام [اس مقدس لفظ کا زیرِ بحث مفہوم میں استعمال درست نہیں ہے] بنا دیا۔ عشق ہمیشہ ممنوع ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے اسے منع کرنے والے تھک جاتے ہیں اور کرنے والے سو راستے نکال لیتے ہیں۔ ملکوں معاشروں کی بنیاد، افکار سے زیادہ معاشرت اور اخلاقی فریم ورک پر ہوتی ہے جس میں ممنوع اور غیر ممنوع جلی الفاظ میں لکھے ہوتے ہیں۔ ذہنی پستی کے نہ رُکنے والے سفر کا کوئی پڑاؤ نہیں ہوتا، پاکستانی ڈرامے نے محبت کے نام پر گزشتہ کئی سال سے ہر حد توڑنے کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ''عشق ممنوع'' اس سے بھی ایک ہاتھ آگے چلا گیا۔ اپنے ہی چچا کی بیوی سے عشق، محترم رشتوں کی تذلیل کے لیے کبھی کبھی تو کہانیاں گھڑنی نہیں پڑتیں بلکہ لگاوٹ اور بدمستی کی ایک نگاہ ہی کافی ہوتی ہے، مگر عشق ممنوع نے تو کئی حدیں توڑ دیں۔

نقل فسق فسق نباشد

(گذشتہ سے پیوستہ)

’’بدمستی کو مستی بنا کر یوں پیش کیا گیا کہ ڈرامے کا ہر ہر کردار اپنی حدود توڑنے پر آمادہ رہنے لگا۔ شاید روایت، اخلاق اور طے شدہ ضوابط کو کوئی خود توڑ نہ سکے تو دوسروں کو ایسا کرتے دیکھنے سے تسکین ہوتی ہوگی۔ وجہ کوئی بھی ہو، یہ ڈراما ہر جگہ موضوع بحث بن گیا۔ یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ڈراما ترکی کی نمایندگی کرتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر درمش بلوگر سے رابطہ کیا وہ استنبول سے لاہور آئے ہیں، پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں رومی چیئر کے سربراہ ہیں۔ وہ بولے:

’’ترکی میں ایسا کلچر بے شک ہے، مگر اس کی تعداد یا مقدار بہت کم ہے۔ یہ ڈراما جس ناول پر مبنی ہے وہ بھی کوئی سو سال پرانا ہے۔ اس پر پہلے فلم بھی بنی تھی۔ میں تو ہمیشہ اپنے جاننے والوں کو منع ہی کرتا رہا لیکن اس کو پسند کرنے والے تو موجود تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ایسے ڈرامے بنانے والے معاشرے کو خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اسے دیکھنے والے بے شک ضرور ہوتے ہیں، مگر پسند اور ناپسند کرنے والوں میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ ترکی میں یہ فرق موجود ہے اور موجود رہے گا۔‘‘ ڈاکٹر درمش نے افسوس سے کہا: ’’میرا احساس

ہے کہ اس ڈرامے نے ترکی کا امیج بری طرح متاثر کیا ہے۔'' عجیب بات یہ ہے کہ پاکستانی پرنٹ میڈیا میں صرف ایک اخبار [شاید مقالہ نگار تک ضربِ مؤمن کا کالم نہیں پہنچا] نے اس ڈرامے کے معاشرے پر منفی اثرات کو موضوع بنا کر خبریں دیں۔ ورنہ باقی تو عشق ممنوع کے ہیرو، ہیروئن کی خوبصورتی اور بے پناہ مقبولیت کی خبریں ہی دیتے رہے۔ خواتین کے ایک نئے میگزین نے توبیتر کی شادی کے حوالے سے معلوماتی تحریر بھی شائع کر دی ہے کہ بہلول اور بیتر آج کے پاکستان کے نئے ہیرو ہیں۔ اے ایف پی کے حوالے سے آنے والی ایک خبر ہمارے ہاں شائع ہوئی ہے کہ ترک صدر عبداللہ گل نے اس ڈرامے کا نوٹس لیا ہے۔ اس خبر کے بعد سے اس محاذ پر خاموشی ہے، نہ تو ترک سفارت خانے اور نہ ہی ترکی سے متعلق کسی سیاسی، سماجی یا کاروباری انجمن کا کوئی بیان سامنے آیا ہے۔ عشق ممنوع ایک [سیکولر] ناول نگار خالد ضیا اوشک کلیگل کے [سیکولرازم کے عروج کے زمانے میں] لکھے ہوئے ناول سے ماخوذ ہے۔ اس کی پروڈکشن، کردار سازی اور ماحول اس قدر خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے کہ یہ ڈراما جہاں جہاں بھی گیا، ایک سحر طاری کرتا گیا۔ ترکی کے اعلیٰ طبقے کا رہن سہن ہمیشہ سے لوگوں کو Fascinate کرتا ہے۔ لوگ اس ماحول میں جینے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں طبقہ امراء کے لیے بھی یہ خبر تھی کہ ترکی میں لوگ ان سے بھی بہتر زندگی جیتے ہیں۔ اس ڈرامے کی کامیابی پر ہمارا قومی ردعمل بہت ہی شاندار رہا۔ میڈیا نے ترکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ تاکہ انہی اداکاروں کے مزید ڈرامے خریدے جا سکیں۔ جیو نے نور خرید لیا جو وہاں پہلے ہی بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ ایکسپریس نے مناہل اور خلیل کو پسند کیا۔ کم سے کم ۵ ڈرامے اس وقت آن ائر ہیں۔ لاہور میں ایک پلازے میں کئی نئے سٹوڈیوز وجود میں آ گئے ہیں۔ وہاں صرف ترکی ڈراموں کی ڈبنگ ہوا کرے گی۔ ایک ترکی فلم کی ڈبنگ ہو بھی چکی۔ ایس ٹی وی اُردو (STV) کے نام سے ترکی کے ایک چینل کو بھی منظوری مل گئی

ہے۔

دوسرا ردِعمل کراچی اور لاہور کے اداکاروں اور پروڈکشن ہاؤس کے مالکوں کا تھا۔ انہیں دکھ اس بات کا ہوا کہ ہمارے بنائے ڈرامے کی ایک قسط، 5، 6 لاکھ میں بکتی ہے اور ترکی والے ڈرامے کی قسط ایک لاکھ میں دستیاب ہے۔ معاشی طور پر چینلز کو آسانی ہی نہیں، بچت بھی ہو گی۔ یوں آنے والے دنوں میں یہ رجحان دنیا کے ہر اچھے برے ڈرامے کو یہاں لانے اور ڈبنگ کر کے دکھانے کی بنیاد بنے گا۔ یوں ان کو مالی نقصان ہوگا۔ ممکن ہے کسی دل والے نے ملک کی تہذیب، معاشرت یا اقدار کا بھی سوچا ہو مگر جو کچھ ان کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے وہ اس سوچ کی تو نفی کرتا ہے۔ سو لمحہ بھر کو آئی خوش گمانی ٹھہرنے کی جگہ نہیں ڈھونڈ پاتی۔ تیسرا ردِعمل عوامی ہے اور وہ بے انتہا کمال کا۔ انہیں نئے اور خوبصورت ہیرو ہیروئن مل گئے۔ گاسپ (Gossip) کے لیے موضوع مل گیا اور دیکھنے کے لیے عمدہ اور خوبصورتی سے بنا ہوا ڈراما۔ مقبولیت کے نئے ریکارڈ کیوں نہ قائم ہوتے؟

اس ساری صورت حال میں ایک بات بہت ہی اہم ہے کہ ثقافتی حملے میں یہ ہماری تیسری پسپائی ہے جو ہمیں بحیثیت قوم نصیب ہو رہی ہے۔ ان درآمدہ ثقافتوں سے اگر تو ملک و قوم کی کوئی بہت بہتری ہوئی ہوتی تو آج ہم بھی بامِ عروج پر پہنچے ہوتے اور دنیا کو اپنی ثقافت سے روشناس کرا رہے ہوتے۔ کہیں ہمارے [رویّے] چل رہے ہوتے۔ کہیں [کہانیاں] پسند کی جا رہی ہوتیں، کہیں ہمارے مزاج و اطوار زیرِ بحث ہوتے۔ [سابقہ جملے میں بین القوسین دیے گئے الفاظ کو راقم نے جان بوجھ کر دو ممنوعہ الفاظ کی جگہ درج کیا ہے] ہماری ثقافت کی خوبیاں اور خوبصورتیاں توجہ پا رہی ہوتیں تو یقیناً اطمینان کا موقع ہوتا، مگر آج کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان ۶۵ برسوں میں بطور قوم ہم نے اپنی کیا ثقافت طے کی ہے؟ اپنی ثقافت کی کون سی خوبیاں اور خوبصورتیاں ہیں، جن پر متفق ہوئے ہیں اور جن کو

پذیرائی بخشی گئی اور پھر جسے لے کر ادب پارے، شاعری، نثر کے شہہ پارے تخلیق کیے گئے۔ ادارے بنائے گئے۔ [یہاں بھی راقم نے بوجہ مجبوری کچھ الفاظ کو تبدیل اور کچھ کو حذف کیا ہے۔] لاتعلقی اور بے نیازی کی حد تو یہ ہے کہ پاکستانی ثقافت پر کوئی تحریر پڑھنی ہو تو فیض احمد فیض کی دو تین تقریروں والے ایک کتابچے کے علاوہ ڈھنگ کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اہل علم و اہل فکر ہی نہیں، اہل دانش اور برسوں سے ملک و قوم کی ثقافت کے مظہر اور استعارہ بننے والے فنکار بھی بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ جنرل ضیاء کے زمانے میں بنے شاہین، ''آخری چٹان'' کے بعد کوئی تاریخی ڈراما تک نہیں بنا سکے۔ اچھے موضوع پہ فلم کا تو سوچیے ہی نہیں، ہر قوم اپنی ثقافت، اقدار اور اطوار سے ہی اپنا کلچر طے کرتی ہے۔ مقامی ثقافتیں اور روایات اس میں شامل ہو کر اسے خوب تر بناتی ہیں۔ قوم کے مذہب کا مزاج اسے قبول صورت بننے میں مدد دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اہلیت کے سارے سوتے یہاں خشک ہو چکے ہیں۔ ہاں سوچنے سمجھنے اور آگے بڑھ کر کچھ کرنے کا وقت ہم بار بار گنوا چکے ہیں۔

ہم میڈیا کو فوراً برا بھلا کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنا فرض ادا کر دیا ہے، ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا یہ غلط ہے۔ کہیں تو کسی چیز کی Replacement دی ہوتی۔ برا بھلا کہنے، الزام دینے میں ۶۰ برس گزر گئے، خلا کو نہ پُر کیا۔ نہ کسی نے پُر کرنے کا سوچا۔ اب میڈیا پر جو آ رہا ہے، وہی کل سچ بن کر ڈسے گا۔ معروف ماہر نفسیات ارشد جاوید کہنے لگے: ''میرے پاس ایسے کتنے ہی نوجوان مریض آتے ہیں جنھوں نے انگریزی ناول پڑھے۔ وہاں محترم اور مقدس رشتوں پہ دست درازی یا آمادی کے ساتھ جنسی تعلق کی منظر کشی پڑھی اور پھر کسی کمزور لمحے اپنے ہی سگے رشتوں کے ساتھ ویسا ہی کرنے کی کوشش کی۔ کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں ذہنی مریض بن کر پھر برسوں اپنا علاج کراتے ہیں مگر اس شرمندگی سے نہیں نکل پاتے۔''

سیاسی و معاشی استحکام کے بعد دنیا پر [سیکولر] ترک ثقافتی یلغار کیا رنگ لائے گی؟ اس کے اثرات ایک تجزیے میں سمیٹنے مشکل ہوں گے مگر یہ ضرور ہوا ہے کہ پاکستان میں ترکی کے لیے ہمیشہ سے موجود محبت اور احترام عشق ممنوع کے اخلاقیات و حدود قیود سے بے نیاز کرداروں کے باعث مجروح بھی ہوا ہے اور متاثر بھی۔ بے شک بہت سے عام لوگوں نے اس ڈرامے اور اس کے بعد آنے والے ڈراموں کو آسانی سے قبول بھی کر لیا ہے۔ اسے اشتہار بھی مل گئے ہیں اور مقبولیت بھی۔ یوں ترکی ڈرامے لانے والوں کا جو ٹارگٹ یا مقصد تھا وہ بہرحال آسانی سے پورا ہو چکا۔ اب ڈراموں کے بعد لوگوں کا باہم رابطہ ہو گا تو "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں' والا معاملہ ہو گا۔

اس ڈرامے نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ریٹنگ میں ڈراما اور چینل کہیں آگے نکل گئے۔ نئے ترکی کے [یہ ترکی نیا نہیں، کمال اتاترک کا ورثہ ہے۔ نئے ترکی کو استنبول کے "اسماعیل آغا" نامی علاقے میں دیکھا جا سکتا ہے] ڈرامے نے بہت کچھ پچھاڑ دیا۔ ایک ایسی [لامذہب] ثقافتی یلغار کا آغاز ہوا ہے، جس سے سرمائے کی آمد جڑی ہوئی ہے۔ اسی لیے اسے یہاں سے اپنے وکیل بھی آسانی سے مل جائیں گے جنھیں یہ غرض نہیں ہو گی کہ ان کی آمدن معاشرے کا حلیہ کس حد تک بگاڑ دے گی۔

میڈیا کو آزادی ملنے کے بعد ہر پروڈکشن ہاؤس نے ان موضوعات کو چنا، جن پر بات کرتے ہوئے کبھی کانوں سے دھواں نکلتا تھا۔ وفا گالی بن کر حماقت ٹھہری اور بے وفائی ادا۔ شادی کے بعد بھی خوش شکل انسانوں سے جسمانی ذہنی تعلقات کو دلیلوں کی بنیادیں فراہم کی جانے لگیں۔ گلے ملنے، ایک بستر پر سونے اور ذو معنی جملوں کی وہ بہتات ہوئی کہ فیملی ڈرامے کے نام پہ مقبول ڈرامے کے ایک کردار کو اس کی بیوی نے اپنے بیٹے اور بہو کی موجودگی میں کہا: اب کمرے میں چلیں آرام کرتے ہیں۔ شوہر نے خاموشی سے اٹھ کر چلنے

کے بجائے اپنے معمول کے مطابق یہ کہنا ضروری سمجھا کہ کمرے میں جا کر ہم جو کچھ کریں گے اسے آرام کہتے ہیں؟ [معافی چاہتا ہوں نقلِ کفر یا فسق جب ردِّ کفر یا فسق کے لیے ہو تو کفر یا فسق نہیں ہوتا۔]

آپ اگر اس پورے منظر نامے سے واقف نہیں ہیں تو سچ کہوں آپ کا یہ روداد پڑھ کر دل پھٹنے کو آ جائے گا۔ ہمارا آج کن کے سپرد ہے اور ہم نے اپنے کل کی حفاظت کے لیے کن کو تیار کیا ہے؟ یہ کسی ایک دن کا شاخسانہ نہیں ہے۔ نہ کوئی اتفاقی حادثہ اور واقعہ ہے۔ جیسے جگ سا پزل میں ایک تصویر مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے سارے حصے جو بخرے بخرے ہوتے ہیں، مکمل نہ لیے جائیں، ساتھ رکھے ہوئے نہ ہوں تو تصویر سامنے ہی نہیں آتی۔ [اسلام پسندوں کی بنائی ہوئی شاندار دستاویزی فلمیں چھوڑ کر] ترکی کے سیکولر ڈرامے لانے، ان کو ڈب کرنے اور اس قوم کو اس تہذیب سے متعارف کرانے کا کارنامہ کرنے والے کسی اور ملک سے تو نہیں آئے ہوں گے۔ انہیں اس میں آسانی سے حاصل ہونے والی آمدن نظر آئی جو انہوں نے حاصل کر لی۔ اس کے جواب میں قوم کو کیا ملا؟ اس پر بات نہیں کرتے، اس مائنڈ سیٹ کو ضرور دیکھیے کہ ملک کے ہر چینل کی سربراہی پہ بیٹھے اعلیٰ دماغوں نے فوری طور اسے ایک Opportunity پایا اور سیکولر ترکی سے نئے ڈرامے لانے کے لیے کود پڑے۔ شام کو ٹی وی لگایئے تو ہر چینل پر ترکی چہرے اپنے کلچر کے لباسوں، عادتوں کے ساتھ اُردو میں سب کچھ مفت میں عطا کر رہے ہوتے ہیں۔

ممتاز تجزیہ نگار فرخ سہیل گوئندی جو 38 مرتبہ پاکستان سے ترکی جانے کا ایک منفرد اعزاز رکھتے ہیں۔ ان کی رائے بالکل ایک مختلف منظر دکھاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا: ”ترکی میں بننے والے [آزاد خیال] ڈرامے دنیا میں اپنی منڈیاں بنا رہے ہیں۔ ان کی برآمد سے [سیکولر] ترک میڈیا [اپنے مقاصد کی تکمیل کے علاوہ] اربوں ڈالر کما رہا ہے۔ ابھی تو ایک دو

ڈرامے آئے ہیں پھر اور بھی آئیں گے۔ پہلے ہم کہتے تھے کہ مغرب کی یلغار ہے۔ یہود و ہنود کے کلچر سے بچیں۔ [اب جرمنی کے ڈراموں کی یلغار شروع ہونے والی ہے جسے روکنے والی کوئی سرکاری ادارہ ہے نہ عوامی تنظیم] جو قومیں علمی، فکری اور نظریاتی طور پر کمزور ہوتی ہیں وہ ہمیشہ بیرونی نظریات کے خطرات سے دوچار رہتی ہیں۔ ہم نے شاعری اور ادب میں کتنے نجیب عمر پیدا کیے ہیں، کتنے محمود درویش اور اورمان پیدا کیے ہیں؟ ترکوں اور عربوں نے ادب اور شاعری میں بہت ترقی کی ہے۔ ہم اپنے شہر کی صفائی کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ نظریات کی حفاظت کیا کریں گے؟ اصل میں ہم Psychological Colonialism کا شکار ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے زیادہ پڑھا لکھا وہ ہے جو انگریزی بولے، کم پڑھا لکھا وہ ہوتا ہے جو اُردو بولے اور ان پڑھ وہ ہوتا ہے جو پنجابی بولے۔ طیب اردگان ترکی میں بولتا ہے جب کہ ہمارا وزیر اعظم چاہے انگریزی نہ بھی آئے تو بھی انگریزی میں لگا ہوتا ہے۔ [راقم اضافہ کرے گا: اردگان صرف ہمارے ہاں آکر ہی ترکی میں ہی نہیں بولتا، دنیا بھر میں اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور گفتگو سے پہلے مسنون عربی کلمات بھی بولتا ہے۔ نیز تجزیہ نگاروں کے مطابق گفتگو موضوع سے ایسی براہ راست اور دوٹوک ہوتی ہے گویا دلّی کی ٹکسالی زبان کو منطق و فلسفہ کے عرق میں بھگو بھگو کر شائستہ و شگفتہ بنایا گیا ہے۔] میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔ میں خود کو Extra ordinary ذہین نہیں سمجھتا مگر مجھ میں Clarity of ideas ہے۔ اس کی وجہ مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ کتاب سے ترکی پڑھا اور آنکھ سے دیکھا۔ میں ترکوں کا دوست ضرور ہوں لیکن پہلے میں پاکستانی ہوں۔ میں نے بھارت میں کہا تھا کہ میں بھارت سے دوستی پاکستان کے لیے چاہتا ہوں بھارت کے لیے نہیں۔ میں نے ترکوں، عربوں سے سیکھا ہے کہ اپنے وطن سے محبت کیسے کرتے ہیں؟ ہم ”تحریک خلافت“ کے زمانے سے ترکی کے ساتھ ہیں۔ ہم پاکستانیوں نے قبرص میں ترکوں

کی حمایت کی۔ ہم پاکستانیوں نے سائپرس پر بلند اجوت کو سپورٹ کیا۔ ہمارا وزیر اعظم نواز شریف جب ترکی میں زلزلہ آیا تو خود جہاز میں ساتھ گیا۔" [اس کے جواب میں ترکی کی اسلام پسند حکومت اور فلاحی تنظیم "آئی ایچ ایچ" نے مظفر آباد کے زلزلے میں نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔ جب کہ سیکولر ترک یتیم بچوں کو اکٹھا کر کے من چاہی تربیت دینے میں مصروف رہے۔]

آج کا ترکی جس کی جڑیں بے شک اس کے ماضی میں پیوست ہیں، مگر اس کی آنکھوں میں بہت دور کے خواب سمائے ہیں۔ اس [کے سیکولر طبقے] کی ثقافتی یلغار کو سمجھنے سے پہلے نئے ترکی کی تفہیم بے حد ضروری ہے۔ [اس تفہیم کے لیے ترکی میں جاری کشمکش کا قریب سے مطالعہ اور براہ راست واقفیت ضروری ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں اس عنصر کی کمی ہے۔

ایک مؤثر طبقے کی رائے یہ بھی ہے کہ موجودہ ترکی کی ثقافتی لہر کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ [راقم اس سے سو فیصد اتفاق کرتا ہے، لیکن اس کا دوش تمام ترکی یا اس کی اسلام پسند حکومت کو دینے سے ہرگز اتفاق نہیں کرے گا] جس میں ترکی کے مذہبی کرداروں کو اجاگر کرنے کے بجائے سیکولر چہرے کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہم برسوں سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے زمانہ بدلتا دیکھ رہے ہیں، کبھی پاکستان عالم اسلام کا لیڈر ہوتا تھا۔ آج یہ مقام ترکی کے پاس ہے اور ہر آنے والا دن اس کی قیادت اور راہنمائی پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ دنیا میں فیصلے مذہب کی بنیاد پر نہیں، معیشت کی بنیاد پر ہوتے ہیں یا طاقت کی بنیاد پر۔ دوسرے لفظوں میں فیصلے طاقت کرتی ہے یا بھوک۔ [یہ ناقص اور ثقاہت سے عاری تجزیہ ہے۔ اتحادیوں کی طاقت بے تحاشا تھی۔ افغان مجاہدین کے پیٹ پر پتھر بندھے تھے۔ پھر فیصلہ کس کے حق میں ہوا؟؟؟ مذہبی جذبے کے حق میں یا معاشی وعسکری طاقت کے حق میں؟؟؟] آج بڑی طاقتیں بھوک دِکھا کر فیصلے کراتی ہیں۔ [مگر

افغانستان میں انہیں یہ ہتھیار استعمال کر کے بھی منہ کی کھانی پڑی] ممکن ہے ترکی کا معاملہ ایسا نہ ہو۔ ان کی ہم سے محبت بے لوث ہو۔ ان کی معاشی سرگرمیاں بھی ہمارے فائدے کے لیے ہوں مگر یہ تو کسی طور لازم نہیں کہ 2013ء کی اس بڑی معاشی طاقت کی تحسین کے ساتھ ساتھ اس [کے سیکولر طبقے] کی ثقافتی یلغار کے سامنے بھی خاموشی اختیار کر لی جائے۔ بیچاری ڈراما انڈسٹری ہی نہیں، پاکستانی اقدار اور اخلاقیات کو بھی بے موت مرنے دیا جائے۔ ہار ماننے کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔''

سچ یہ ہے کہ کسی حد پر بھی ہار نہیں ماننی چاہیے۔ اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے۔ جیت اور ہار کا حتمی فیصلہ یہاں نہیں، کہیں اور ہونا ہے۔ اس فیصلے سے قبل حق کی سرگرم اور پرجوش، لیکن سلیقہ مند و معقولیت پسند حمایت کرتے رہنا چاہیے۔ حق و باطل کا فرق دوٹوک انداز میں بیان کرتے رہنا چاہیے۔ کاتبِ تقدیر نے آخری فتح اور حتمی غلبہ جس کے لیے لکھا ہے، اسے فاتحین کی شان کے ساتھ دنیا میں رہنا اور شہدا کی آن کے ساتھ دنیا سے جانا چاہیے۔

عقیدت کا ایک انداز

راقم الحروف کو کتابیں خریدنے کی اتنی استطاعت نہیں، جتنا ان سے استفادے کا شوق ہے۔ لہٰذا زندگی میں کم ہی کتابیں خریدیں۔ مانگ تانگ کر استعارتی استفادے پر ہی اکتفا کیا۔ ترکی میں کتابوں کی عالمی نمائش ہوتی ہے۔ جس میں دنیا بھر سے معیاری نامور ناشرین وطابعین شریک ہوتے ہیں۔ اس میں دو چیزیں ایسی ملی تھیں، جن کے متعلق یہاں پاکستان میں بھی سنا تھا، اس لیے ان کی خاطر جی بہت للچایا اور سکہ رائج الوقت کے پانچ ہندسی قیمت پر انہیں حاصل کرنا ہی پڑا۔ یہ دونوں چیزیں ترکی کی موجودہ اسلام پسند حکومت نے نہایت اہتمام بلکہ تزک واحتشام کے ساتھ طبع کی ہیں۔ ترکی کے علاوہ عربی اور انگریزی میں بھی انہیں شائع کیا ہے۔ یہ چونکہ تصویری کتابیں ہیں اور نادر تاریخی نوادرات کی دستاویزی تفصیل پر مشتمل ہیں، اس لیے ترکوں نے اپنی مہارت ونفاست کا جی بھر کے ہمہ جہت مظاہرہ کیا ہے۔ نیز ان کا تصویری اور عکسی معیار بھی انتہائی نفیس اور اعلیٰ درجے کا رکھا گیا ہے۔ ترک حضرات خطاطی جیسے فنون لطیفہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سیکولر دور میں بھی یہ فن کسی نہ کسی شکل میں زندہ تھا۔ اگرچہ کمال اتاترک نے ترکی کے عربی نما رسم الخط پر پابندی لگا کر اسے انگریزی رومن سے مشابہ کر دیا تھا، لیکن موجودہ حکومت نے عربی کی خطاطی کی اس

قدر حوصلہ افزائی کی ہے کہ ترک خطاط حضرات کے فن کا پورے عالم اسلام میں لوہا مانا جاتا ہے۔ قرآنی آیات، احادیث اور حلیہ شریف کی عالمی سطح کی نمائش موجودہ ترک حکومت کی سرپرستی میں ہوتی ہیں۔ ان میں جب شرکت کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ ترک حکومت اور دین دار ترک سرمایہ دار حضرات کی طرف سے کہنہ مشق استادوں کے علاوہ نوجوان خطاطوں کی حوصلہ افزائی کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک طغرہ منہ مانگی قیمت پر (جو چھ ہندسوں سے کم نہیں ہوتی) خرید لیا جاتا ہے اور دوست احباب کے درمیان اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہمارے گھر فلاں خطاط کا کتبہ اتنی قیمت پر اس کے دستخط اور رسید خریداری کے ساتھ موجود ہے۔ حتی کہ ایک طعام گاہ میں مشہور زمانہ خطاط کے ہاتھ کے دستی طغرے دیکھنے کو ملے۔ دستی کا معنی یہ کہ وہ طبع شدہ نہ تھے۔ مخطوط حالت میں خرید کر دیواروں پر سجائے گئے تھے۔ اور بلا مبالغہ لاکھوں میں ان کی قمیت چکائی تھی۔

شیخ صادق صاحب نامی ایک نقشبندی بزرگ سے ملاقات کے لیے جانا ہوا تو انہوں نے اپنی دکان پر ملاقات کا وقت دیا۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ اتنی دینی مصروفیات اور کثیر تعداد میں مریدین کو وقت دینے کے بعد تجارت کو کیسے نبھاتے ہوں گے اور کیا یافت ہوتی ہوگی؟ پھر سوچا کہ کتابوں یا عطر کی دکان ہوگی اور کسی خادم کے حوالے کر دی گئی ہوگی۔ خود مسند پر تشریف فرما ہوں گے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ دکان کہاں، اعلیٰ قسم کا سجا ہوا شوروم ہے۔ جس میں جا بجا انتہائی خوبصورت دیدہ زیب اور جاذب نظر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ کاغذ، کپڑا، لکڑی، پتھر، فائبر، چمڑا، دنیا کی کون سی چیز ہے جس پر اعلیٰ درجے کی خطاطی کو نقش نہیں کیا جاتا۔ بعض چیزوں کا معیار اس قدر اعلیٰ تھا کہ راقم سے نہ رہا گیا۔ پوچھ بیٹھا کہ یہ تو بادشاہوں کو پیش کیا جانا چاہیے۔ شیخ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ البتہ ان کے خادم نے بعد میں بتایا کہ آپ نے خوب بھانپا۔ ہمارے صدر اور وزیراعظم جب کسی غیر ملکی شاہی مہمان کو

یادگاری تحفہ دینا چاہیں تو ہمارے شیخ کے ہاں سے منگواتے ہیں۔ تبلیغ کی تبلیغ ہے اور دلداری کی دلداری۔ قریب ہی شیخ کی مسجد اور ذرا فاصلے پر خانقاہ تھی جس کی تعمیر کے وقت ایک ایک اینٹ کو شیخ نے خود دم کر کے مزدوروں کو پکڑایا تھا۔ شیخ کے مریدین لاکھ اصرار کرتے مگر شیخ خود ہر اینٹ پر بسم اللہ وغیرہ اور لوہے، دروازے وغیرہ پر آیت الکرسی وغیرہ یا خدا جانے کیا پڑھ کر دم کرتے تھے۔ یہ خلافتِ عثمانیہ کے زمانے کا وہی انداز ہے کہ حرم مکی و مدنی کا ترکی حصہ تعمیر کرتے ہوئے ترک معمار باوضو ہو کر ذکر واذکار اور درود شریف واستغفار کرتے ہوئے کام کرتے تھے۔ اس کے اثرات آج بھی نمایاں طور پر الگ سے محسوس کیے جاتے ہیں۔

قریب میں ایک متروکہ تاریخی کلیسا تھا جسے شیخ نے حکومت سے درخواست کر کے گود لے لیا تھا۔ اس میں نماز اور مکتب کا انتظام شیخ اور ان کے خدام چلا رہے تھے۔ یہ قدیم کلیسا صلیب کی شکل میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں فرش کے نیچے گرم پانی بہتے رہنے کا ایسا انتظام تھا کہ قعدہ یا سجدہ کرتے وقت شدید سردی میں راحت بخش حرارت کا احساس ہوتا تھا۔ رومن دور میں اس کلیسا کی تعمیر میں رومیوں نے اپنا فن ختم کر دیا تھا اور اب شیخ کے خدام نے اس کے قریب جو خانقاہ بنائی تھی، اس پر انہوں نے بھی اپنی روحانیت کی حد کی تھی۔ روحانیت کے علاوہ نفاست اور نظافت اس قدر تھی کہ سمجھ نہ آتا تھا نظر کی تراوٹ زیادہ ہے یا قلب کی سرشاری فزوں تر ہے۔ خانقاہ کے بالمقابل ایک عمارت میں نیچے اشیائے ضرورت کی دُکان تھی اور اوپر دینی مدرسہ تھا۔ اہالیانِ محلّہ کے علاوہ شیخ کے تمام متعلقین گھر کی ماہانہ ضروریات یہیں سے خریدتے تھے تاکہ مدرسے کا خرچ پورا ہوتا رہے۔ کلیسا میں نماز اور خانقاہ میں محفل کا جو لطف تھا، وہ شیخ کے شاندار فن پارے اور مدرسے کی خود کفالتی دکان دیکھ کر دوبالا ہو گیا۔

دیکھیے! بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ترکی میں اسلام پسند طبقہ نہایت مشکل اور کسمپرسی کے عالم میں اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ اس کا تعارف اور اس سے استفادے کی جہتوں پر غور

کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ علامہ شمس الحق افغانیؒ نے علوم القرآن میں لکھا ہے جامع القرآن سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سات مصحف اپنی نگرانی میں تیار کروائے تھے جو عالم اسلام کے سات بڑے شہروں میں بھجوائے گئے۔ مکہ و مدینہ، کوفہ و بصرہ، شام و یمن اور بحرین۔ ان کی روداد علامہ کی زبانی سنیے: ''مصاحف عثمانیہ کا جو نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا گیا وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ، پھر حضرت معاویہؓ کے پاس رہا۔ وہاں سے اندلس اور اندلس سے مراکش کے دارالسلطنت فاس اور فاس سے پھر مدینہ منورہ پہنچا۔ جنگ عظیم اول میں مدینہ منورہ کا گورنر فخری پاشا اس کو دیگر تبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا اور وہاں اب تک موجود ہے۔ [اس قابل فخر اور بہادر مجاہد کا قصہ راقم دجال III میں درج کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے] مکی نسخہ سن 1657ء تک مکہ معظّمہ میں رہا۔ پھر دمشق کی مسجد جامع دمشق پہنچا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے جامع دمشق میں اس کی زیارت کی تھی۔ سلطان عبدالحمید کے دور حکومت میں جو 1976ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مسجد جامع دمشق کو آگ لگ گئی۔ اس میں یہ نسخہ بھی جل گیا۔ شامی نسخہ سلاطین اندلس نے قرطبہ منتقل کیا اور جامع مسجد قرطبہ میں رہا۔ وہاں سے مراکش اور مراکش سے تلمسان کے شاہی خزانے میں پہنچا۔ پھر ایک تاجر خرید کر فارس لایا اور وہاں اب تک موجود ہے۔ یمنی نسخہ جامع از ہر مصر کے کتب خانے میں موجود ہے۔ بحرین کا نسخہ فرانس کے کتب خانے میں موجود ہے اور کوفہ کا نسخہ کتب خانہ قسطنطیہ میں موجود ہے۔ بصرہ کا نسخہ کتب خانہ جدید مصر میں رہا اور اب معلوم نہیں کہ کہاں ہے؟ (مذکورہ تفصیل کے لیے دیکھیے علوم القرآن، از علامہ افغانی: 119-118)

ترکی کی کتابوں کی نمائش میں ہمارے ساتھ لاہور کے ایک معروف اشاعتی ادارے کے روح رواں جناب صوفی طارق خورشید صاحب بھی تھے۔ ان سے پچھلے سال کراچی کی

کتابوں کی نمائش میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ کراچی میں اشرف لوٹن صاحب چمڑے کے تاجر ہیں، جنہیں کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ ان کے پاس روئے زمین پر موجود پانچ میں سے چار مصاحف عثمانی کا عکس موجود ہے۔ طارق روڈ کے قریب اشرف صاحب کے کتب خانے میں حاضری دی تو چاروں مصاحف کا عکس بچشم خود زیارت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جس نسخے کا علامہ افغانیؒ نے لکھا ہے کہ معلوم نہیں کہاں ہے؟ اس کا کچھ سراغ ملا، لیکن وہ امانت ہے، ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ خود طارق صاحب پاکستان کے نامور خطاطوں سے شاہکار نمونے لکھوا کر جس نفاست سے چوکھٹے میں جڑتے ہیں، اسے کراچی کی اس سال کی نمائش میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ طبقہ اشرافیہ جوق در جوق ان کے ٹھیے پر آتا اور ذوق وشوق سے فن پارے خریدے جاتا۔ ایک صاحب نے تو اصرار کر کے اپنی صاحبزادی کی شادی پر لاہور سے دوبارہ بلوایا کہ شادی کی تقریب میں جا بجا یہ بابرکت آیات اور خوبصورت طغرے مزین کر کے تقریب کو رونق بخشیں۔

دیکھیے! پھر ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جب ادب برائے ادب، با ادب برائے زندگی نہ ہو، ادب برائے بندگی ہو تو تحریر کو کسی نظریاتی افادیت کا حامل بنانے کے لیے اس طرح کی ''جملاتی معترضیاں'' یا ''دخل در ملفوظاتیاں'' کرنی پڑتی ہیں۔ اب کسی طولانی عذر خواہی کے بغیر اصل بات کرتا ہوں۔ اسلام پسند ترکی حکومت نے توپ کاپی عجائب گھر میں موجود دو اہم چیزوں پر محققانہ قسم کی تصویری دستاویز مرتب کروائی ہے۔ ایک تو مصحف عثمانی کے مدنی نسخے پر جو اپنی اصل حالت میں توپ کاپی کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ دوسرے ان تبرکات نبویہ پر جو پوری دنیا میں اپنی نوعیت کے منفرد اور مستند نوادرات ہیں۔ ان کی تفصیل وتصاویر کو عالمی معیار کی طباعت سے مزین کر کے شائع کیا گیا ہے۔ جس کمرے میں نبوی تبرکات رکھے جاتے تھے، اس میں سلاطینِ عثمانی اظہارِ عقیدت کے طور پر بذاتِ

خود چاندی کے بنے ہوئے جاروب سے جاروب کشی کرتے تھے۔ اس کی تصویر اس کتاب میں موجود ہے۔ راقم اس کتاب میں موجود نادر نوادرات کے عکس سے کبھی کبھی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ قارئین بھی اس کے تعارف اور سرورق سے کسی حد تک دلِ حزیں کی تسلی کا سامان کر سکتے ہیں۔

سبق آموز جگ بیتی

ترکی کے اسلام پسندوں کی جاری وساری جدوجہد کا پس منظر اور رکاوٹوں والے سفر کو فراست وحکمت سے طے کرنا پوری دنیا کی معاصر مذہبی تحریکوں کے لیے مکالمے ومباحثے کا دلچسپ موضوع اور سبق آموز جگ بیتی ہے۔ احقر کو اپنی کم مائیگی کا اعتراف ہے۔ میرا علم وفہم ناقص اور مشاہدہ وتجزیہ ادھورا ہے۔ تحریکی کارکنوں کے ساتھ وقت بھی کم گزارنے کا موقع ملا۔ اس لیے جو کچھ سمجھ سکا، بلاکم وکاست عرض کیے دیتا ہوں اور معرکہ چونکہ جاری ہے۔ موضوع پہلودار اور ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش رکھتا ہے۔ اس لیے احقر کو کسی رائے یا حاصلِ بحث پر اصرار نہیں ہے نہ ہی مبالغہ آمیزی یا داستان طرازی سے کام لوں گا۔ جو کچھ ہے، اصحاب فکر ونظر کی خدمت میں پیش ہے۔ جو حضرات ادب برائے ادب، یا ادب برائے زندگی کے قائل نہیں، ادب برائے بندگی کے قائل ہیں، وہ ان شاء اللہ اسے کسی نہ کسی حوالے سے مفید پائیں گے۔ باقی ”نقش ثانی“ ہمیشہ ”نقش اول“ سے بہتر ہی ہوتا ہے اور ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والے تو موجود ہی رہتے ہیں۔

گفتگو کی ابتدا پچھلی صدی کی پانچویں دہائی سے کرتے ہیں جب سقوطِ خلافت کے سانحے کو تقریباً 25 سال گزر چکے تھے اور اس حادثے سے سہمی قوم کی رگوں میں دوڑتی اسلام

پسندی کسمسا کر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ چند دہائیاں پہلے ترکی سیاسی لحاظ سے تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا: (1) بایاں بازو۔ (2) دایاں بازو۔ (3) قوم پرست۔

ترکی میں چونکہ تقریباً چھ سو سال تک عظیم ترین اسلامی خلافت سایہ فگن رہی تھی اور ترکی قوم کے خون میں عثمانی خلفاء کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے قوم پرست ترک بھی لاشعوری طور پر اسلام کو پسند کرتے تھے، بلکہ جبر وقہر کے دور میں یہی قوم پرست تھے جنھوں نے لادین یا بے دین سیکولر طبقے کو برابر کی چوٹ دی۔ کمیونسٹوں اور سیکولروں کو مقابلہ دینے والے یہی قوم پرست تھے۔ یہ طبقہ اس زمانے میں لاشعوری طور پر بات اللہ اکبر سے شروع کرتا اور اس کی گفتگو میں ''یا اللہ، بسم اللہ، اللہ اکبر'' وغیرہ تکیہ کلام کے طور پر بے اختیار جاری رہتا تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں بھی بے ساختہ یہ الفاظ منہ سے نکلتے تھے۔ دیندار حضرات تو لڑائی جھگڑوں کے بغیر ویسے ہی زبان کو ان الفاظ سے تر رکھتے تھے۔ ترکی کی مخصوص تاریخ کا اثر تھا کہ قوم پرست ترک ہونا مسلمان ترک ہونے کے برابر تھا۔ ترک تہذیب کی حفاظت خود بخود اسلام کی حفاظت شمار ہوتی تھی۔ اس لیے قوم پرستوں کو آج بھی فخر ہے کہ مشکل دنوں میں یہ کام ہم نے کیا۔ ترکی معاشرے میں قوم پرستوں اور بائیں بازو والوں کے درمیان ہر سطح پر چپقلش چلتی رہتی تھی۔ ان دونوں گروپوں میں تصادم کے دوران اسلام پسند کالج و یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے ہاسٹل بنانے میں خاموشی سے سرگرم رہے۔ ان طالباتی اقامت گاہوں میں انہوں نے طلبہ کی نظریاتی تربیت کرتے کرتے ہماری رفتہ رفتہ سیاسی محاذ سنبھال لیا۔ اہل طریقت نے اصلاحی کام کا بیڑا اٹھایا۔ ترکی میں کل حنفی اور کل کے کل نقشبندی ہیں۔ مسلک و مشرب میں وہاں دوسرا کوئی رنگ نہیں ہے، لہٰذا بہت سی ان مجبوریوں اور علتوں و رکاوٹوں سے قدرت نے انہیں نجات دی ہوئی تھی۔ جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں ایک بزرگ شیخ سکندر پاشا کی جماعت کا دنیوی تعلیم کے طلبہ میں بہت زیادہ

کام اور اثرات تھے۔ آغا اسماعیل والے حضرت شیخ محمود آفندی صاحب کا یونیورسٹی کے طلبہ سے زیادہ عوام میں کام تھا۔ اس لیے دوطرفہ محنت بغیر کسی کو متوجہ کیے جاری تھی اور اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

شروع شروع میں مشکل حالات کی بنا پر کئی سالوں تک اس طرح کی سیاسی کشمکش چلی کہ سیاست کے مطلع پر کوئی دیندار نام سامنے نہیں آیا۔ سیاسی پلیٹ فارم پر چار قسم کی کل پارٹیاں آئیں۔ پابندی کی وجہ سے کسی کا نام اسلامی نہیں تھا، البتہ ان کی عرفیت بہرحال یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ یعنی (1) دایاں بازو: دیندار۔ (2) قوم پرست۔ (3) عام درمیانے لوگ اور بایاں بازو: مذہب دشمن۔

دینداراور قوم پرستوں کی ذیلی جماعتیں نہ بنیں۔ باقی میں کچھ نہ کچھ اختلافات اور ذیلی جماعتیں تھیں۔ بعد میں دیندار حضرات میں تقسیم ہوگئی۔ قوم پرست دین دار الگ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض دیندار لوگ سمجھتے تھے اسلام پسندوں کا رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان آگے نہیں آسکتا۔ جب بھی جیتے گا تو قومی اور بین الاقوامی طاقتیں اسے آگے نہیں آنے دیں گی۔ اس لیے وہ ووٹ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے دوسری پارٹیوں کو ووٹ دیتے تھے۔ مثلاً: ترگت اوزال اور سلیمان ڈیمرل کی پارٹی کو۔ یہ لوگ اربکان سے قریب تھے، لیکن وہ سمجھتے تھے کہ سیکولر معاشرے میں اربکان آگے نہیں جاسکتا۔ فوج، بیوروکریسی وغیرہ اربکان کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ سب کو پتا تھا کہ اربکان کھلم کھلا نمازی تھا۔ ترگت اوزال لبرل بمعنی ترکی لبرل سمجھے جاتے تھے۔ اربکان کی پارٹی کا نام ''ملی نظام پارٹی'' تھی۔ پاکستان میں ہوتی تو ''شریعہ نظام پارٹی'' نام ہوتا۔ ملت کا لفظ ''ترک ملت'' سے نہیں، ''ملتِ ابراہیم'' سے لیا گیا تھا۔ جب اس پر خاص سطح تک پہنچنے کے بعد پابندی لگی تو دوبارہ نام رکھا: ''ملی سلامت پارٹی''۔ اس میں بھی ''ملت'' سے مراد ''ابراہیمی ملت'' یعنی شریعت

میں جڑی ہوئی ملت تھا: ''مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ''۔ نہ کہ کوئی اور ملت۔ کیسا خوبصورت جگر کو ٹھنڈک دینے والا ذو معنی استنباط ہے جس کی استعاراتی پیروی کی جاسکتی ہے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اربکان کی پارٹی کی سیاسی اُٹھان دیکھ کر اس پر پابندی لگادی گئی۔ انہوں نے کچھ دن سانس لے کر ''ملّی سلامت پارٹی'' کے نئے نام سے کام شروع کردیا۔ ظاہری نام یہ تھا۔ پسِ پشت فلسفہ کا نام رکھا ''ملی گروش'' یعنی ''ملی سوچ'' قومی رائے، قومی طرز و طریقہ، قومی طرزِ فکر کا پلیٹ فارم۔ ''ملت'' سے مراد ایک مرتبہ پھر ''ابراہیمی ملت'' تھا، نہ کہ ترکی ملت۔ 70ء کی دہائی میں ''ملی سلامت پارٹی'' نے بڑے بڑے جلسے کیے۔ 74ء میں اس نے ایسی حیثیت حاصل کرلی کہ اس کے بغیر حکومت نہیں بن سکتی تھی۔ یہ '' کی پارٹی'' قرار پائی۔ اس نے انتہائی بائیں بازو کے ساتھ اشتراک کیا یعنی ''بلند اجوت'' کی پارٹی کے ساتھ۔ اسی دوران قبرص کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ ترکی نے فوج بھیج کر اسے یونان سے آزاد کروایا۔ انگلینڈ نے یونان کی مدد کی۔ ترکی نے قبرص کی مدد کی۔ اس دوران دین داروں اور قوم پرستوں کا اتحاد مضبوطی سے قائم رہا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے رہے۔ اسلام پسندوں نے اپنی اعتدال پسندی اور دور اندیشی سے ثابت کیا کہ ملکی مقاصد کے حصول کے لیے دشمن سے بھی اشتراک کیا جاسکتا ہے۔ اس دوران اسلام پسندوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی کہ عوام کی عرصۂ دراز سے ممنوع ضرورت ''دینی اسکول'' زور و شور سے نئے سرے سے بنائے گئے۔ اسلام پسند سیاست دانوں کا اصل کام طلبہ میں تھا۔ اس لیے وہ تعلیمی اداروں کے قیام پر بھرپور توجہ دیتے تھے۔ راقم پہلے بیان کرچکا ہے کہ اتاترک کے دور میں جب مدارس اور خانقاہوں کو ختم کیا گیا تو قحط الرجال کے سبب ایک وقت وہ آگیا کہ بائیں بازو کی جلاد صفت حکومت کو سوچنا پڑ گیا کہ لوگوں کے مردے نہلانے والے بھی ختم ہوگئے۔ یہ صورتِ حال کسی انتشار کا سبب نہ بن جائے۔ اتنی دینی

ضرورت تو پوری کرو کہ آواز نہ اٹھے اور معاملہ قابو سے باہر نہ ہو۔ اس خاطر چند ایک جگہوں پر ''امام وخطیب اسکول'' کھولے گئے اور ان میں پڑھنے والے بچوں کے لیے ''الہٰیات فیکلٹی'' کھولنے کا قانون بنایا گیا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان ستر کی دہائی کے شروع میں سیکولروں سے اشتراک کر کے نائب وزیراعظم بن گئے تو اس قانون کا سہارا لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ''امام وخطیب اسکول'' کھولے۔ عوام نے ان کا اتنا ساتھ دیا کہ اپنے محلوں اور شہروں میں پیسے اکٹھے کر کے اسکول بنائے اور حکومت سے اساتذہ لے کر حکومت کو اسکول وقف کیے۔ یعنی خود بنا کر حکومت کے سپرد کیے۔ اس طرح امام وخطیب اسکول بڑھنا شروع ہو گئے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ان کی تیز رفتار ترقی سے خائف نادیدہ قوتوں نے اوچھاوار کیا۔ 12 ستمبر 1980ء کو مارشل لا لگا اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔

مارشل لا حکومت نے 82 میں نیا آئین بنایا۔ ریفرنڈم کروایا گیا اور کنعان ایورن سات سال کے لیے صدر بن گئے۔ خفیہ بادشاہ گر قوتوں کے تعاون کی بنا پر صدر صاحب بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے 83ء میں انتخابات نئے سرے سے کروائے۔ سابقہ بڑی جماعتیں بدستور پابندی کا شکار تھیں۔ اس مرتبہ تین بڑی جماعتیں بنائی گئیں۔ دو ریٹائرڈ جرنیلوں نے۔ تیسری ترگت اوزال نے بنائی۔ اسلام پسند بظاہر اکثریت سے کامیاب نہ ہو سکے تھے، لیکن قدرت کو ایک دوسری شکل میں ان کی مدد منظور تھی۔ الیکشن کے آخری دنوں صدر کنعان نے کھل کر ایک ریٹائرڈ جرنیل کی بنائی ہوئی جماعت کی حمایت بھی کر دی۔ جو سراسر غیر قانونی عمل تھا۔ لہٰذا عوام نے بھاری اکثریت سے ''ترگت اوزال'' کو جتوایا۔ اوزال نقشبندی سلسلے سے منسلک گھرانے کا فرد تھا۔ شیخ سکندر پاشا صاحب کی جماعت سے خفیہ طور سے متعلق تھا۔ اوزال نے الیکشن تو جیتا لیکن ٹینشن میں تھا کہ سیکولر صدر اس کو حکومت نہ بنانے دے۔ بعد میں اوزال نے خود بھی اس کا اقرار کیا کہ اس بات کا خطرہ

موجود تھا کہ مجھے حکومت سازی کی دعوت نہ دی جائے، لیکن وہ نہایت جرأت مندانہ طریقے سے صدر کنعان کے پاس کاغذ جمع کروانے چلا گیا۔ صدر صاحب نے حکومت سازی کا اجازت نامہ جاری کر دیا۔ بعد میں جب 90ء کی دہائی میں جب کنعان ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ ٹی وی نے اس کا انٹرویو لیا۔ اس نے کھلے الفاظ میں بتایا کہ ترگت اوزال نقشبندی تھا، لیکن مجھے پتا نہ تھا، ورنہ میں کبھی اس کو حکومت بنانے کی اجازت نہ دیتا۔

بالآخر تین سال کے بعد میں 83ء سے مارشل لا سے نکل کر دوبارہ سیاسی نہج آ گیا۔ پارلیمنٹ منتخب تھی، لیکن صدر مارشل لا کے تحت کرائے گئے ریفرنڈم کے ذریعے صدر بنا تھا۔ سیاسی وزیر اعظم بننے کے باوجود ان سب پر پابندی تھی۔ کچھ عرصے بعد سیاست دانوں کو آزادی ملی تو نئی پارٹیاں بنانی شروع کر دیں۔ پروفیسر نجم الدین اربکان ''رفاہ پارٹی'' بنا کر پھر میدان میں آ گئے۔ پہلا الیکشن 88ء میں ہوا۔ ترگت کی جماعت پھر کامیاب ہوئی۔ اربکان کو صرف ڈھائی فیصد ووٹ ملے، لیکن نقشبندیت کے روحانی سلسلے کی محنت کام کر رہی تھی۔ ترگت اوزال نقشبندی بزرگوں کا تربیت یافتہ تھا۔ ترگت نے 83ء سے تیزی سے ترقیاتی کام کروائے۔ اس سے پہلے 60ء میں عدنان میندریس کے زمانے میں کام ہوئے تھے، لیکن اس کو خفیہ سیکولر طاقتوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مواصلات کے شعبے میں، محکمہ تعلیم میں اصلاحات کے حوالے سے۔ اس کے علاوہ وزارت خارجہ کی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ سلطنت عثمانیہ کے آخری دور سے ترک عرب تعلقات میں رخنے آ گئے تھے۔ دوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ اوزال نے عربوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عرب ممالک کے دورے کیے۔ نئے سرے سے بھائی چارہ کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ دشمنی کی دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ کچھ ہی عرصے میں عرب ممالک کے سیاح آنے شروع ہوئے۔ عوامی سطح پر تعلقات بڑھے۔ حج اور عمرہ کے لیے جانے

والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ گرمیوں میں ہزاروں عرب حضرات آنے شروع ہوئے۔ عرب حضرات نے یہاں صحت افزا مقامات میں گھر خریدنے شروع کردیے۔ تناؤ کی فضا میں کمی آ گئی۔ عرب ممالک سے تعلیم کے لیے ترکی آنے والوں میں اضافہ ہوا۔ ہمسایہ عرب ممالک شام، عراق کے ساتھ ترکی کی تجارت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اقتصادی حالات میں دوطرفہ بہتری آئی۔ کنعان ایورن ریٹائر ہوا تو نیا صدر ترگت اوزال بن گیا۔ یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے صدر بننے کے بعد اسلام پسند "رفاہ پارٹی" کے پانچ اہم ارکان اس کو مبارک باد کے لیے گئے تو یہ تاریخی الفاظ کہے: "ترکی میں پہلا ایسا شخص سربراہ بنا جس کا ماتھا سجدے کے لیے زمین پر جھکتا ہے۔ ہم اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔" ترگت کی جماعت کا نام "اناوطن پارٹی" ہے۔ "انا" کے معنی ہیں ماں، یعنی "مدر لینڈ پارٹی"۔ یہ پارٹی اندر سے کمزور ہونا شروع ہوگئی؛ کیونکہ اس نے لبرل اور دیندار دو متضاد گروپ کو جمع کیا تھا۔ جب جماعت کے اندرونی انتخابات ہوئے تو ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ ترگت اوزال کچھ عرصے بعد انتقال کر گیا۔

اس رمضان یعنی 2012ء کے رمضان کے دوران ترگت اوزال کی نعش نکال کر پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس کی موت مشکوک تھی، لیکن آج تک اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا تھا موجودہ حکومت نے اس کو اپنا فرض سمجھا۔ اس کے بعد لبرل سے متنفر ہوکر اس کی جماعت سے دیندار لوگ نکل کر اربکان کی طرف جانا شروع ہوگئے۔ ، لیکن الیکشن کا قانون یہ تھا کہ دس فیصد سے کم ووٹ حاصل کرنے والی جماعت اسمبلی میں نہ جاسکتی تھی۔ اربکان اسی بنا پر اسمبلی میں نہ جاسکے۔ اب ترگت کی پارٹی ٹوٹنے لگی۔ اربکان کی پارٹی میں اضافہ شروع ہوگیا۔ لیکن اربکان 92ء کے انتخابات ہار گئے۔ لوگوں کا خیال تھا اربکان کی پارٹی کو ووٹ دینے کا فائدہ نہیں۔ اس کو فوجی آگے نہیں

آنے دیں گے۔

یہ اسلام پسندوں کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا کہ وہ کسی طرح عوام کو بھی مطمئن کریں اور سیکولر فوج کی طرف سے پیدا کی گئی رکاوٹیں بھی ختم کریں۔ اس دوران اس پارٹی میں ایک جواں سال، دوراندیش اور ذہین شخصیت ابھر رہی تھی جو بچپن سے سیاست کی کشمکش دیکھتے ہوئے پروان چڑھا تھا۔ استنبول میں جماعت کا قائد بن چکا تھا۔ اس نے خاص ترتیب سے شہر میں سیاسی محنت کی جس میں خاص طور پر طالب علموں اور عورتوں کے شعبے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پورے استنبول شہر میں ہر تحصیل، ہر محلّہ، ہر گلی تک میں جال بچھایا گیا۔ مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ سلسلہ بنایا گیا۔ اس میں مرد و زن کا اختلاط نہ تھا۔ خواتین میں خواتین ہی جا کر دعوت دیتی تھیں۔ عورتوں نے پانچ سال گھر گھر محنت کی۔ بے شمار کارکنوں کا اضافہ کیا۔ مردوں نے مردوں میں کام کیا۔ کام کی ترتیب اور شکل پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو تبلیغی جماعت کے کام سے مشابہت رکھتی تھی، حالانکہ یہ خالص سیاسی کام تھا۔ گھر گھر دروازہ کھٹکھٹا کر دعوت دی جاتی تھی۔ اس دوران انہوں نے ''فلاحی سیاست'' شروع کر دی۔ وہ اس طرح کہ جب ہر گھر تک انہیں رسائی حاصل ہوئی، معلومات حاصل ہوئیں: کہاں یتیم ہے؟ کہاں بوڑھا ہے؟ اور کہاں بیوہ؟ جماعت کی مالی حالت کمزور ہونے کے باوجود مقامی کارکن اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ضرورت مند افراد کی خدمت کرتے تھے صرف اجر کے حصول کے لیے۔ اس کام کو مجاہدانہ روح کے ساتھ کیا گیا۔ اسی دوران جوانوں کے نظریاتی تربیتی کیمپ جاری رہے۔ نوجوانوں کو اسلامک وژن دینا ان کا خاص کام تھا۔ سارا کام اللہ کی خوشنودی کے لیے سرگرمی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بظاہر سیاسی تحریک تھی، حقیقت میں اسلامی رنگ تھا، اسلام کا نام لیے بغیر۔ ان لوگوں کے ہاتھوں حسن البناء، سید قطب، حضرت علی میاں، مولانا یوسف کاندھلوی اور دوسرے بزرگوں کی کتابیں نظر آتی

تھیں۔ طیب اردگان جواب تک جماعت کا ذمہ دار تھا، اس نے اس دوران اتنی محنت کی کہ غیر مشروع مقامات میں جاکر بھی دعوت دیتا تھا۔ مثلاً: اپنی جماعت کے کارکنوں کے ساتھ قحبہ خانے جا پہنچتا تھا۔ زمانے کی ٹھکرائی ہوئی مظلوم خواتین پہلے پہل یہ سمجھتی تھیں کہ اسلام پسند سخت گیر لوگ ہیں۔ یہ لوگ برسر اقتدار آئے تو سب سے پہلے ہمیں بے روزگار یا پابند سلاسل کریں گے۔ اس نے ان کو بتایا کہ میں آپ کے لیے باعزت متبادل روزگار اور باعزت زندگی کا انتظام کروں گا۔ پھر آپ کی مرضی ہے کہ کس زندگی کو اختیار کرتی ہیں؟ اس کی گفتگو ایسی دل پذیر تھی کہ وہ خواتین جو ذرا دیر پہلے اس سے خائف تھیں، اب سب نے مل کر اسے اپنے دکھڑے سنانا شروع کیے کہ ہمارے ساتھ یہاں یہ ظلم ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے۔ ہم نے سب کچھ گنوا دیا، پھر بھی کچھ نہ ملا۔ نہ ہمارا کوئی حال ہے نہ مستقبل۔ الغرض ان خواتین کو یقین ہوگیا کہ یہ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ یہ لوگ آگے آئے تو ہمیں ذلت کی اس زندگی سے بچا لیں گے۔ یہ ان کے لیے امید کا ستارہ بن گیا۔

یہاں تک کہ 94ء میں الیکشن بلدیاتی کا زمانہ آگیا۔ اسلامی رفاہ پارٹی کا نوجوان الیکشن کے لیے کھڑا ہوا۔ پانچ اہم پارٹیوں میں سے یہ سب سے چھوٹی پارٹی کا سب سے جواں سال امیدوار تھا۔ دوسرے جغادری سیاست دان بہت سرمایہ دار تھے۔ یہ نوخیز امیدوار اپنی مہم کے لیے مالی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔ لیکن عوامی سطح پر چار سال گلی محلے میں جو کام یہ کر چکا تھا، اس سے جوانوں کا ایسا گروہ کھڑا ہوگیا تھا جو اسے استنبول کا میئر بنانا پورے استنبول کے باسیوں کے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔ یہ عام نوجوان تھے۔ معروف معنوں میں دین دار نہ تھے۔ دین دار طبقہ تو ویسے ہی اس کی جیت کو اسلام کی ضرورت اور دینداروں کی کامیابی سمجھتا تھا۔ وہ جہادی جذبے سے اس کی مہم چلاتے تھے، لیکن مخالف طبقہ بھی خاموش نہ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اوچھے ہتھکنڈے آزما رہا تھا۔

روداد اس زمانے کی

الیکشن مہم کے شروع زمانے میں رفاہ پارٹی کے استنبول آفس میں فون آیا۔ اس میں دھمکی دی گئی آج دن فلاں سے فلاں وقت آپ کی بجلی اور ٹیلی فون بند رہیں گے۔ یہ کہتے ہی ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ ٹیلی فون سننے والے نے اپنے ساتھیوں کو فون کیا کہ ایک فون آیا ہے کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک فون بند رہے گا۔ اگر اس وقت کے دوران آپ کا مجھ سے رابطہ نہ ہو تو آپ پریشان نہ ہوں۔ عین وقت پر بجلی منقطع ہو گئی۔ فون بے جان ہو گیا اور پھر بتائے گئے وقت پر بجلی بحال ہو گئی اور رابطہ جڑ گیا۔ اب دوبارہ نامعلوم فون آیا: ”سمجھ لو اس ملک میں جو ہم کہتے ہیں، وہی ہوتا ہے۔ تمہارا نونہال اُمیدوار اور تم کون ہو؟ اپنے اُمیدوار سے کہو دستبردار ہو جائے ورنہ اگلا قدم خونی ہوگا۔“ اُردگان سے رابطہ ہوا۔ کیا کریں؟ اس نے کہا: ”کسی دھمکی کا اثر نہ لو۔ اپنا کام جاری رکھو۔“ لیکن وہی ہوا۔ ان کے علاقائی دفتر میں بم پھینکا گیا۔ ایک ساتھی شہید اور کئی زخمی ہو گئے۔ دوبارہ فون آیا: ”اب بھی اپنے نوجوان قائد سے کہو باز آ جائے۔ ورنہ ہمیں اس کے تمام پروگراموں کا پتا ہے۔ آج کے پروگرام میں وہ شوٹ کر دیا جائے گا۔ دوستوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ سب اکٹھے ہوئے۔ اردگان نے کہا! آج تقریب وقت پر نہ ہوئی تو ہمارے حامیوں کو بہت غلط پیغام ملے گا۔ لہذا خوب

تیاری ہوئی۔ ویگن پر چڑھ کر تقریر کرنی تھی۔ یہ باز نہیں آیا۔ عین اسی مقام پر تقریر کی اور گاڑی کی چھت پر کھڑے ہو کر کی۔ اس کی جرءات اور مقبولیت کو دیکھ کر دوست دشمن سمجھ گئے تھے کہ آیندہ انتخابات میں اس کی فتح یقینی ہے۔ بہرحال کشمکش جاری رہی۔ ایک طرف دھمکیاں اور ناجائز حربے تھے۔ دوسری طرف خلوص، جرات اور عوام سے سچی ہمدردی تھی۔ نتیجے نے اس کی تصدیق کردی۔ اردگان سب کو شکست دے کر میئر بن گیا۔ اس بلدیاتی الیکشن میں نہ صرف شہر استنبول بلکہ دیگر علاقوں کے میئر بھی رفاہ پارٹی کے منتخب ہوئے۔ یہ اربکان کی سیاسی لیڈر شپ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ جتنے شہروں میں ان کے امیدوار کامیاب ہوئے، ان میں اتنا زبردست کام ہوا جو ترکی کی بلدیاتی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عوام نے سمجھ لیا کہ یہ کام کے لوگ ہیں۔ انسانی خدمت کا ہدف ان کے سامنے ہے، اب قومی انتخابات میں بھی اسلام پسندوں کی جیت کے آثار دکھائی دینے لگے، لیکن دوسری طرف سے بھی پروپیگنڈے کا نیا دور شروع ہوگیا۔ اس سے پہلے بھی 70 سال سے دینداروں کے خلاف پروپیگنڈا چلتا رہا تھا۔ لادین قوتیں عوام کو کہتی تھیں دیندار آدمی اگر حکومت بنائے گا تو سب کی زندگی کو تباہ کردے گا۔ عورتوں کو برقعے پہنا دے گا۔ مردوں کو چار چار شادیاں کروادے گا۔ ترکی یورپی یونین میں جانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ ترک عوام کو ڈراتے تھے کہ یہ اسلامی جماعت یورپ مخالف ہے۔ لہٰذا جو لوگ ملک کو یورپ کی طرح مادی ترقی کی طرف لے جانا چاہتے تھے، وہ انہیں ووٹ دینے سے گھبراتے تھے۔ اس طرح کے کانٹے چننے میں بہت سی قوت اور توانائی صرف ہوئی۔

96ء میں قومی اسمبلی کے الیکشن میں پہلی دفعہ اربکان کی پارٹی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ اس نے ۵۵۰ میں سے ۱۵۸ سیٹیں حاصل کیں۔ سب سے بڑی جماعت ہونے کے باوجود یہ تعداد حکومت بنانے کے لیے ناکافی تھی۔ اسمبلی میں ۵ جماعتیں تھیں جو

دس فیصد نمایندگی تو حاصل کر چکی تھیں، لیکن کسی کے پاس بھی ایسی اکثریت نہ تھی کہ حکومت بنا سکے۔ اس وقت کے صدر سلیمان ڈیمرل نے اسلامی جماعت کو حکومت بنانے کے لیے کاغذ دے دیے، لیکن جب یہ کاغذ لے کر بقیہ چار پارٹیوں کے پاس گیا تو سب نے ایک ایک کر کے اس سے اتحاد کرنے سے انکار کر دیا۔ اصول کے مطابق صدر نے تین موقع دینے تھے۔ دوسری باری میں بھی کوئی جماعت سیاسی ڈیل کے باوجود نہ مانی۔ تیسرے اور آخری راؤنڈ میں تانسو چلر نامی خاتون نے اس کے ساتھ اتحاد کو قبول کر لیا۔ دونوں کے اشتراک سے ۹۶ء میں مشترک حکومت بن گئی۔ اس حکومت کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ تانسو چلر سے کیے گئے معاہدات میں سے ایک شق یہ تھی کہ پہلے ایک سال اربکان وزیر اعظم رہے گا۔ دو سال تانسو چلر رہے گی۔ پھر آخری دو سال پھر اربکان وزیر اعظم ہوگا۔ اس زمانے میں پانچ سال کے لیے انتخاب ہوا کرتا تھا۔ اب چار سال کر دیا گیا ہے۔ اربکان کے پہلے ایک سال کے نصف اول میں ترکی میں عجیب و غریب تیز رفتار ترقیاتی تبدیلیاں ہوئیں۔ دوسرے مہینے ہی سرکاری ملازمین کی تنخواہیں 50 فیصد سے لے کر 65 فیصد تک بڑھا دی گئیں۔ بدعنوانی ختم کرنے کے لیے بہت سے مؤثر اقدامات کیے گئے۔ سیکولروں کے ہاتھ مسخ ہونے والا چہرہ رفتہ رفتہ نکھرنے لگا۔ وزیرِ خارجہ عبداللہ گل کو بنایا گیا۔ اُردگان اس وقت استنبول کا میئر تھا، لیکن یہ حکومت ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ مخالف قوتوں نے مل کر جن میں سب سے اہم فوج تھی، اربکان سے کہیں زیادہ تانسو چلر کو ناکام بنایا، کیونکہ نجم الدین اربکان ایک نظریاتی سیاسی پارٹی تھی۔ اس کے بندوں کو توڑنا یا بدلنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔ تانسو چلر کے لوگ اتنے مضبوط نظریاتی نہ تھے۔ مخالف عناصر نے اس کے بہت سے ارکان کو لالچ یا دھمکی سے خرید کر یا خوفزدہ کر کے پارٹی سے مستعفی کروا کر دوسری لبرل پارٹی ''خانہ وطن پارٹی'' کا حصہ بنواتے گئے۔ پیچھے باقی رہنے والی نشستیں اتنی نہ تھیں کہ محترمہ کی

کوئی مضبوط حیثیت باقی رہے۔ سال پورا ہونے پر اربکان نے اپنے وعدے کے مطابق تانسو چلر کو باری دینی تھی۔ اربکان نے اسے کہا میں تمہیں وعدے کے مطابق حکومت دینے پر تیار ہوں، لیکن میری معلومات کے مطابق خفیہ مقتدر قوتیں تمہاری حکومت نہیں بننے دیں گی۔ صدر تمہیں موقع ہی نہ دے گا۔ منتقلی اقتدار کا طریقہ یہ تھا کہ اربکان استعفیٰ دے گا۔ تانسو چلر کاغذات جمع کروائے گی، پھر اربکان کی طرف سے اسے منتخب کروایا جائے گا۔ تانسو چلر نے صدر سلیمان ڈیرل سے ملاقات کی جو اس خاتون کی سیاسی جماعت کا بانی اور سابقہ سربراہ تھا۔ تانسو کو امید تھی کہ یہ مجھ سے بے مروتی نہیں کرے گا۔ صدر ڈیمرل نے محترمہ خاتون کو تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کو موقع دیں گے۔ چلر صاحبہ نے واپس آ کر اربکان سے کہا میں صدر سے ملاقات کر کے آئی ہوں۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ تمہیں موقع ضرور دیا جائے گا، لیکن سیاست کے سینے میں دردمند دل اور منہ میں سچی زبان نہیں ہوتی۔ یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔ اسی دوران انقرہ کے ایک علاقے میں رفاہ پارٹی کے نوجوانوں نے فلسطین اور بیت المقدس پر ایک سٹیج شو کیا۔ اس کو بہانہ بنا کر اسی دن صبح فوج ٹینک سڑکوں پر لے آئی۔ یہ فوجیوں کی طرف سے مارشل لا کا اشارہ تھا۔ ملک بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس وقت فوج میں تین طرح کے خیالات کے حامل عناصر تھے:

(1): پہلا اربکان کو پھانسی دے کر مارشل لا لگانا چاہتا تھا، لیکن اس سے ملک میں خون ریزی کا خطرہ تھا۔

(2) دوسرا اسے صرف سیاست سے ہٹانا چاہتا تھا کہ مارشل لا سے ملک کی ساکھ عالمی سطح پر خراب نہ ہو۔

(3) تیسرا گروہ اسے معمول کی معتدل سیاسی حیثیت کے ساتھ سیاست میں شامل رہنے کی اجازت کا قائل تھا۔

اس کشمکش کے دوران رفاہ پارٹی میں یہ بات چل رہی تھی کہ اگر فوج سے مخاصمت جاری رہی تو ملک کو بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا مدبرانہ مفاہمت کی ضرورت اور اس کا خاکہ زیرِ بحث رہتا تھا۔ اس دوران تانسو چلر کے اطمینان اور تسلی کے بعد اربکان نے استعفیٰ دے دیا۔ جب استعفیٰ صدر ڈیمرل کے پاس پہنچا تو اس نے اسے قبول کرنے کے بعد تانسو چلر کو موقع دینے کے بجائے مسعود یلماز کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس دوران تانسو چلر صاحبہ کے وزیر اور ارکان خرید لیے گئے تھے یا خوفزدہ کر دیے گئے تھے۔ وہ سب مسعود یلماز کے پاس چلے گئے اور محترمہ تانسو چلر منہ دیکھتی رہ گئیں۔ مسعود یلماز نے بقیہ دو پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت بنالی۔ یہ تمام کاروائی فوجی جرنیلوں کی سرپرستی اور نگرانی میں انجام دی گئی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ فوج نے اس موقع پر حکمران اسلامی پارٹی کو رجعت پسندی کے طعنے دیے۔ میڈیا کے سامنے اس الزام کو بار بار دہرایا گیا۔ ملک میں مارشل لا تو نہیں لگا، لیکن خوف و ہراس پھیل گیا اور دیندار لوگوں پر سختی شروع کر دی گئی۔ اربکان پارٹی کے معاونین حضرات کی معیشت کو بھی فوج کی طرف سے نشانہ بنایا گیا۔ فوج کے اندر ایک گروپ بن گیا۔ اس وقت بحریہ کے چیف نے ایک گروپ بنایا جس کا نام ''بائے چاشماں گروپ'' یعنی ''ویسٹرن ورکنگ گروپ'' رکھا گیا۔ اس کا مقصد دیندار لوگوں کے پھیلنے کے اسباب کا جائزہ لینا اور اس کا سدّ باب کر کے انہیں معاشرے میں مزید نفوذ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ انہوں نے نئی ''منتخب'' حکومت سے ایسے قوانین منظور کروائے جن سے مدد لے کر تمام اسلامی تحریکوں کو کمزور یا ختم کیا جا سکے۔ یہ سیاہ دور 96ء سے شروع ہوتا ہے۔

فوج نے دیندار حضرات پر فوج میں داخلے یا ترقی کے دروازے بند کرنے کے لیے مزید سختی شروع کر دی۔ جو کبھی چھپ کر نماز پڑھتا ہوا دیکھ لیا جاتا، اسے کسی نہ کسی طرح فرضی اسباب پیدا کر کے معزول کر دیا جاتا۔ اربکان کی جماعت کی مدد کرنے والے تاجر حضرات کو

ہراساں کیا گیا۔ سرکاری اداروں اور بالخصوص فوج کی کینٹینوں میں جو چیزیں دیندار کمپنیوں کی رکھی جاتی تھیں، ان پر پابندی لگا دی گئی۔ خود اربکان اور اس کی پارٹی کے بہت سارے افراد پر آئین کی خلاف ورزی کے عنوان سے طرح طرح کے مقدمات بنا دیے گئے۔ آخر کار اس اسلامی پارٹی پر اگلے پانچ سال کے لیے پابندی لگا کر اس پر سیاست کے دروازے بند کر دیے گئے۔

اربکان اور اس کے چار قریبی ساتھیوں پر سیاست شجر ممنوعہ قرار دے دی گئی۔ اس سے چند مہینے پہلے استنبول کے مقبول نوجوان میئر رجب طیب اردگان پر ایک تقریر کے دوران کچھ اشعار پڑھنے پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں اسے دس مہینے کی سزا سنا دی گئی۔ اس سزا کی کم از کم مدت جان بوجھ کر اتنی مقرر کی گئی کہ ترکی قانون کے مطابق آئندہ ایسا شخص سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ جبکہ اس کا جرم اتنا نہ تھا بلکہ شعر پڑھنا سرے سے جرم کے زمرے میں آتا ہی نہ تھا۔ مخالفین نے اپنے طور پر اس کی سیاسی زندگی کا خاتمہ کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

زندان سے پارلیمان تک

نئ حکومت جو مسعود یلماز کی سربراہی میں بنائی گئی تھی، زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اس کو حکومت عارضی اور آزمائشی طور پر بنانے دی گئی تھی۔ اس نے نہ چلنا تھا نہ وہ چل سکتی تھی۔ ایسی لوٹ مار مچی کہ اس دوران بہت سے بینک دیوالیہ ہو گئے۔ اس دوران وہ تاجر حضرات جن کا پیسہ تانسو چلر کے وزیر خریدنے میں لگوایا گیا تھا۔ انہوں نے مسعود یلماز کی حکومت قائم کروانے کے بعد جی بھر کر خراج وصول کیا۔ 80 ملین ڈالر بدعنوانی کی نذر کیے۔ ملک کا دیوالیہ نکل گیا۔

اگلے انتخابات میں لیفٹیننٹ بلند ایجوت جیت گیا۔ اس کی پارٹی DSP کے نام سے تھی۔ ''ڈیموکریٹک سول پارٹی''۔ پارلیمان میں نشستوں کی صورتِ حال یہ تھی کہ اس کی پارٹی سب سے زیادہ ووٹ لینے کے باوجود اکیلی تنہا حکومت نہ بنا سکتی تھی۔ اس نے ملی حرکت پارٹی اور قوم پرستوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم پرست حکومت میں آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران اربکان کی پارٹی کے بچے کھچے ارکان نے ''فضیلت پارٹی'' بنائی اور اپنا قائد ''رجائی قوتان'' کو منتخب کیا۔ یہ الیکشن میں چوتھے نمبر پر رہی۔ نیا صدر بلند ایجوت معمر اور مریض تھا۔ بعض مرتبہ کئی کئی ہفتے ہسپتال میں داخل رہتا

تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا اصل میں حکومت کوئی اور چلا رہا ہے۔ بدعنوانی اور نظام میں مرکزیت نہ ہونے کے سبب اقتصادی بحران بڑھتا ہی چلا گیا۔ ملک اقتصادی لحاظ سے سنگین بحران کا شکار ہوتا چلا گیا۔ بحرانوں کے اس دور میں عبداللہ گل اور طیب اردگان گروپ نے پارٹی کے عملی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پچھلے تین دہائیوں سے پارٹی جس طرح چلتی رہی ہے، اس کے مطابق وہ ہمیشہ پابندی کا شکار ہوتی رہے گی۔ جب ہم اسلام کے نام یا اسلامی تعارف کے ساتھ میدان میں آتے ہیں تو کامیابی کے قریب پہنچتے ہی جابرانہ نظام کسی نہ کسی بہانے ہم پر پابندی لگا دیتا ہے۔ اس کی ہیئت قائمہ کچھ اس طور پر ہونی چاہیے کہ آیندہ اس پر پابندی نہ لگے، لیکن پارٹی کی قیادت پر فائز ”رجائی قوتان“ کسی طرح کی تبدیلی یا اس طرح کی تبدیلی کو مناسب نہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کی تبدیلی مؤسسین جماعت کے مقرر کردہ راستے سے انحراف ہوگا۔ خود پروفیسر نجم الدین اربکان ان حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کے روادار یا متحمل نہ تھے۔ کوئی فریق دوسرے کو قائل نہ کر سکا ہر ایک اپنے موقف پر دلائل لکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ دونوں گروپوں کا نام اصلاح پسند اور قدامت پسند کے حوالے سے مشہور ہوتا گیا۔ عبداللہ گل نے پارٹی کے سالانہ انتخابات میں رجائی قوتان کے خلاف صدارت کے عہدے کے لیے مقابلہ کیا۔ تبدیلی کے حامی یہ امیدوار کافی تعداد میں ووٹ حاصل کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ اس نے رجائی قوتان کی کامیابی کے بعد اسے مبارکباد دیتے ہوئے پھول پیش کیے۔ اس عرصے میں طیب اردگان متنازع فیصلے کے تحت دی گئی سزا پوری کر کے باہر آ گیا تھا۔ ان سب نے خاموش تحریک شروع کی، لیکن جب امکانات بہار پیدا ہونے لگے تو وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ اسلام پسندوں کی یہ جماعت ایک مرتبہ پھر خفیہ بادشاہ گر قوتوں کے عتاب کا شکار ہوگئی۔ پانچویں مرتبہ اس پارٹی پر جواب ”فضیلت پارٹی“ کے نام سے کام کر رہی تھی، پابندی لگا دی

گئی۔ وجہ وہی اسلامی نام اور اسلامی کام قرار پایا۔ اس سے ''اصلاح پسند'' نوجوانوں کی رائے کو تقویت ملی کہ نام کوئی بھی ہو اور کام کا عنوان کوئی بھی ہو، جب حقیقت اسلام کے تابع ہے تو ظاہری تعارف بدلنے میں حرج نہیں۔ ماضی کی پہچان سے چمٹے رہ کر دشمن کو موقع دینا دانش مندی نہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے طرز پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا نئی جماعت بناتے وقت قدامت پسند اور اصلاح پسند الگ الگ ہو گئے۔ قدامت پسند ''سعادت پارٹی'' کے روایتی مروّجہ نام سے اور جدت پسند ''انصاف اور ترقی'' (جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی) کے بدلے ہوئے نئے نام سے نئی جماعت کے تحت کام کرنے لگے۔ دوسری جماعت کا ترکی نام ''عدالت اور کھال کھنی پارٹی'' ہے۔ کھال کھنی بمعنی ترقی۔ اس کے ترکی الفاظ کا مخفف ''آک'' یا ''آق'' ہے جس کا معنی سفید یا بے داغ چیز کے ہوتے ہیں۔ اصلاح پسندوں کی اس نوخیز جماعت کا پہلا صدر عبداللہ گل کو بنایا گیا۔ جماعت میں طیب اردگان جیسا مقبول قائد موجود تھا، لیکن اس پر تاحال سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد تھی۔ لہٰذا اس کے پرانے دوست اور ساتھی عبداللہ گل کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نومولود جماعت کو وجود میں آئے ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ نئے الیکشن سر پر آ گئے۔ دونوں رہنماؤں نے مل کر زبردست انتخابی مہم چلائی۔ عوام میں اس موقع پر حیرت انگیز جوش و خروش دیکھنے میں آیا۔ اس سے پہلے اسلام پسند ان پانچ ناموں سے کام کرتے رہے ہیں۔ ملی پارٹی، ملی سلامت پارٹی، رفاہ پارٹی، فضیلت پارٹی، سعادت پارٹی۔ پانچویں سے اسلام پسندی کی خوشبو آتی تھی۔ اس لیے سیکولر طبقہ چوکنا ہو کر انہیں ناکام کرنے کے ہتھکنڈے آزمانا شروع کر دیتا تھا۔ کارکنوں کو مہم چلانے میں بھی طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ نئے نام میں چونکہ عوام کو انصاف فراہم کرنے اور ترقی سے نوازنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اس لیے لادین طبقے کی زبان تالو سے آ لگی تھی، جبکہ تحریکی کارکنوں کو وسیع

میدان ہاتھ آ گیا تھا۔ دین دار عوام دل سے اسلام پسندوں کو آگے کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ لادین طبقہ بھی سیکولر حکمرانوں کی بدعنوانی اور لوٹ مار کی وجہ سے تنگ تھا۔ وہ بھی طبقاتی انصاف اور ملکی ترقی کا دل سے خواہاں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی قریب آنے لگا اور نوجوان ترکوں کی نئی حکمت عملی انتہائی کامیاب رہی۔ چھٹا نام ''انصاف اور ترقی پارٹی'' تھا۔

نام بدل کر سامنے آنے والی نوزائیدہ جماعت نئے انتخابات میں 35 فیصد ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جبکہ سعادت پارٹی کے ووٹوں کا تناسب 5 فیصد کے لگ بھگ تھا۔ لہٰذا وہ اسمبلی میں بھی نہ آسکی۔ اسمبلی میں صرف دو پارٹیاں آنے میں کامیاب ہوئیں۔ ''آک پارٹی'' اور ''سی۔ ایچ۔ پی'' یہ اتاترک کی بنائی ہوئی ''جمہوریت خلق پارٹی'' تھی۔ جس نے تقریباً بیس فیصد کے لگ بھگ ووٹ حاصل کیے تھے۔ چونکہ اسمبلی میں صرف یہ دو جماعتیں آنے میں کامیاب ہوسکی تھیں، اس لیے تمام وزارتیں انہی دونوں کے درمیان تقسیم ہوئیں۔ عبداللہ گل جس کی جماعتی نشستوں کی تعداد 362 تھی۔ بھاری اکثریت کے ساتھ اسمبلی میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس کا دیرینہ رفیق طیب اردگان دس مہینے کی سزا پانے کے سبب تا حال سیاست کے منظر نامے سے غائب کر دیے جانے کی سازش کا شکار تھا۔ یہ سازش آئین کی ایک شق کا سہارا لے کر کی گئی تھی۔ عبداللہ گل نے وزیر اعظم بننے کے بعد اسمبلی میں اس شق میں ایسی ترمیم منظور کروائی جس کے سبب طیب اردگان پر لگی پابندی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد اس جماعت کے ایک رکن نے استعفیٰ دے کر طیب اردگان کے لیے ضمنی انتخابات کے ذریعے اسمبلی میں آنے کی راہ ہموار کر دی۔ اس رکن کی نشست اس علاقے میں تھی جہاں پر تقریر کرنے پر اردگان کو نااہل قرار دیا گیا تھا۔ اردگان اسی شہر اور حلقے سے جیت کر اسمبلی کا رکن بنا جس میں شعر پڑھنے پر اس پر پابندی لگائی گئی تھی۔ اس شہر کا نام ''ماردن'' ہے۔ یہ اردگان کا سسرالی شہر بھی ہے۔

اس کے بعد کی تاریخِ وفا و حکمت بھی یادگار رہے گی۔ اب کی مرتبہ عبداللہ گل نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ نوجوان قائد رجب طیب اردگان تمام رکاوٹیں عبور کرتا ہوا وزیر اعظم کے منصب تک جا پہنچا۔ مخالفین منہ تکتے رہ گئے اور اسلام پسندوں کی حکمت و فراست نے نئی تاریخ رقم کر دی۔

یہ تھی نوجوان اصلاح پسندوں کی تاریخی کامیابی کی روداد۔ اقتدار میں آنے کے بعد ان کا رویہ تمام دوسری جماعتوں کے ساتھ ایسا حکیمانہ تھا کہ چند ایک متعصب مخالفین کے علاوہ سب ان کے حامی ہو گئے۔ اس نے اپنی جماعت کو روایتی نظریاتی اسلامی جماعت کے تعارف اور عنوان کے بجائے رفاہی سیاسی پارٹی کی شکل دی تاکہ غیر اسلام پسندوں کو بھی اس میں آنے یا کم از کم اتحاد کرنے کا موقع ملے اور ان پر پابندی بھی نہ لگے۔ اس سے قبل ان پر مختلف نام اپنانے کے باوجود پانچ مرتبہ پابندی لگ چکی تھی۔ چنانچہ تانسو چلر، مسعود یلماز وغیرہ حتیٰ کہ اس کی سب سے زیادہ مخالف پارٹی سی-ایچ-پی کا جنرل سیکرٹری بھی ان کے اندازِ سیاست سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ آ کر شامل ہو گیا۔

توقع تھی کہ یہ آتے ہی حجاب جیسی چیزوں کو لازم قرار دیں گے اور مخالفین کو ہلچل مچانے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے آتے ہی کہا: ”ہم تو ملکی مسائل کو حل کرنے، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے اور قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے آئے ہیں۔“ یعنی وہ کام کرنے ہیں جن کے لیے ہمیں امیر بنایا گیا ہے۔ ”سید القوم خادمھم“ حجاب وغیرہ گھر کے مسائل ہیں۔ انہیں عوام خود حل کریں۔ خود میں اپنی بچیوں کو ہمارے ملک میں حجاب پر پابندی کے سبب باہر ملک پڑھوانے پر مجبور ہوں۔ ہم تو ملک کی دولت ملک پر خرچ کرنے کے لیے کام کریں گے۔ [اس میں سابقہ لادین حکمرانوں پر تنقید تھی کہ انہوں نے مذہبی شعائر کو ختم کرنے میں سارا زور صرف کیا۔ ملک کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اُلٹا اتنا لوٹا

اور بدعنوانی کو اتنا فروغ دیا کہ ترکی بدعنوان ترین ممالک میں شمار ہونے لگا۔

اس وقت صورتِ حال ایسی تھی۔ اردگان کی حکمت عملی کو نہ سمجھنے والے موافق ومخالف دونوں متضاد تبصرے کررہے تھے۔ موافق دیندار پارٹی جس کا نام ''سعادت پارٹی'' تھا اور وہ روایتی سیاست پر اڑے رہنے کی وجہ سے اس مرتبہ پیچھے رہ گئی تھی، اس نے کہا: ''دیکھا بیرون طاقتوں کا ایجنٹ ہے۔ اس نے اسی لیے پارٹی توڑی ہے۔'' مخالف بائیں بازو نے کہا: ''یہ چولہ بدل رہا ہے۔ کھیل کھیل رہا ہے۔ عنقریب شریعت کے نفاذ کا اعلان کرے گا۔'' البتہ عوام کی خاموش اکثریت نے اس کی حکمت وفراست کی داد دینے پر اکتفا کیا جو اس کے مزاج اور طریق کار کو سمجھ رہی تھی۔

مقبول اور نوجوان اصلاح پسند وزیر اعظم نے الیکشن جیتنے کے بعد وزیر اعظم بننے سے پہلے ہی جہاز میں صحافیوں اور تاجروں کی جماعت ساتھ لے کر یورپ کا تیز رفتار طوفانی دورہ شروع کیا۔ اس کا مدّعی یہ تھا کہ ہم یورپی یونین کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ اتنا مسلسل اور تیز رفتار کام کررہا تھا کہ اس کے ساتھ چلنے والے تھک ہار کر باری باری فرائض انجام دیتے تھے، لیکن یہ مسلسل جاگ کر کام کرتا تھا۔ اس کا سونا جاگنا، کھانا پینا سب جہاز میں انجام پاتا تھا۔ اس دورے کا خاص ہدف ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے راہ ہموار کرنا تھا اس کے اقتصادی ماہرین کئی ممالک کے ساتھ تجارتی امکانات کی تفصیل مہیا کرنے اور یورپی اشتراک کے ساتھ تجارت کے فروغ کی بنیاد رکھنے اور بند راہیں کھولنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ترکی میں قدرتی وسائل عرب ممالک جیسے نہیں۔ کچھ حاصل کرنا ہے تو اپنے زور بازو سے کرنا پڑے گا۔ یہ حقیقت نومنتخب حکمران کے پیش نظر تھی۔ اس لیے اس نے ملکی وبین الاقوامی تجارت کے فروغ کو ہدف قرار دیا ہوا تھا۔ جس میں اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

وزیر اعظم بننے کے بعد اس نے آئی ایم ایف کے قرضے اتارنے شروع کیے۔ آئی ایم

ایف کے قرضے کبھی نہ اترنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ ورلڈ بینک اور اس ادارے کا طریق کار ہی نہ چھڑائے جانے والے چنگل میں لینے کا ہوتا ہے۔ نوزائیدہ حکومت پر ایک طرف تو بیرونی اداروں کے قرضوں کا ناقابل تحمل بوجھ تھا۔ دوسری طرف ملکی تنخواہ یافتہ طبقے کے باقی ماندہ واجبات کثیر مقدار میں واجب الادا تھے۔ اردگان نے دونوں طرح کی رقومات کی قسط وار ادائیگی شروع کی۔ جب یہ منتخب ہوا تو ملکی برآمدات 36 ملین ڈالر کے قریب تھیں اور غیر ملکی زرمبادلہ 321 ملین ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ ملک اقتصادی بحران کا شکار تھا اور عالمی سطح پر یہ قیاس آرائیاں جاری تھیں کہ عالمی اقتصادی بحران کی زد میں آکر ترکی اب دیوالیہ ہوا یا تب۔ خصوصاً سیکولر طبقہ اس انتظار میں تھا کہ یہ حکومت معاشی بحران کی زد میں آکر آج ناکام ہوئی یا کل۔

وزیراعظم بننے کے بعد اس نے اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ سب سے اہم یہ کہ بھاری بھرکم ملکی وزارتیں کم کرکے 22 تک محدود کردیں۔ بعد میں چند ایک کا اضافہ کرنے کے سبب اب کل وزارتیں 25 ہیں۔ اس کے بعد ملک میں مچی لوٹ مار کے راستے بند کرتا گیا۔ بدعنوانی پر قابو پانے میں اسے حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ اس کا سبب اس کا خلوص اور حسن تدبیر قرار دیا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ غیر ملکی دوروں میں تاجر برادری کو ساتھ لے جاتا تھا اور نئے نئے تجارتی معاہدے کرتا تھا۔ ان مخلصانہ اقدامات کے نتیجے میں چھ سال کی قلیل مدت میں ترکی کی برآمدات 2008ء میں 130 ملین ڈالر سے تجاوز کرگئیں۔ ترکی کی معاشی ترقی میں اس کی تعلیمی تحریک کا بہت بڑا دخل ہے۔ سلامتی کونسل کے غیر مستقل ممبران میں ترکی نے 151 ممالک سے ووٹ لیے۔ ان ممالک میں سے اکثریت میں سفارت کاری کے حوالے سے ترکی کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کا بڑا دخل تھا۔ خصوصا افریقی ممالک میں۔ شروع میں یہ تعلیمی ادارے خالص

تعلیمی مقاصد کے لیے بنائے گئے پھر انہی اداروں کے اندر ایسے لوگ مقرر کیے گئے جوان ممالک کے تاجر حضرات کو ترکی کے تاجر حضرات کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں مدد دیں۔ ان اداروں کا معیار بھی کافی بہتر ہے۔ ڈیزائن، فرنیچر وغیرہ ترکی سے جاتا ہے۔ یہ اسکول مرکزی شہروں میں بنائے گئے ہیں اور ان میں خصوصی طور پر طبقہ شرفاء کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس ملک کے ارباب حل وعقد کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے میں ان اداروں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ترکی کے سرمایہ دار خاندانوں اور افراد نے ان اداروں کے ذریعے اپنے لیے دنیا بھر میں راہیں کشادہ کرنے میں آسانی پیدا کی۔ ترکی کی تیز رفتار ترقی میں اس جماعت کے اسکولوں کے عمل دخل کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقتصادی اور تجارتی گروہوں کو پیسہ کمانے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ان کو عطیات کی بھی ترغیب دی۔ اس بنا پر پاکستان کے زلزلے میں دیگر کاموں کے ساتھ صدر مشرف کو چار ملین ڈالر کا چیک پیش کیا۔ قربانی کے موقع پر کئی ہزار گائے ذبح کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ اس سے ترکی کے لیے دنیا بھر میں خیر سگالی کے جذبات پھیل رہے اور فزوں سے فزوں تر ہو رہے ہیں۔ ترکی کو عالم اسلام میں روشناس کروانے، اسلامی ممالک سے قریب لانے اور اثر ورسوخ پیدا کرنے میں انہوں نے شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ سات آٹھ سال سے یہ ’’ترکش اولمپک‘‘ کروا رہے ہیں۔ سو ممالک سے پانچ سات سو منتخب بچے آئے ہوتے ہیں اور ترکی کے مختلف شہروں میں محفلیں اور مقابلے ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ بچے ترکی زبان میں تقریریں کرتے اور مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سے جو ماحول بنتا ہے اس سے دنیا کے مختلف ممالک میں ترکی قیادت کو اچھی ساکھ بنانے میں کامیابی ملی ہے۔

ترکی کے اسلام پسندوں کی یہ جد وجہد مستقبل میں کس ہدف کو عبور کرتی ہے؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، البتہ اتنی بات طے ہے کہ ان کو نا کام بنانے کے لیے جہاں

عالمی خفیہ طاقتیں (صیہونیت وصلیبیت) سرگرم ہیں، وہیں ہم وطن سیکولر ترک بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ دیکھتے ہیں اسلام پسندوں کا عزم وہمت اور تدبیر وحکمت کتنی کامیابیاں سمیٹتی ہے اوران کا راستہ روکنے والوں کی پھونکیں چراغ کی لو مدھم کرنے میں کتنی ترک تازیاں دکھاتی ہیں؟ ہمارے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ اور کس طبقے کا ساتھ دے رہے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہم خود اپنے ہاں کس ثقافت کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور کس کا دست و باز بن رہے ہیں؟ عظیم اور قابل فخر ماضی کی جستجو میں مگن قابلِ داد وتحسین لوگوں کا یا اپنے ہی منہ پر خاک اڑانے والے لائقِ توہین سر پھروں کا؟ کل گزشتہ ہمارے بڑوں نے ’’تحریک خلافت‘‘ چلائی تو ہم آج تک ترکوں کی نظر میں سُرخ رو ہیں۔ آج اگر ہم دامنِ خلافت میں پناہ لینے کی کوشش کرنے والوں کی پشت میں چھرا گھونپیں گے تو کل کا مؤرخ ہمیں کن الفاظ میں یاد کرے گا اور آنے والی نسل کن جذبات کے ساتھ ہمارا تذکرہ کرے گی؟ کل اُٹھنے والے اس سوال کا جواب اوراس مقدمے کا فیصلہ آج کے طرزِ عمل میں مضمر ہے۔

ہیملن سے گولن تک

''باسفورس یونیورسٹی'' جسے ترکی میں باغوزی (Bogazigi) یونیورسٹی کہتے ہیں۔ اس کا بانی ''کائرس ہیملن'' ایک پادری تھا۔ اس نے 1860ء میں استنبول میں ''رومیلی حصار'' نامی مشہور تاریخی قلعہ کے قریب اس مقام پر ''رابرٹ کالج'' کی بنیاد رکھی، جہاں سے سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا: ''سلطان فاتح نے یہاں سے قسطنطنیہ فتح کیا تھا۔ میں یہاں سے اسلامبول (استنبول) فتح کروں گا۔'' اس غرض کے لیے یعنی خلافت عثمانیہ کے زوال اور اس کے مرکز میں ''خلافت'' کی جگہ ''جمہوریت'' کے قیام کے لیے اس کے پاس منصوبہ تو تھا لیکن سرمایہ نہ تھا۔

منصوبہ تو وہی تھا جو اس طرح کے انگریز پادریوں اور ان کو راہِ عمل سمجھانے والے فری میسن کے ''دانا صہیونی بزرگوں'' نے ہندوستان میں بروئے کار لایا۔ یعنی سرسید جیسا کوئی خان صاحب تلاش کر کے جو سر بھی ہو، سید بھی ہو، خان بھی ہو، تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ اس کی غرض کچھ یوں ظاہر کی جائے کہ نئی نسل کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا جائے، ورنہ وہ زمانے سے پیچھے رہ جائے گی، لیکن اصل مقصد ایسی نسل تیار کرنا ہو جس کے دماغ کے ہر خلیے کو وہی سوجھتا ہو اور جسم کے ہر مسام میں وہی کچھ سمایا ہو جو گوروں کے دیسی غلام کے

شایان شان ہو۔ سرسید کو تو اپنے منصوبے کو مالی تعاون فراہم کرنے کے لیے جو بھی کھیلنا پڑا اور (دروغ برگردنِ راوی) ایک طوائف کے سامنے ٹھمکا بھی لگانا پڑا، لیکن کائرس ہیملن خوش نصیب تھا کہ اسے ''کرسٹوفر رابرٹ'' نامی یہودی سرمایہ دار مل گیا اور کیوں نہ ملتا کہ دونوں کا قارورہ ملتا تھا اور دونوں کی ڈور ایک ہی جگہ سے ہلائی جا رہی تھی۔ ہیملن نے اپنے سرپرست و کفیل کے نام پر اس تعلیمی ادارے کا نام جو اس نے استنبول فتح کرنے کے لیے درکار نفری تیار کرنے کے لیے قائم کیا، ''رابرٹ کالج'' رکھا۔ اس کالج کے مختلف مقامات پر مختلف کیمپس تھے۔ مرکزی دفتر، ''بیبک'' نامی مقام پر اس چرچ کے قریب تھا جہاں ہیملن بطور پادری تعینات تھا اور جہاں سے وہ استنبول کی جوابی فتح کی مہم پر نکلا تھا۔ راقم کو یہ جگہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر یہ جگہ دیکھنے دکھانے کا تماشا نہیں، عبرت کی جا ہے۔

برصغیر میں مغلیہ سلطنت اور ترکی میں عثمانی خلافت کے تار پود بکھیرنے اور یہاں صلیبی نظام رائج کرنے والے مہربان ایک تھے اور ان کا منصوبہ بھی ایک ہی تھا۔ البتہ طریق کار اور نتائج دونوں جگہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ اس فرق نے ہندوستان اور ترکی کی تاریخ پر دور رس اثرات مرتب کیے جو تاریخ کے ساتھ ساتھ بہتے لڑھکتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سے ہماری گلو خلاصی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک لکیر پیٹنے کے بجائے سانپ کو پھن سمیت قابو نہیں کریں گے۔ پادری کائرس ہیملن نے مرکزِ خلافت سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ ہمیں عیسائی بچوں کو اپنے مذہب اور روایات کے مطابق تعلیم دینے کے لیے ایک محدود پیمانے پر چرچ کے ساتھ ملحق تعلیمی ادارے کی ضرورت ہے۔ جبکہ اصل ہدف عیسائی بچوں کو تعلیم دینا تھا نہ اس ادارے کا دائرۂ کار محدود رکھنا تھا۔ اس کی غرض صرف اور صرف یہ تھی کہ ہونہار ترک نسل کو تعلیم کے نام پر ایسی تربیت دی جائے کہ وہ آگے چل کر ''نوجوان ترکوں'' پر مشتمل ایسے جدت پسند طبقے میں تبدیل ہو جائیں جو اپنے ہاتھوں قبائے

خلافت کو تار تار کر دیں۔ اس کے لیے حیلہ یہ کیا گیا کہ کچھ عرصے بعد تعلیمی ادارے کے مقاصد میں اضافہ کر کے مسلمان بچوں کو بھی داخلہ دینا منظور کر لیا گیا اور پھر یہاں طلعت بے اور مصطفیٰ کمال پاشا جیسے نوجوانوں کی مغربی ذہن سازی کی گئی، جنہوں نے آگے چل کر اپنی قوم کو جو کچھ دیا وہ تو سب کے سامنے ہے، البتہ اتنا ضرور کیا کہ قوم کو ترقی یافتہ جمہوری یورپ سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر خلافت کے خاتمے کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ ترکی تعلیمی اداروں سے سلطان فاتح کی جگہ مصطفیٰ کمال پیدا ہونے لگے اور خلافت کا متبرک، سایہ دار و ثمر بار شجرۂ طیبہ بالآخر مرجھا گیا۔

ہندوستان میں کالے بھجنگ انگریز اور ترکی میں سرخ گورے عثمانی انگریز تیار کرنے کی کارگاہ ایک ہی تھی۔ یعنی عصری تعلیمی ادارے، لیکن ترکی میں یہ ادارے سقوطِ خلافت سے پہلے کے ہیں اور ہندوستان میں مسلم سلطنت کے زوال کے بعد کے۔ اس لیے دونوں جگہ جو قوم تیار ہوئی، اس میں وہی فرق تھا جو آج کے ترکی کے تعلیم یافتہ اسلام پسندوں اور پاک و ہند کے تعلیم یافتہ اسلام پسندوں میں ہے۔ ترکی اس اعتبار سے خوش قسمت رہا کہ وہاں ہمارے خفیہ مہربانوں کو ایسے قابل لوگوں کی ضرورت تھی جو خلافت عثمانیہ کے مضبوط ستونوں میں دیمک کی طرح نقب لگا کر جگہ پیدا کر سکیں۔ اس لیے وہاں اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے بنائے گئے۔ خلافت عثمانیہ کے قائم کردہ تعلیمی نظام کے مقابلے کے لیے جو متوازی نظام درکار تھا، اس معیار تک پہنچنے کے لیے وہ نظام تعلیم متعارف کروایا گیا جو آج کے ترکی کو یورپ کے مدمقابل کھڑا ہونے میں مدد دے رہا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں انگریز نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء کو شہید کرنے اور تعلیمی اداروں پر وقف جائیدادیں ضبط کرنے اور سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی بنا لینے کے تقریباً بیس سال بعد 1875ء میں علی گڑھ کالج (بعد میں یونیورسٹی) کے ذریعے ایسے لوگ تیار کرنے شروع کیے جو اس کی وسیع

مقبوضہ مملکت میں نٹ بولٹ یا اسکرو کا کام دے سکیں۔ لہٰذا یہاں کبھی بھی وہ معیارِ تعلیم قائم نہ ہوسکا، جس کے خواب دیکھے گئے یا دکھائے گئے تھے اور جس کے لیے مسلمان اہلِ خیر نے دل کھول کر ''محمڈن کالج'' کو ترقی یافتہ نسل تیار کرنے کے لیے چندے دیے تھے۔ وہ تو خیر گزری کہ علمائے کرام نے حالات کا رُخ بھانپتے ہوئے جنگ آزادی کے دس سال بعد ہی 1866ء میں دیوبند میں وہ پودا لگا دیا جس نے کم از کم دینی تعلیم کو تو محفوظ رکھا ہے، ورنہ سر +سید+ خان صاحب نے جن جدید علوم کو درآمد کرنے کی خاطر لندن کا دورہ کیا تھا اور وہاں سے اعلیٰ عصری تعلیم کے لیے کالج کے قیام کا سندیسہ لائے تھے، اس نے مغلیہ سلطنت کی اعلیٰ دنیوی تعلیم کا کونڈا تو کیا ہی تھا، دینی تعلیم کا تو معاذ اللہ جنازہ ہی نکال چھوڑا تھا۔

دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی تحقیق کے لیے آپ ماضی کی روشن اور وسیع گزرگاہوں سے سفر کریں گے، تو آگے جا کر وہ اپنے کو تنگ یا بند ہوتی نظر آئیں گی۔ کچھ راز تو ایسے ہیں جو قفل بند بلکہ ''قفل در قفل بند'' ہوتے ہیں۔ اتاترک کے بارے میں مشہور ہے کہ جزیرہ سیلانک میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کے بائیوڈیٹا میں اس کی جائے پیدائش وسطی ترکی بتائی جاتی ہے۔ آپ تحقیق کرتے جائیں گے تو ہولوکاسٹ سے زیادہ بڑی کاسٹ کے ساتھ بھی ایسے موضوعات پر لگے بند تالوں کو نہ کھول پائیں گے۔ موجودہ ہسپانیہ کے دارالحکومت میڈرڈ کے عجائب گھر میں رکھے گئے آخری غدار مسلم حکمران ابوعبداللہ کے دو خطوط میں سے وہ خط تو آپ کو مل جائے گا جو وہ خفیہ طور پر فرڈی نینڈ اور ازابیلا کو لکھتا تھا (دوسرا وہ خط ہوتا تھا جو وہ اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں کو دکھاتا تھا) لیکن رابرٹ کالج جو آگے چل کر باسفورس یونیورسٹی میں تبدیل ہوا (بالکل ایسے جیسے علی گڑھ کا محمڈن کالج بعد میں یونیورسٹی تک ترقی کر گیا) کے کتب خانے میں آج بھی ایک شعبہ ایسا ہے جس میں کسی غیرملکی طالب علم کو تو چند شرائط کے تحت استفادے کی اجازت مل سکتی ہے، لیکن ترکی جاننے والے

طالب علم یا تحقیق کا داخلہ منع ہے۔

آج کل یہ ایک امریکی پروفیسر کی زیرِنگرانی ہے (کہنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ موصوف صہیونی برادری کی کس ڈگری سے تعلق رکھتے ہوں گے) عام آدمی کے لیے یہاں سے یونیورسٹی کے ابتدائی زمانے میں ہونے والے اجلاسوں کی روئیداد، ان میں منظور ہونے والی قراردادیں، مقالہ جات، تاریخی دستاویزات وغیرہ نکلوانا ناممکن ہے۔ اللہ کا کرم یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی طالب علم نے ’’ہسٹری آف سائنس‘‘ پر ایک شاندار مقالہ لکھا جو پروفیسر موصوف کو متاثر کرگیا۔ پروفیسر نے اپنی ساری زندگی ان رازوں کی حفاظت اور ’’مستحق افراد‘‘ کی ان سے استفادے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں رہائش رکھتے تھے۔ اس طالب علم کا ان کے ہاں آنا جانا شروع ہوگیا۔ اس نے انہیں یہ تحقیق کرکے دی کہ عین اس زمانے میں جب یونان میں منطق وفلسفہ کی طرح ریاضی وطب عروج پر تھے اور اعلیٰ پائے کی تصنیفات ہو رہی تھیں، تاریخ کے اس دور میں چین میں بھی طب وریاضی پر بہترین کام ہو رہا تھا اور اس دوران وہاں بھی ان علوم وفنون کی ایسی گرم بازی تھی کہ ہمیں ارسطو وسقراط اور بطلیموس وجالینوس کی چوٹ کی تحقیقات مل سکتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چین سے باہر کی دنیا ان سے متعارف نہیں ہوسکی۔ پروفیسر صاحب نے اس کا مقالہ دیکھا تو پھڑک گئے؟ اسے پیشکش کی، آکسفورڈ میں داخلہ کروا دیتا ہوں۔ میرا ایک خط کافی ہے۔ فیس کی مشکل نہ ویزے کا مسئلہ۔ اس نے کہا: ’’حضور والا! مجھے اپنے توشہ خاص میں سے چند کتابوں سے استفادے کی اجازت دے دیجیے۔‘‘ پروفیسر صاحب بڑے گھاگ تھے، لیکن آخرکار مان گئے۔ فرمایا: اجازت ہے، لیکن ایک تو کوئی چیز باہر نہیں لے جاسکتے۔ عکس لینے کی تو بالکل ہی اجازت نہیں ہے۔ دوسرے جو لکھو گے، مجھے ضرور دکھاؤ گے۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ طالب علم موصوف کی بن آئی۔ پادری ہیملن کے منصوبے، طریق

کار اور اس کے تیار کردہ ''ترک نوجوانوں'' کی تعلیم و تربیت کے اصول سب کچھ ہاتھ لگا۔ دیکھنا ہو تو دور کیوں جاتے ہیں، ہمارے ہاں کے فتح اللہ گولن صاحب کے قائم کردہ پاک ترک اسکول کو دیکھ لیجیے۔ وہی کام، وہی انداز، وہی مقاصد۔ ماشاء اللہ رتّی بھر فرق نہ پائیں گے۔

کیا یہ مقام عبرت نہیں ہے کہ خیر سے پاکستان کو مشرف بہ ترقی کرنے کے تمام ہتھیار وہی ہیں جس نے مشرف صاحب کے ممدوح اتاترک جیسے جدید تعلیم یافتہ نوجوان پیدا کیے تھے۔ ان نوجوانوں کو اسلام پر کیے جانے والے مستشرقین کے تمام اعتراضات تو ازبر ہوتے ہیں، لیکن خود ان نوجوانوں کے آبا و اجداد نے جو کارنامے کیے ہیں، ان سے یکسر لاتعلق اور بے خبر ہوتے ہیں۔ ترکی زبان کا رسم الخط بدل دیا گیا تھا۔ جس سے نئ ترک نسل اپنی شاندار ماضی سے یکسر کٹ گئی تھی۔ ہمارے ہاں یہ نوبت آنے میں دیر لگے گی، لیکن اینگلو اُردو کی ترویج اور رومن رسم الخط کی آوازیں آنا شروع ہوگئی ہیں۔ کائرس ہیملن اگر ترکی کا وہ فرعون تھا جسے کالج کی سوجھی تھی تو اس مقابلے کا آدمی لارڈ میکالے بھی بنی اسرائیل کی اسی نسل سے ہے جو بنی اسماعیل سے ''اسلام بول'' اور ''پاک بول'' چھیننا چاہتی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ وہ دن آئے جب رومیلی حصار کے قریب ''بیبک'' میں واقع چرچ سے شروع ہونے والی تحریک ہمارے ہاں بھی ''پاک ترک اسکول'' کی مدد سے وہ حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جو باسفورس یونیورسٹی کے تہہ خانے میں صہیونی پروفیسر کی تحویل میں منصوبہ بند شکل میں درج ہیں۔ ترکی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلام پسندوں نے تو ان سے چھٹکارا پانے کی سبیل چند عشروں میں نکال لی ہے، ہمارے یہاں کی پہلی تعلیم یافتہ نسل تو یہ کانٹے شاید صدیوں تک نہ چن سکے۔

آرگنا کون

دینی مدارس کا اصل کام داعی تیار کرنا ہے۔ اگر وہ حکومتی مشنری کے لیے کارآمد پرزے تیار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دنیوی تعلیم کے معیاری اسکول قائم کریں۔

☆

میں آپ کو سچ بتاتا ہوں ’’آرگنا کون‘‘ کی شدید خواہش ہے کوئی اسلام پسند یا محبّ وطن حکومتی کارپردازان میں شامل نہ ہونے پائے۔

☆

پاکستان میں آٹھ ادارے ہیں جو ملک چلاتے ہیں۔ جب ان کے لیے مقابلے کا امتحان ہوتا ہے تو ’’آرگنا کون‘‘ کی ترت پھرت دیکھنے والی ہوتی ہے۔

☆☆☆

’’آرگنا کون‘‘ کا لفظ جب پہلی بار سنا تو تعجب ہوا کے کس زبان سے ماخوذ ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ کو بھی ضرور تعجب ہوا ہوگا اور جاننا چاہیں گے اس کی ساخت پرداخت اور ہیئت اور ماہیت کیا ہے۔ ایشیائے کوچک......ترکی......میں سلجوقی یا عثمانی نظام تعلیم ہو یا برصغیر میں غزنوی و مغلیہ سلطنت کا قائم کردہ نظامِ تعلیم۔ دونوں اپنے اپنے مذہب و سماج اور تہذیب و ضروریات کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ اور اپنے زمانے کے عوام و ریاست ہر

دو کی علمی و سیاسی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے، حتیٰ کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر جیسے مدبّر بادشاہ، تاج محل جیسے عجوبۂ عالم کے معمار اور مسلم سپاہ کے سپہ سالارِ اعلیٰ تینوں نے ایک درسگاہ میں ایک جماعت میں تعلیم پائی تھی۔ سولھویں صدی میں جب مغرب میں مشین اور پہیّہ ایجاد ہوا۔ مسلمانوں سے لیے گئے علوم پر نظرِ ثانی اور تحقیق کے ذریعے نت نئے انکشافات کا زور ہوا تو عالمِ اسلام میں یہ پروپیگنڈا شروع کیا گیا کہ تعلیم تو وہ ہے جو مغرب کے مشنری اسکول دیتے ہیں۔ تربیت تو وہ ہے جو وہاں سکھلائی جاتی ہے۔ باقی سب تیل بیچنے اور بھاڑ جھونکنے کا دھندا ہے۔ اس نعرے کے ساتھ مغربی عیسائی مشنریز نے جب عالمِ اسلام پر دھاوا بولا تو ہر علاقے کے طبقۂ شرفاء کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قرآنِ کریم کے مطابق ”ملأ القوم“ اور ”مترفین“ یعنی کسی بھی قوم کے وڈیرے اور سرمایہ دار تو ویسے بھی ہر وقت باطل کی دعوت کو کندھا دینے اور حق کا تمسخر اڑانے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے مشنری اسکول پر ان کی بھاری بھر کم فیسوں کی ادائیگی کی شکل میں سرمایہ بھی لٹایا اور اپنی نوخیز نسل جس کے لیے حکمرانی کا پیدائشی حق ان کے ہاں محفوظ ہوتا ہے، کو بھی عیسائی اناؤں اور آیاؤں کی گود میں ڈال دیا۔ اور اس طرح سے ”آرگنا کون“ وجود میں آ گیا۔ اس عاجز کو ایک مرتبہ بلوچستان کے ایک دور دراز علاقے میں کچھ احباب نے کہا کہ فلاں سردار صاحب کے صاحبزادے مطالعے کے شوقین ہیں۔ اگر آپ ان کو کچھ وقت دیں تو ان کے کچھ سوالات کی تشفی ہو جائے۔ جب ان سے مجلس ہوئی تو یہ جان کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کہ اس علاقے میں جہاں بلوچ عوام کو پانی نہیں ملتا، سردار صاحب کے بچوں کی آیا انگریز میم صاحبہ تھیں اور خود کو ان نونہالوں کی ”خصوصی تربیت“ کے لیے یوں وقف کیے ہوئے تھیں جیسا کہ ہمارے ہاں کی روایتی بڑی بوڑھیاں اپنے پوتوں نواسوں کے لیے جیتی مرتی ہیں۔

”ملأ القوم“ (وڈیروں) کے نونہالوں اور ”مُترَفِین“ (سرمایہ داروں) کے

سرمائے کی بدولت مشنری تعلیمی نظام کو تقویت ملتی رہی۔ ان کے معیار کا شہرہ ہوتا رہا۔ مقامی نظامِ تعلیم صرف ان کے لیے ‘‘مخصوص’’ ہو گیا جو کسی ‘‘خصوصیت’’ سے عاری ہوں۔ حتّٰی کہ عثمانی سلاطین اور شاہی خاندان کے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کو ان منصوبہ بند اداروں میں تعلیم دلوانے کو اپنی مجبوری سمجھنا شروع کر دیا۔ کسی کو بھی خیال نہ آیا کہ اس معیار کے اسکول خود قائم کر لیتا۔ چنانچہ عثمانی سپوتوں اور ترکی کے طبقۂ شرفا کے نونہالوں کی تربیت مغربی طرز پر شروع ہو گئی۔ ‘‘امٹی ڈمٹی’’ یاد کرنا، ‘‘ٹوئنکل ٹوئنکل’’ پر جھومنا ‘‘بابا بلیک شپ’’ گانا فخر قرار پایا۔ ‘‘آرگنا کون’’ یعنی وہ خفیہ تنظیم جو مقتدر طبقہ کو حسبِ منشا ذہن دینا چاہتی تھی، کی امیدیں اس وقت بر آنا شروع ہوئیں، جب ان میں سے قابل اور ممتاز کارگردگی کے حامل نوجوانوں کو ‘‘اعلیٰ تعلیم’’ کے لیے فرانس اور جرمنی بھیجا جانا شروع کیا گیا۔ یہ طبقہ جب مغرب کی پرورش گاہوں میں تعلیم پا کر واپس لوٹا تو جہاں تعلّی اور افتخار کے احساس نے اسے رعونت ونخوت سے مالا مال کر دیا تھا، وہیں اس کے ذہن میں یہ سودا بھی سما گیا تھا کہ حکمرانی صرف اس کا حق ہے۔ بقیہ مخلوق ردّی یا کمّی ہے اور صرف اس کا حکم ماننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

پانچ سال بعد پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ علماء اور دین دار طبقہ جہاد میں پیش پیش رہا۔ شہادتوں کی کثرت کے اس لمحے اس سنتِ صدیقی کو زندہ نہ کیا گیا جس کا نمونہ مرتدین سے قتال کے دوران قرّاء حضرات کی بکثرت شہادت کی وجہ سے جناب صدیق اکبرؓ نے پیش کیا تھا۔ حالانکہ اس کی کوئی صریح نظیر ان کے سامنے نہ تھی۔ یعنی جب قاری حضرات بکثرت شہید ہونے لگے تو انہوں نے قرآن کریم کو جمع کر کے قیامت تک محفوظ کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ جنگِ عظیم اول میں جب اتحادی طاقتیں خلافت کے خاتمے کے لیے متحد ہو کر ٹوٹ پڑیں، تو علماء وطلبہ نے جہاد کی صدا لگائی اور سب سے پہلے خود اس پر لبیک کہا۔ اہلِ علم وصلاح بے دریغ شہادتیں دیتے رہے۔ المیہ یہ ہوا کہ پیچھے نئے مقتدر علماء تیار کرنے کی

کارگاہیں یعنی دینی مدارس بند کیے جاتے رہے۔ اہل علم وصلاح کی طرف سے معاشرے میں نفوذ کرنے اور مقتدر ہیئت کا حصہ بننے کی کوشش مفقود رہی۔ یہاں تک کہ ترک معاشرے سے دیندار عنصر بڑے پیمانے پر منظرِ عام سے ہٹتا گیا۔ ''آرگنا کون'' کے تیار کردہ افراد کو مناصبِ حکومت پر تسلط کے لیے کھلا میدان مل گیا اور وہ کہرام مچا کہ الامان والحفیظ!

غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ حدودِ خلافت میں مغربی ذہن کے لوگ تیار کرنے کے ساتھ سلاطین عثمانیہ کے حرم میں بے مثال حسن کی مالک یورپی دوشیزائیں بیویوں یا باندیوں کی شکل میں پہنچا دی گئیں۔ انہوں نے سلاطین عثمانیہ کی اگلی نسل کو حسبِ منشأ ایسی اعلیٰ تربیت دی کہ جن کی رگوں میں چھ سو سال سے خلافت کا خون دوڑ رہا تھا وہ خود اسے ختم کرنے پر تل گئے۔ مؤرخ لکھتا ہے:

''اب نپولین اور جوزفین کی رشتہ دار ''مارتھا'' سلطان کی والدہ کے مرتبہ پر فائز اور ان کا دور کا بھانجا اسلامی دنیا کا طاقتور ترین حکمران تھا۔ بڑا کھیل اپنے پہلے نصف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مارتھا اگلے 29 برس تک زندہ رہی۔ وہ مسلمانوں کے بادشاہ کی انتہائی بااثر فرانسیسی ماں تھی۔ اس کے بیٹے تیسویں عثمانی حکمران سلطان محمود دوم (1808ء تا 1839ء) کے درج ذیل احکامات اور اقدامات پر ایک طائرانہ نظر بتا سکتی ہے کہ پُر اثر نیکی رکھنے والی فرانسیسی روح مسلمانوں کے مفاد میں کیا کیا کام کر رہی تھی:

(1) سلطان محمود نے خود پگڑی ترک کر دی اور اس کے بجائے ترک ٹوپی اور یورپی لباس اپنا لیا۔ تمام عمال اور اہلکاروں کو تقلید کا حکم دے دیا۔ (2) اس نے ہیلمٹ وان مولٹکی کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور جرمن انسٹرکٹروں کی ایک بہت بڑی تعداد کی خدمات حاصل کیں۔ جنرل مولٹکی بعدازاں جرمن (پرشین) فیلڈ مارشل بنا۔ (3) یورپی نظام کے مطابق سول سروسز کا ڈھانچہ بنایا گیا۔ (4) طلبہ کی ایک بڑی تعداد پہلی

دفعہ یورپ بھجوائی گئی۔ (5) ایک شاہی فرمان کے مطابق بنیادی (عصری) تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اس فرمان کے تحت لوگوں کو بنیادی تعلیم کے بغیر کوئی ملازمت یا پیشہ اختیار کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ (6) ایک اخبار اور پہلے سرکاری پرنٹنگ پریس کا اجرا ہوا۔

بنیادی تعلیم اخبار اور پرنٹنگ پریس فی نفسہٖ بری چیز نہیں تھی لیکن اس اقدام کے پیچھے شر انگیزی کا محرک پایا جاتا تھا۔ یہی معاملہ اور طلبہ کو یورپ بھیجنے کے مقصد کے ساتھ تھا۔ ان دنوں یورپ میں یسوعیوں اور برادری کے ماتحت 640 کالجز اور 24 یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں۔ جدید تعلیم پر تقریباً ان کا غلبہ تھا تا کہ ''آرٹس اور سائنسز'' کو فروغ دیا جا سکے۔ جب ایک دفعہ سلاطینِ عثمانیہ کے جانشینوں پر مغرب کے دروازے کھل گئے تو پھر کبھی بند نہ ہو سکے، حالانکہ وقفے وقفے سے مخالف علماء بغاوت کرتے رہے، لیکن یہ بغاوتیں سختی سے کچل دی گئیں۔ اسلام میں اور اسلام کے نام پر اصلاح ضروری قرار پائی۔ یورپ سے واپس آنے والے طلبہ اپنے ساتھ محض مغربی نظریات لے کر نہ آئے، بلکہ وہ خلافت کا بابرکت نظام ختم کر کے ''ترقی یافتہ'' جمہوری نظام قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ اسلامی مدرسے ذاتی عطیات پر جیسے تیسے چل رہے تھے، جبکہ جدید تعلیم کے لیے پرائمری اور سیکنڈری اسکولز سرکاری سرپرستی میں چل رہے تھے۔ انہیں بے دریغ امداد دی جا رہی تھی۔ عدالتوں سے شرعی نظام ختم کرنے کے لیے یہ تدبیر کی گئی کہ پہلے پہل دیوانی عدالتوں میں یورپی نظام قائم کیا گیا۔ انہیں فوجداری عدالتوں سے الگ کر دیا گیا۔ مؤخر الذکر شریعت کے ماتحت تھیں۔ شرعی قاضیوں کا دائرہ کار محدود کرنے کے لیے اسکول آف ججز قائم کیا گیا اور شیخ الاسلام کے ذی وقار دفتر کو اس سے منسلک کر دیا گیا بلکہ یوں کہیے کہ تابع کر دیا گیا۔ اب بالاتر ہیئت مغربی تعلیم یافتہ ججوں کی تھی۔ عیسائی تمام سرکاری عہدوں اور انتظامیہ میں شامل تھے، یہاں تک کہ وزرا بھی تھے۔

سلطان محمود دوم کی عسکری تنظیم کو وسعت دیتے ہوئے مزید غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مزید ملٹری اسکولز قائم کیے گئے۔ عیسائی عسکری خدمات سے مستثنیٰ تھے لیکن اس استثنیٰ کے لیے وہ معمولی سا ٹیکس ادا کرتے اور یہ ٹیکس کون اکٹھا کرتا تھا؟ وہی یورپ پلٹ مصطفیٰ راشد...... یا پھر ہمیں کہنا چاہیے فری میسن۔ محمود دوم یکم جولائی 1839ء کو تپ دق اور تصلب جگر کے عوارض میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔ ہر وقت کی شراب نوشی نے اس کی موت کو تیزی سے قریب کر دیا تھا۔ اس کا جانشین اور بیٹا عبدالمجید اول (1839ء-1861ء) زیادہ وقت باسفورس والے محل میں گزارتا۔ اس کی ترجیح مغربی موسیقی سننا تھا۔ عثمانی سلطان محض مجسمے تھے کچھ اور نہیں۔ اس کے علاوہ اگر عوام کے سامنے ان کا کوئی پہلو تھا تو وہ انتہائی تاریک اور برا تھا۔ عوامی مفاد کے خلاف ہر فیصلہ سلطان، کٹھ پتلی سلطان کے ذریعے کرایا جاتا۔ مسلمانوں کی تباہی کا کام فری میسنری نہایت چابک دستی سے کر رہی تھی۔ ان کے تین مقاصد تھے:

(1) خلافت کو منتشر کرنا۔ ایسا مستقل جمہوری نظام قائم کرنا جو کبھی واپس اسلام یا شریعت کی طرف نہ جا سکے۔ (2) دیندار لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تضحیک کرنا، انہیں شہید کرنا اور ان کی جگہ مغربی تعلیم یافتہ افراد کو مقرر کرنا۔ (3) ملک پر زیادہ سے زیادہ غیر ملکی قرضوں کا بوجھ لادنا۔‘‘ (فری میسنز اور دجال، کامران رعد: 190)

گویا سو فیصد پاکستانی موجودہ صورتِ حال سے شاید صورتِ حال تھی۔ ’’آرگنا کون‘‘ ترکی اور اس جیسے دوسرے ممالک جہاں سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے تحریک اُٹھ سکتی ہے، میں بیسویں صدی کی ابتدا سے سرگرم ہے۔ اس کے وجود کا علم خود ترکی کے اسلام پسندوں کو نہ ہوتا اگر عدنان میندریس جیسے منتخب وزیر اعظم کو اسلامی شعائر کے لیے ہلکی سی چھوٹ دینے پر پھانسی نہ دے دی جاتی۔ اس لمحے حالات کو دقتِ نظر سے تاڑنے والوں کو علم

ہوا کہ حکومت کے پیچھے حکومت تو دراصل ''آرگنا کون'' کی ہے۔ جو منتخب حکومت کے سربراہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ عرب ممالک اور پاکستان میں بھی یہی ''آرگنا کون'' سرگرم ہے۔ دونوں جگہ طریقِ کار کا فرق ہے۔

عرب دنیا میں اس کی کوشش ہوتی ہے کہ شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم کے بہانے کچھ اس طرح کا ذہن دیا جائے کہ وہ بے تحاشا قدرتی دولت کے نت نئے مصارف سوچیں، لیکن مسلم اُمہ کے مفاد پر دھیلا دینے کو حماقت سمجھیں۔ ہمارے ہاں ان کی کوشش ہے کہ صاحبِ حیثیت عوام عیسائی مشنری اسکولوں کے دلدادہ ہوں۔ ان سے پڑھنے والے نوجوان ہی مناصبِ حکومت تک پہنچیں۔ ان کا آدھا مقابلہ تو دینی مدارس نے کیا۔ آدھا میدان خالی رہا۔ یعنی دینی مناصب کے لیے اہل افراد تیار کرنے کا کام جاری رہا۔ دنیوی مناصب پر اہل افراد پہنچانے کی محنت مفقود رہی۔ اس آدھے حصے میں ہمارا معرکہ یکطرفہ رہا۔ البتہ کچھ مخصوص مذہبی اور سیاسی فرقے یہی کام تن دہی سے کرتے رہے۔ دینی مدارس کا اصل کام داعی تیار کرنا ہے۔ اگر وہ حکومتی مشنری کے لیے کارآمد پرزے تیار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دنیوی تعلیم کے معیاری اسکول قائم کریں۔ ہر بڑا یا چھوٹا دینی ادارہ جہاں حافظ عالم بننے والوں کے لیے مدرسہ بنائے، وہیں بیوروکریسی میں جانے والوں کے لیے دینی مدرسے کے پائے کا اسکول بھی قائم کرے۔ آغا خان کے مقابلے کے نہ سہی، منہاج القرآن کے برابر ہی سہی! کرنے کا کام یہی ہے۔ دینی مدارس والے دنیوی اسکول نہیں بناتے تو پھر ان کو یہ کام دوسرے انداز میں کرنا چاہیے یعنی عام آدمی سے لے کر حکومتی مناصب پر فائز افراد کی اصلاح اور انہیں اچھا رخ دینا۔ اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بنانے کی کوشش کرنا۔ دنیوی کام کے لیے تو اسکول اور کالج کے گریجویٹس ہی تیار کیے جاسکتے ہیں۔ ایک عالم دین کس کس شعبے میں کون کون سے تارے توڑ سکتا ہے؟ تبلیغی جماعت اور خانقاہی حضرات نے

ٹھیلے والے سے لے کر وائس چانسلروں تک کی جس طرح زندگی بدلنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اس طرح کا اصلاحِ معاشرہ کا کام درسِ قرآن وحدیث اور اصلاحی بیانات ومحافلِ ذکر کے ذریعے اہلِ مدارس کو بھی کرنا چاہیے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ نہ اپنی طاقت محفوظ رہے گی نہ عوامی قیادت پر اثر انداز ہوا جا سکے گا۔

میں آپ کو سچ بتاتا ہوں ''آرگنا کون'' کی شدید خواہش ہے کوئی اسلام پسند یا محبّ وطن حکومتی کارپردازان میں شامل نہ ہونے پائے۔ پاکستان میں آٹھ ادارے ہیں جو ملک چلاتے ہیں۔ جب ان کے لیے مقابلے کا امتحان ہوتا ہے تو ''آرگنا کون'' کی ترت پھرت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ جبکہ ہمیں ان امتحانات کے گزرنے اور حکمرانوں کی ایک نئی کھیپ ہم پر مسلط ہونے کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ یہی خفیہ مقتدر قوتوں کی خواہش ہے اور اس حوالے سے ترک اسلام پسندوں جیسی تیقظ اور بیداری ہی اس کا توڑ کر سکتی ہے۔

داستاں اسلام پسندوں کی

ترکی کے اسلام پسندوں کی تازہ ترین بلکہ جاری وساری جدوجہد کا پس منظر، اُٹھان اور رکاوٹوں والے سفر کو فراصت وحکمت سے طے کرنا پوری دنیا کی معاصر مذہبی تحریکوں کے لیے مکالمے ومباحثے کا دلچسپ موضوع اور سبق آموز جگ بیتی ہے۔ احقر کو اپنی کم مائیگی کا اعتراف ہے۔ میرا علم وفہم ناقص اور مشاہدہ وتجزیہ ادھورا ہے۔ تحریکی کارکنوں کے ساتھ وقت بھی کم گزارنے کا موقع ملا۔ اس لیے جو کچھ سمجھ سکا، بلاکم وکاست عرض کیے دیتا ہوں اور معرکہ چونکہ جاری ہے۔ موضوع پہلودار ہے اور ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش رکھتا ہے۔ اس لیے احقر کو کسی رائے یا حاصل بحث پر اصرار نہیں ہے نہ ہی مبالغہ آمیزی یا داستان طرازی سے کام لوں گا۔ جو کچھ ہے، اصحاب فکر ونظر کی خدمت میں پیش ہے۔ جو حضرات ادب برائے ادب، یا ادب برائے زندگی کے قائل نہیں، ادب برائے بندگی کے قائل ہیں، وہ ان شاء اللہ اسے کسی نہ کسی حوالے سے مفید پائیں گے۔ باقی ''نقشِ ثانی'' ہمیشہ ''نقشِ اول'' سے بہتر ہی ہوتا ہے اور ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والے تو موجود ہی رہتے ہیں۔ اس لیے راقم کے لیے بھی مشاہدے اور سوچ کی تشکیل وتعمیر کی راہیں کھلی ہیں اور

میرے محترم کرم فرما قارئین اور اہلِ علم کی طرف سے بھی آراء وتجاویز کا وافر موقع ہے۔

گفتگو کی ابتدا پچھلی صدی کی پانچویں دہائی سے کرتے ہیں جب سقوطِ خلافت کے سانحے کو تقریباً 25 سال گزر چکے تھے اور اس حادثے سے سہمی قوم کی رگوں میں دوڑتی اسلام پسندی کسمسا کر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اس زمانے میں یعنی تقریباً نصف صدی چند دہائیاں پہلے ترکی سیاسی لحاظ سے تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا: (1) بایاں بازو۔ (2) دایاں بازو۔ (3) قوم پرست۔

ترکی میں چونکہ تقریباً چھ سو سال تک عظیم ترین اسلامی خلافت سایہ فگن رہی تھی اور ترکی قوم کے خون میں عثمانی خلفاء کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے قوم پرست ترک بھی لاشعوری طور پر اسلام کو پسند کرتے تھے، بلکہ جبر وقہر کے دور میں یہی قوم پرست تھے جنہوں نے لادین یا بے دین سیکولر طبقے کو برابر کی چوٹ دی۔ کمیونسٹوں کو جاندار مقابلہ دینے والے یہی قوم پرست تھے۔ یہ طبقہ اس زمانے میں لاشعوری طور پر بات ’’اللہ اکبر‘‘ سے شروع کرتا اور اس کی گفتگو میں ’’یا اللہ، بسم اللہ، اللہ اکبر‘‘ وغیرہ تکیہ کلام کے طور پر بے اختیار جاری رہتا تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں بھی بے ساختہ یہ الفاظ منہ سے نکلتے تھے۔ دیندار حضرات تو لڑائی جھگڑوں کے بغیر ویسے ہی زبان کو ان الفاظ سے تر رکھتے تھے۔ ترکی کی مخصوص تاریخ کا اثر تھا کہ قوم پرست ترک ہونا مسلمان ترک ہونے کے برابر تھا۔ ترک تہذیب کی حفاظت خود بخود اسلام کی حفاظت شمار ہوتی تھی۔ اس لیے قوم پرستوں کو آج بھی فخر ہے کہ مشکل دنوں میں لادین طبقے کا راستہ روکنے کا کام ہم نے کیا۔ ترکی معاشرے میں قوم پرستوں اور بائیں بازو والوں کے درمیان ہر سطح پر چپقلش چلتی رہتی تھی۔ ان دونوں گروپوں میں تصادم کے دوران اسلام پسند کالج و یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے ہاسٹل بنانے میں خاموشی سے سرگرم رہے۔ ان طالباتی اقامت گاہوں میں انہوں نے طلبہ کی نظریاتی تربیت کرتے کرتے رفتہ

رفتہ سیاسی محاذ سنبھال لیا۔ اہلِ طریقت نے اصلاحی کام کا بیڑا اٹھایا۔ ترکی میں کل حنفی اور کل کے کل نقشبندی ہیں۔ مسلک و مشرب میں وہاں دوسرا کوئی رنگ نہیں ہے، لہٰذا بہت سی ان مجبوریوں، معذوریوں اور علتوں و رکاوٹوں سے قدرت نے انہیں نجات دی ہوئی تھی۔ جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں۔ ایک بزرگ شیخ سکندر پاشا کی جماعت کا دنیوی تعلیم کے طلبہ میں بہت زیادہ کام اور اثرات تھے۔ آغا اسماعیل والے حضرت شیخ محمود آفندی صاحب کا یونیورسٹی کے طلبہ سے زیادہ عوام میں کام تھا۔ اس لیے دو طرفہ محنت بغیر کسی کو متوجہ کیے جاری تھی اور اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

شروع شروع میں مشکل حالات کی بنا پر کئی سالوں تک اس طرح کی سیاسی کشمکش چلی کہ سیاست کے مطلع پر کوئی دیندار نام سامنے نہیں آیا۔ سیاسی پلیٹ فارم پر چار قسم کی کل پارٹیاں آئیں۔ نام کسی کا پابندی کی وجہ سے اسلامی نہیں تھا، البتہ ان کی عرفیت بہر حال یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ یعنی (1) دایاں بازو: دیندار۔ (2) قوم پرست۔ (3) عام درمیانے لوگ اور بایاں بازو: مذہب دشمن۔

دیندار اور قوم پرستوں کی ذیلی جماعتیں نہ بنیں۔ باقی میں کچھ نہ کچھ اختلافات اور ذیلی جماعتیں تھیں۔ بعد میں دیندار حضرات میں تقسیم ہوگئی۔ قوم پرست دین دار الگ ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض دیندار لوگ سمجھتے تھے اسلام پسندوں کا رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان آگے نہیں آسکتا۔ جیت بھی گیا تو قومی اور بین الاقوامی طاقتیں اسے آگے نہیں آنے دیں گی۔ اس لیے وہ ووٹ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے دوسری پارٹیوں کو ووٹ دیتے تھے۔ مثلاً: ترگت اوزال اور سلیمان ڈیمرل کی پارٹی کو۔ یہ لوگ اربکان سے قریب تھے، لیکن وہ سمجھتے تھے کہ سیکولر معاشرے میں اربکان آگے نہیں جاسکتا۔ فوج، بیوروکریسی وغیرہ اربکان کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ سب کو پتا تھا کہ کھلم کھلا نمازی تھا۔ ترگت اوزال لبرل

بمعنی ’’ترکی لبرل‘‘ سمجھے جاتے تھے۔ اربکان کی پارٹی کا نام ’’ملی نظام پارٹی‘‘ تھی۔ پاکستان میں ہوتی تو شریعہ نظام پارٹی نام ہوتا۔ ملت کا لفظ ترک ملت سے نہیں، ملتِ ابراہیم سے لیا گیا تھا۔ جب اس پر خاص سطح تک پہنچنے کے بعد پابندی لگی تو دوبارہ نام رکھا: ’’ملی سلامت پارٹی‘‘۔ اس میں بھی ’’ملت‘‘ سے مراد ’’ابراہیمی ملت‘‘ یعنی شریعت میں جڑی ہوئی ملت تھا: ’’مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیمَ‘‘۔ نہ کہ کوئی اور ملت۔ کیسا خوبصورت جگر کو ٹھنڈک دینے والا ذو معنی استنباط ہے جس کی استعارتی پیروی کی جاسکتی ہے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اربکان کی پارٹی کی سیاسی اُٹھان دیکھ کر اس پر پابندی لگادی گئی۔ انہوں نے کچھ دن سانس لے کر ’’ملّی سلامت پارٹی‘‘ کے نئے نام سے کام شروع کردیا۔ ظاہری نام یہ تھا۔ پسِ پشت فلسفہ کا نام رکھا ’’ملی گروش‘‘ یعنی ’’ملی سوچ‘‘ قومی رائے، قومی طرز و طریقہ، قومی طرز فکر کا پلیٹ فارم۔ ’’ملت‘‘ سے مراد ابراہیمی ملت تھا نہ کہ ترکی ملت۔ 80ء کی دہائی میں ’’ملی سلامت پارٹی‘‘ نے بڑے بڑے جلسے کیے۔ 74ء میں اس نے ایسی حیثیت حاصل کرلی کہ اس کے بغیر حکومت نہیں بن سکتی تھی۔ یہ ’’کی پارٹی‘‘ قرار پائی۔ اس فیصلہ کن مرحلے پر اس نے وسعت نظر اور سیاسی تدبیر کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی بائیں بازو کے ساتھ یعنی ’’بلند اجوت‘‘ کی پارٹی کے ساتھ اشتراک کرتے ہوئے حکومت بنائی۔ جس سے ان کی بصیرت و فراست پر لوگوں کو اعتماد آیا اور ان سے کترانے والے اسلام پسند بھی ان کے معقول سیاسی رویّے کو دیکھ کر قریب آنے لگے۔ ان کا اعتماد قائم ہونا شروع ہوا کہ ان لوگوں کی حمایت کی گئی تو ضائع نہیں جائے گی اور ان میں اتنی سیاسی سوجھ بوجھ ہے کہ سر بیٹھی سیکولر فوج اور مخالف سمت میں کھڑے سیاست دانوں سے نمٹنے یا نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی دوران ترک قوم کا ایک امتحان ہوا جس میں اسلام پسند اپنے بائیں بازو کے حلیفوں کو ساتھ لے کے پورے اترے ہوا یوں کہ سمندری پڑوسی قبرص کا

مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ترکی نے فوج بھیج کر اسے یونان سے آزاد کروایا۔ انگلینڈ نے یونان کی مدد کی۔ ترکی نے قبرص کی مدد کی۔ اس دوران دینداروں اور قوم پرستوں کا اتحاد مضبوطی سے قائم رہا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے رہے۔ اسلام پسندوں نے اپنی اعتدال پسندی اور دور اندیشی سے ثابت کیا کہ ملکی مقاصد کے حصول کے لیے دشمن سے بھی اشتراک کیا جا سکتا ہے۔

ترکی میں انقلاب کی کہانی

اس دوران اسلام پسندوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی کہ عوام کی عرصۂ دراز سے ممنوع ضرورت ''دینی اسکول'' زوروشور سے نئے سرے سے بنائے گئے۔ اسلام پسند سیاست دانوں کا اصل کام طلبہ میں تھا۔ اس لیے وہ تعلیمی اداروں کے قیام پر بھرپور توجہ دیتے تھے۔ اتاترک کے دور میں جب مدارس اور خانقاہوں کو ختم کیا گیا تو قحط الرجال کے سبب ایک وقت وہ آ گیا کہ بائیں بازو کی جلاد صفت حکومت کو سوچنا پڑ گیا کہ لوگوں کے مردے نہلانے والے بھی ختم ہو گئے۔ یہ صورتِ حال کسی انتشار کا سبب نہ بن جائے۔ عوام کی اتنی دینی ضرورت تو پوری کرو کہ آواز نہ اٹھے اور معاملہ قابو سے باہر نہ ہو۔ اس خاطر چند ایک جگہوں پر ''امام وخطیب اسکول'' کھولے گئے اور ان میں پڑھنے والے بچوں کے لیے ''الٰہیات فیکلٹی'' کھولنے کا قانون بنایا گیا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان جب ستر کی دھائی میں سیکولروں سے اشتراک کر کے نائب وزیراعظم بن گئے تو انھوں نے اس قانون کا سہارا لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ''امام وخطیب اسکول'' کھولے۔ عوام نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اپنے محلوں اور شہروں میں پیسے اکٹھے کر کے اسکول بنائے اور حکومت سے اساتذہ لے کر حکومت کو اسکول وقف کیے۔ یعنی خود بنا کر حکومت کے سپرد کیے۔ اس طرح امام وخطیب

اسکول بڑھنا شروع ہو گئے۔ تعلیم کے ساتھ عوامی فلاحی کام بھی تیز رفتاری سے ہو رہے تھے اور عوام کا تاثر بہت بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن مخالفین بھی خاموش نہ بیٹھے تھے۔ وہ مسلسل ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ان کی تیز رفتار ترکی سے خائف خفیہ قوتوں نے اوچھا وار کیا۔ 12 ستمبر 1980ء کو مارشل لا لگا دیا تھا اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔

مارشل لا حکومت نے 82 میں نیا آئین بنایا۔ عام انتخابات کے بجائے ریفرنڈم کروایا گیا اور کنعان ایورن سات سال کے لیے صدر بن گئے۔ خفیہ بادشاہ گر قوتوں کے تعاون کی بنا پر صدر صاحب بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے 83ء میں انتخابات نئے سرے سے کروائے۔ سابقہ بڑی جماعتیں بدستور پابندی کا شکار تھیں۔ لہذا اس مرتبہ نئی جماعتیں بنائی گئیں۔ ان میں تین قابل ذکر ہیں۔ دو ریٹائرڈ جرنیلوں نے۔ تیسری ترگت اوزال نے بنائی۔ اسلام پسند بظاہر اکثریت سے کامیاب نہ ہو سکے تھے، لیکن قدرت کو ایک دوسری شکل میں ان کی مدد منظور تھی۔ الیکشن کے آخری دنوں صدر کنعان نے کھل کر ایک ریٹائرڈ جرنیل کی بنائی ہوئی جماعت کی حمایت کر دی۔ جو سراسر غیر قانونی عمل تھا۔ اس کے باوجود عوام نے بھاری اکثریت سے ’’ترگت اوزال‘‘ کو جتایا۔ اوزال نقشبندی سلسلے سے منسلک گھرانے کا فرد تھا۔ شیخ سکندر پاشا صاحب کی صوفی جماعت سے خفیہ طور سے متعلق تھا۔ اوزال نے انتخابات تو جیت لیے، لیکن اسے اندیشہ تھا کہ سیکولر صدر اسے حکومت نہ بنانے دے۔ بعد میں اوزال نے خود بھی اس کا اقرار کیا کہ اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ مجھے حکومت سازی کی دعوت نہ دی جائے، لیکن وہ نہایت جرأت مندانہ طریقے سے صدر کنعان کے پاس کاغذ جمع کروانے چلا گیا۔ صدر صاحب نے اسے حکومت سازی کا اجازت نامہ جاری کر دیا۔ بعد میں جب 90ء کی دہائی میں کنعان ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ ٹی وی نے اس کا

انٹرویو لیا۔ اس نے کھلے الفاظ میں بتایا کہ ترگت اوزال نقشبندی تھا، لیکن مجھے پتا نہ تھا، ورنہ میں کبھی اس کو حکومت بنانے کی اجازت نہ دیتا۔ بالآخر تین سال کے بعد 83ء میں ملک مارشل لا سے نکل کر دوبارہ سیاسی نہج پر آ گیا۔ پارلیمنٹ منتخب تھی، لیکن صدر مارشل لا کے تحت کرائے گئے ریفرنڈم کے ذریعے صدر بنا تھا۔

سیاسی کے وزیر اعظم بننے کے باوجود سابقہ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی۔ کچھ عرصے بعد سیاست دانوں کو آزادی ملی تو نئی جماعتیں بنانی شروع کر دیں۔ پروفیسر نجم الدین اربکان ''رفاہ پارٹی'' بنا کر پھر میدان میں آ گئے۔ اگلے انتخابات 88ء میں ہوئے۔ ترگت کی جماعت پھر کامیاب ہوئی۔ اربکان کو صرف ڈھائی فیصد ووٹ ملے، لیکن نقشبندیت کے روحانی سلسلے کی محنت دنگ سے اپنا کام کر رہی تھی۔ ترگت ازوال نقشبندی بزرگوں کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے 83ء سے 88ء تک تیزی سے ترقیاتی کام کروائے۔ اس سے پہلے 60ء میں عدنان میندریس کے زمانے میں کام ہوئے تھے، لیکن اس کو خفیہ سیکولر طاقتوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ یہ الگ سے ایک داستان ہے۔ مواصلات کے شعبے میں نمایاں کام کیے گئے۔ محکمہ تعلیم میں اصلاحات کے حوالے سے قابل ذکر پیش رفت ہوئی۔ بدعنوانی کا تناسب کم ہونا شروع ہوا۔ اس کے علاوہ وزارت خارجہ کی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ سلطنت عثمانیہ کے آخری دور سے ترک عرب تعلقات میں رخنے آ گئے تھے۔ دوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ سقوطِ خلافت کے بعد پہلی مرتبہ صدر اوزال نے عربوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عرب ممالک کے دورے کیے۔ نئے سرے سے بھائی چارہ کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ دشمنی کی دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ کچھ ہی عرصے میں عرب ممالک کے سیاح آنے شروع ہوئے۔ عوامی سطح پر تعلقات بڑھے۔ حج اور عمرہ کے لیے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ گرمیوں میں ہزاروں عرب حضرات آنے شروع

ہوئے۔ انہوں نے یہاں صحت افزا مقامات میں گھر خریدنے شروع کر دیے۔ تناؤ کی فضا میں کمی آگئی۔ عرب ممالک سے تعلیم کے لیے ترکی آنے والوں میں اضافہ ہوا۔

ہمسایہ عرب ممالک شام، عراق کے ساتھ ترکی کی تجارت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اقتصادی حالات میں دوطرفہ بہتری آئی۔ کنعان ایورن ریٹائر ہوا تو ترگت اوزال نیا صدر بن گیا۔ یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے صدر بننے کے بعد اسلام پسند ''رفاہ پارٹی'' کے پانچ اہم ارکان اس کو مبارک باد دینے گئے (تو یہ تاریخی الفاظ کہے: ''ترکی کی صدارت پر پہلا ایسا شخص آیا ہے، جس کا ماتھا سجدے کے لیے زمین پر جھکتا ہے۔ ہم اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔'' حالات اپنے ڈگر پر چلتے رہے۔ ترگت کی جماعت کا نام ''انا وطن پارٹی'' تھا۔ ''انا'' بمعنی ماں، یعنی ''مدر لینڈ پارٹی''۔ کچھ عرصے بعد یہ پارٹی اندر سے کمزور ہونا شروع ہوگئی؛ کیونکہ اس نے لبرل اور دیندار دو متضاد گروپ کو جمع کیا تھا۔ جب جماعت کے اندرونی انتخابات ہوئے تو ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ ترگت اوزال کچھ عرصے بعد انتقال کر گیا۔ [اس رمضان یعنی 2012ء کے رمضان کے دوران ترگت اوزال کی نعش نکال کر پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس کی موت مشکوک تھی، لیکن آج تک اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا تھا] موجودہ حکومت نے اس کو اپنا فرض سمجھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی جماعت سے دیندار لوگ نکل کر اربکان کی طرف جانا شروع ہوگئے۔ وہ اس جماعت کے لبرل افراد سے متنفر ہوگئے تھے اور اربکان پر ان کا اعتماد قائم ہوگیا تھا۔ اگلے سیاسی معرکے میں اسلام پسندوں نے خاص نشستیں جیتیں، لیکن وہ اسمبلی کی کل نشستوں میں سے دس فیصد سے کم تھیں۔ ترکی کا قانون یہ تھا کہ دس فیصد سے کم ووٹ حاصل کرنے والی جماعت اسمبلی میں نہ جاسکتی تھی۔ اربکان اسی بنا پر اسمبلی میں نہ جاسکے۔ لوگوں کا خیال تھا اربکان کی پارٹی کو ووٹ دینے کا فائدہ نہیں۔ اس کو فوجی آگے نہیں دیں

گئے۔ اب ترگت کی پارٹی ٹوٹنے لگی۔ اربکان کی پارٹی میں اضافہ شروع ہوگیا۔ لیکن اربکان 92ء کے انتخابات ہار گئے۔

یہ اسلام پسندوں کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا کہ وہ کسی طرح عوام کو بھی مطمئن کریں اور سیکولر فوج کی طرف سے پیدا کی گئی رکاوٹیں بھی ختم کریں۔ اس دوران اس پارٹی میں جواں سال، دوراندیش اور ذہین شخصیت ابھر رہی تھی جو بچپن سے سیاست کی اس کشمکش کو دیکھتے ہوئے پروان چڑھی تھی۔ یہ نوخیز کارکن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر استنبول میں جماعت کا قائد بن چکا تھا۔ اس نے ایک خاص ترتیب سے شہر میں سیاسی محنت کی جس میں خاص طور پر طالب علموں اور عورتوں کے شعبے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پورے استنبول شہر میں ہر تحصیل، ہر محلّہ، ہر گلی تک دعوت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ فلاحی کاموں کا جال بچھایا گیا۔ مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ سرگرمیاں تشکیل دی گئیں۔ اس میں مرد و زن کا اختلاط نہ تھا۔ خواتین میں خواتین ہی جا کر دعوت دیتی تھیں۔ عورتوں نے پانچ سال گھر گھر محنت کی۔ بے شمار کارکنوں کا اضافہ کیا۔ مردوں نے مردوں میں کام کیا۔ کام کی ترتیب اور شکل پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو تبلیغی جماعت کے کام سے مشابہت رکھتی تھی، حالانکہ یہ خالص سیاسی کام تھا۔ گھر گھر دروازہ کھٹکھٹا کر دعوت دی جاتی تھی۔ انہوں نے ''فلاحی ریاست'' کے قیام کے لیے فلاحی سیاست کے فلسفے پر عمل کیا۔ وہ اس طرح کہ جب ہر گھر تک انہیں رسائی حاصل ہوئی، معلومات حاصل ہوئیں: کہاں یتیم ہے؟ کہاں بوڑھا ہے؟ اور کہاں بیوہ؟ جماعت کی مالی حالت کمزور ہونے کے باوجود مقامی کارکن اپنی جیب سے پیسے خرچ کرکے جماعت کے نام سے ضرورت مند افراد کی خدمت کرتے تھے صرف اجر کے حصول کے لیے۔ اس کام کو مجاہدانہ روح کے ساتھ کیا گیا۔ جہاد کا لفظ استعمال کیے بغیر۔ اسی دوران جوانوں کے نظریاتی تربیتی کیمپ جاری رہے۔ ذہنی تربیت اسلامی نظر و فکر،

اسلامک کا وژن دینا خاص کام تھا۔

سارا کام اللہ کی خوشنودی کے لیے سرگرمی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بظاہر سیاسی تحریک تھی، فلاحی خدمات تھیں، حقیقت میں اسلامی رنگ تھا، اسلام کا نام لیے بغیر۔ ان لوگوں کے ہاتھوں حسن البناء، سید قطب، حضرت علی میاں، مولانا یوسف کاندھلوی اور دوسرے بزرگوں کی کتابیں نظر آتی تھیں۔ طیب اردگان جو اب تک جماعت کا ذمہ دار تھا، اس نے اس دوران اتنی محنت کی کہ غیر مشروع مقامات میں جا کر بھی دعوت دیتا تھا۔ مثلاً: اپنی جماعت کے کارکنوں کے ساتھ قحبہ خانے جا پہنچتا تھا۔ یہ زمانے کی ٹھکرائی ہوئی مظلوم خواتین پہلے پہل یہ سمجھتی تھیں کہ یہ اسلام پسند سخت گیر لوگ ہیں۔ یہ لوگ برسر اقتدار آئے تو سب سے پہلے ہمیں بے روزگار یا پابند سلاسل کریں گے۔ اس نے ان کو بتایا کہ میں آپ کے لیے باعزت متبادل روزگار اور باعزت زندگی کا انتظام کروں گا۔ پھر آپ کی مرضی ہے کس زندگی کو اختیار کرتی ہیں؟ اس کی گفتگو ایسی دل پذیر تھی کہ وہ خواتین جو ذرا دیر پہلے اس سے خائف تھیں، اب سب نے مل کر اسے اپنے دکھڑے سنانا شروع کیے کہ ہمارے ساتھ یہاں یہ ظلم ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے۔ ہم نے سب کچھ گنوا دیا، پھر بھی کچھ نہ ملا۔ نہ ہمارا کوئی حال ہے نہ مستقبل۔ اس نے انہیں تسلی دی، دلاسہ دیا۔ اور سمجھایا کہ اسلام کا دامن ہر گنہگار کی پناہ گاہ ہے۔ الغرض ان خواتین کو یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ یہ لوگ آگے آئے تو ہمیں ذلت کی اس زندگی سے بچا لیں گے۔ یہ ان کے لیے امید کا ستارہ بن گیا۔

یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ 94ء میں بلدیاتی انتخابات کا زمانہ آ گیا۔ اسلامی رفاہ پارٹی کا نوجوان قائد طیب اردگان ناظم شہر کے عہدے کے لیے کھڑا ہوا۔ پانچ اہم جماعتوں میں سے یہ سب سے چھوٹی جماعت کا سب سے جواں سال امیدوار تھا۔ دوسرے جغادری سیاست دان، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے اور سرمایہ دار تھے۔ یہ نوخیز امیدوار اپنی مہم کے

لیے مالی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔ لیکن عوامی سطح پر چار سال میں گلی محلے میں جو کام یہ کر چکا تھا، اس سے جوانوں کا ایسا گروہ کھڑا ہو گیا تھا جو اسے استنبول کا ناظم بنانا پورے استنبول کے باسیوں کے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔ یہ عام نوجوان تھے۔ معروف معنوں میں دین دار نہ تھے۔ دین دار طبقہ تو ویسے ہی اس کی جیت کو اسلام کی ضرورت اور جہاد کا حصہ سمجھتا تھا۔ وہ روحانی جذبے سے اس کی مہم چلاتے تھے، لیکن فریقِ مخالف بھی خاموش نہ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اوچھے ہتھکنڈے آزما رہا تھا۔ انتخابی مہم کے شروع زمانے میں اس مقبول نوجوان رہنما کے مرکزی دفتر میں ایک فون آیا۔ اس میں دھمکی دی گئی آج دن فلاں سے فلاں وقت آپ کی بجلی اور ٹیلی فون بند رہیں گے۔ یہ کہتے ہی ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ ٹیلی فون سننے والے نے سمجھداری سے کام لیا۔ اس نے تشویش اور اضطراب پھیلانے سے بچنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو فون کیا ایک فون آیا ہے کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک فون بند رہے گا۔ اگر آپ کا مجھ سے رابطہ نہ ہو تو آپ پریشان نہ ہوں۔ عین وقت پر بجلی منقطع ہو گئی۔ فون بے جان ہو گیا اور پھر بتائے گئے وقت پر بجلی بحال ہو گئی اور رابطہ جڑ گیا۔ اب دوبارہ نامعلوم فون آیا: ''سمجھ لو! اس ملک میں جو ہم کہتے ہیں، وہی ہوتا ہے۔ تمہارا نونہال اُمیدوار اور تم کس کھیت کے مولی ہو؟ اپنے اُمیدوار کو کہو دستبردار ہو جائے ورنہ اگلا قدم خونی ہوگا۔'' اُردگان سے رابطہ ہوا۔ کیا کریں؟ اس نے کہا: کسی دھمکی کا اثر نہ لو۔ اپنا کام جاری رکھو، لیکن وہی ہوا۔ ان کے علاقائی دفتر میں بم پھینکا گیا۔ ایک ساتھی شہید اور کئی زخمی ہو گئے۔ دوبارہ فون آیا: ''اب بھی اپنے نوجوان قائد سے کہو باز آ جائے۔ ورنہ ہمیں اس کی تمام تقریبات کا وقت اور جگہ معلوم ہے۔ آج کی تقریبات میں وہ نمٹا دیا جائے گا۔'' دوستوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ سب اکٹھے ہوئے۔

اردگان نے کہا: ''آج تقریب وقت پر نہ ہوئی تو بہت غلط پیغام ملے گا۔'' خوب تیاری

ہوئی۔ اسلحے کے ساتھ گئے۔ گاڑی کی چھت پر چڑھ کر تقریر کرنی تھی۔ یہ باز نہیں آیا۔ عین اسی مقام پر تقریر کی اور گاڑی کی چھت پر کھڑے ہو کر کی۔ یعنی بظاہر سب سے کمزور پارٹی کے چار سالہ کام کو دیکھ کر دوست دشمن سب سمجھ چکے تھے کہ آیندہ انتخابات میں اس کی فتح یقینی ہے۔ بہر حال کشمکش جاری رہی۔ ایک طرف دھمکیاں اور ناجائز حربے تھے۔ دوسری طرف جرات اور عوام سے سچی ہمدردی تھی۔ نتیجے نے دوستوں کی امیدوں اور دشمنوں کے خدشات کی تصدیق کر دی۔ اردگان سب کو شکست دے کر استنبول کا ناظم بن گیا۔ اس بلدیاتی الیکشن میں نہ صرف شہر استنبول بلکہ دیگر علاقوں کے ناظم بھی اس کی جماعت سے منتخب ہوئے۔ یہ اربکان کی سیاسی لیڈر شپ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ کامیاب ہونے کے بعد یہ اس کامیابی کی خوشی کو برقرار رکھنے میں جُت گئے۔ جتنے شہروں میں ان کے بلدیاتی امیدوار کامیاب ہوئے، ان میں اتنا زبردست کام ہوا جو ترکی کی بلدیاتی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عوام نے سمجھ لیا کہ یہ کام کے لوگ ہیں۔

انسانی خدمت ان کا ہدف ہے۔ ان کو اسلام کی خاطر نہ سہی، ملکی ترقی کی خاطر ووٹ دیا جا سکتا ہے۔ اب قومی انتخابات میں بھی اسلام پسندوں کی جیت کے آثار دکھائی دینے لگے، لیکن دوسری طرف سے بھی پروپیگنڈے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی 70 سال تک دینداروں کے خلاف پروپیگنڈا چلتا رہا تھا۔ لادین قوتیں عوام کو کہتی تھیں دیندار آدمی اگر حکومت بنائے گا تو سب کی زندگی کو تباہ کر دے گا۔ عورتوں کو برقعے پہنا دے گا۔ مردوں کو چار چار شادیاں کروا دے گا۔ یہ منفی پروپیگنڈا اب عوام پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ترکی یورپی یونین میں جانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ ترک عوام کو ڈراتے تھے کہ یہ اسلامی جماعت یورپ مخالف ہے۔ لہٰذا جو لوگ ملک کو یورپ کی طرح مادی ترقی کی طرف لے جانا چاہتے تھے، وہ انہیں ووٹ دینے سے گھبرانے لگے۔ اس طرح کے کانٹے چننے میں اربکان اور اس کے ساتھیوں کی بہت سی قوت اور توانائی صرف ہوئی۔

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

1996ء میں ترکی کی قومی اسمبلی کے الیکشن میں پہلی دفعہ اربکان کی پارٹی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ اس نے 550 میں سے 158 سیٹیں حاصل کیں۔ سب سے بڑی پارٹی ہونے کے باوجود یہ تعداد حکومت بنانے کے لیے ناکافی تھی۔ اسمبلی میں 5 پارٹیاں تھیں جو دس فیصد نمایندگی تو حاصل کر چکی تھیں، لیکن کسی کے پاس بھی ایسی اکثریت نہ تھی کہ حکومت بنا سکے۔ اس وقت کے صدر سلیمان ڈیمرل نے اسلامی پارٹی کو حکومت بنانے کے لیے کاغذ دے دیے، لیکن جب یہ کاغذ لے کر بقیہ چار پارٹیوں کے پاس گیا تو سب نے ایک ایک کر کے اس کے ساتھ اتحاد کرنے سے انکار کر دیا۔ اصول کے مطابق صدر نے تین موقع دینے تھے۔ دوسری باری میں بھی کوئی پارٹی سیاسی مفاہمت اور پیش کشوں کے باوجود نہ مانی۔ تیسرے اور آخری راؤنڈ میں تانسو چلر نامی خاتون نے اس کے ساتھ اتحاد کو قبول کر لیا۔ دونوں کے اشتراک سے 96ء میں مشترک حکومت بن گئی۔ تانسو چلر سے کیے گئے معاہدات میں سے ایک شق یہ تھی کہ پہلے ایک سال اربکان وزیر اعظم رہے گا۔ دو سال تانسو چلر رہے گی۔ پھر آخری دو سال پھر اربکان وزیر اعظم ہوگا۔ اس زمانے میں پانچ سال کے لیے انتخاب ہوا کرتا تھا۔ اب چار سال کر دیا گیا ہے۔

اربکان کے پہلے ایک سال کے نصف اول میں ترکی میں عجیب وغریب تیز رفتار ترقیاتی تبدیلیاں ہوئیں۔ دوسرے مہینے ہی سرکاری ملازمین کی تنخواہیں 50 فیصد سے لے کر 65 فیصد تک بڑھادیں۔ بدعنوانی ختم کرنے کے لیے بہت سے مؤثر اقدامات کیے گئے۔ سیکولروں کے ہاتھ فسخ ہونے والا چہرہ رفتہ رفتہ نکھرنے لگا۔ وزیرِ خارجہ عبداللہ گل کو بنایا گیا۔ اُردگان اس وقت استنبول کا میئر تھا، لیکن یہ حکومت ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ مخالف قوتوں نے مل کر ''جن میں سب سے اہم فوج تھی، اربکان سے کہیں زیادہ تانسو چلر کو ناکام بنایا، کیونکہ نجم الدین اربکان ایک نظریاتی سیاسی پارٹی تھی۔ اس کے بندوں کو توڑنا یا بدلنا سیکولروں کے بس کا کام نہ تھا۔ تانسو چلر کے لوگ اتنے مضبوط نظریاتی نہ تھے۔ مخالف عناصر نے اس کے بہت سے ارکان کو لالچ سے خرید کر یا دھمکی سے خوفزدہ کر کے پارٹی سے مستعفی کروا کر دوسری لبرل پارٹی ''خانہ وطن پارٹی'' کا حصہ بنواتے گئے۔ پیچھے باقی رہنے والی نشستیں اتنی نہ تھیں کہ محترمہ کی کوئی مضبوط حیثیت باقی رہے۔ سال پورا ہونے پر اربکان نے اپنے وعدے کے مطابق تانسو چلر کو باری دینی تھی۔ اربکان نے کہا میں آپ کو وعدے کے مطابق حکومت دینے پر تیار ہوں، لیکن میری معلومات کے مطابق خفیہ مقتدر قوتیں تمہاری حکومت نہیں بننے دیں گی۔ صدر تمہیں موقع ہی نہ دے گا۔ منتقلی اقتدار کا طریقہ یہ تھا کہ اربکان استعفیٰ دے گا۔ تانسو چلر کاغذات جمع کروائے گی، پھر اربکان کی طرف سے اسے منتخب کروایا جائے گا۔ تانسو چلر نے صدر سلیمان ڈیرل سے ملاقات کی جو اس خاتون کی سیاسی پارٹی کا بانی اور سابقہ سربراہ تھا۔ تانسو کو امید تھی کہ یہ مجھ سے بے مروتی نہیں کرے گا۔ صدر ڈیرل نے محترمہ کو تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کو موقع دیں گے۔ چلر صاحبہ نے واپس آ کر اربکان سے کہا میں صدر سے ملاقات کر کے آئی ہوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ تمہیں موقع ضرور دیا جائے گا، لیکن سیاست کے سینے میں دردمند دل اور منہ میں

سچی زبان نہیں ہوتی۔ یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔

اسی دوران انقرہ کے ایک علاقے میں رفاہ پارٹی کے نوجوانوں نے فلسطین اور بیت المقدس پر ایک سٹیج شو کیا۔ اس کو بہانہ بنا کر اسی دن صبح فوج نے ٹینک سڑکوں پر لے آئے۔ یہ فوجیوں کی طرف سے مارشل لا کا اشارہ تھا۔ ملک بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس وقت فوج میں تین طرح کے خیالات کے حامل عناصر تھے: (1) پہلا اربکان کو پھانسی دے کر مارشل لا لگانا چاہتا تھا، لیکن اس سے ملک میں خون ریزی کا خطرہ تھا۔ (2) دوسرا اسے صرف سیاست سے ہٹانا چاہتا تھا کہ مارشل لا سے ملک کی ساکھ عالمی سطح پر خراب نہ ہو۔ (3) تیسرا گروہ اسے معمول کی معتدل سیاسی حیثیت کے ساتھ سیاست میں شامل رہنے کی اجازت کا قائل تھا۔ اس کشمکش کے دوران رفاہ پارٹی میں یہ بات چل رہی تھی کہ اگر فوج سے مخاصمت جاری رہی تو ملک کو بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا مدبرانہ مفاہمت کی ضرورت اور اس کا خاکہ زیرِ بحث رہتا تھا۔ اتنے میں تانسو چلر کے اطمینان اور تسلی کے بعد اربکان نے استعفی دے دیا۔ جب استعفی صدر ڈیمرل کے پاس پہنچا تو اس نے اسے قبول کرنے کے بعد تانسو چلر کو موقع دینے کے بجائے مسعود یلماز کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس دوران تانسو چلر صاحبہ کے وزیر اور ارکان خرید لیے گئے تھے یا خوفزدہ کر دیے گئے تھے۔ وہ سب مسعود یلماز کے پاس چلے گئے۔ محترمہ تانسو چلر منہ دیکھتی رہ گئیں۔ مسعود یلماز نے بقیہ دو پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت بنالی۔ یہ تمام کاروائی فوجی جرنیلوں کی سرپرستی اور نگرانی میں انجام دی گئی۔

اس کا قرینہ یہ ہے کہ فوج نے اس موقع پر حکمران اسلامی پارٹی کو رجعت پسندی کے طعنے دیے۔ میڈیا کے سامنے اس الزام کو بار بار دہرایا گیا۔ ملک میں ماشل لا تو نہیں لگا، لیکن خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور دیندار لوگوں پر سختی کا زمانہ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ اربکان پارٹی

کے معاونین حضرات کی معیشت کو بھی فوج کی طرف سے نشانہ بنایا گیا۔ فوج کے اندر ایک شدت پسند سیکولر گروپ بن گیا۔ اس وقت بحریہ کے چیف نے ایک گروپ بنایا جس کا نام ''بائے چاشماں گروپ''یعنی ''ویسٹرن ورکنگ گروپ'' رکھا گیا۔ اس کو مقصد دیندار لوگوں کے پھیلنے کے اسباب کا جائزہ لینا اور اس کا سدّ باب کر کے انہیں معاشرے میں مزید نفوذ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ انہوں نے نئ ''منتخب'' حکومت سے ایسے قوانین منظور کروائے جن سے مدد لے کر تمام اسلامی تحریکوں کو کمزور یا ختم کیا جا سکے۔ یہ سیاہ دور 96ء سے شروع ہوتا ہے۔

''امام خطیب اسکول''، جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی اور جن کے ذریعے تعلیم یافتہ محبّ دین و وطن نسل پیدا ہو رہی تھی، ان کی طرف سے تمام قانونی تقاضوں پر پورا اترنے کے باوجود ان میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے دو طرح کے قانون بنائے گئے: (2) ترکی میں پرائمری تک تعلیم لازمی تھی۔ پرائمری کے بعد بچوں کو حفظ کے لیے دینی مدرسے میں بھیجا جاتا تھا۔ حفظ القرآن پر قدغن لگانے کے لیے لازمی تعلیم کی مدت بڑھا کر آٹھویں تک کر دی گئی۔ امام خطیب سکولوں کی تعلیم میں پرائمری سے مڈل تک کے تین سال میں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ بھی ''فروعِ تعلیم'' کے لیے وضع کیے گئے اس نئے قانون سے از حد متاثر ہو گئی۔ (1) یہ کہا گیا کہ چونکہ خاص مقصد (دینی تعلیم) کے لیے بنائے گئے اسکول ہیں اس لیے ان میں پڑھنے والا بچہ صرف اپنے شعبے یعنی ''الٰہیات فیکلٹی'' میں پڑھ سکتا ہے۔ سیاست، وکالت، انجینئر نگ، اور طب وغیرہ کے راستے اس پر بند کر دیے گئے۔ ایسا طالب علم ڈاکٹر، انجینئر، وکیل وغیرہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس قانون سے امام خطیب سکولوں کی تعداد محدود ہوتی چلی گئی۔ یہ کام کیے تو اسمبلی نے، لیکن اسے اسمبلی میں منظور سیکولر فوج نے کروایا۔ دوسری طرف فوج نے دیندار حضرات پر فوج میں داخلے یا ترقی کے دروازے بند کرنے کے

لیے مزید سختی شروع کردی۔ جو کبھی چھپ کبھی نماز پڑھتا ہوا دیکھ لیا جاتا اسے کسی نہ کسی طرح بہانہ نما اسباب پیدا کر کے معزول کر دیا جاتا۔ اربکان کی جماعت کی مدد کرنے والے تاجر حضرات کو ہراساں کیا گیا۔ سرکاری اداروں اور بالخصوص فوج کی کینٹینوں میں جو چیزیں دیندار صنعتی اداروں کی رکھی جاتی تھیں، ان پر پابندی لگا دی گئی۔ خود اربکان اور اس کی پارٹی کے بہت سارے افراد پر آئین کی خلاف ورزی کے عنوان سے طرح طرح کے مقدمات بنا دیے گئے۔ آخر کار اس اسلامی پارٹی پر اگلے پانچ سال کے لیے پابندی لگا کر اس پر سیاست کے دروازے بند کر دیے گئے۔

اربکان اور اس کے چار ساتھیوں پر سیاست شجرِ ممنوعہ قرار دے دی گئی۔ اس سے چند مہینے پہلے استنبول کے مقبول نوجوان میئر رجب طیب اردگان پر ایک تقریر کے دوران کچھ اشعار پڑھنے پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں اسے کئی مہینے کی سزا سنا دی گئی۔ اس سزا کی کم از کم مدت جان بوجھ کر اتنی مقرر کی گئی کہ ترکی قانون کے مطابق آیندہ ایسا شخص سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ جبکہ اس کا جرم اتنا نہ تھا بلکہ شعر پڑھنا سرے سے جرم کے زمرے میں آتا ہی نہ تھا۔ مخالفین نے اپنے طور پر اس کی سیاسی زندگی کا خاتمہ کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نئی حکومت جو مسعود یلماز کی سربراہی میں بنائی گئی تھی، زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اس کی حکومت عارضی طور پر آزمائشی طور پر بنانے دی گئی تھی۔ اس نے نہ چلنا تھا نہ وہ چل سکتی تھی۔ اس لئے خرید لئے گئے وزیروں نے برسرِ اقتدار آتے ہی مول چکانا شروع کیا۔ ایسی لوٹ مار مچی کہ اس دوران بہت سے بینک دیوالیہ ہو گئے۔ وہ تاجر حضرات جن کا پیسہ تانسو چلر کے وزیر خریدنے میں لگوایا گیا تھا۔ انہوں نے سعود یلماز کی حکومت قائم کروانے کے بعد جی بھر کر خراج وصول کیا۔ ہر طرف بدعنوانی کا ایسا راج ہوا کہ ملک کا دیوالیہ نکل گیا۔

اگلے انتخابات میں ایک عمر رسیدہ رہنما بلند ایجوت جیت گیا۔ اس کی پارٹی DSP کے نام سے تھی۔ ''ڈیموکریٹک سول پارٹی''۔ پارلیمان میں نشستوں کی صورتِ حال یہ تھی کہ اس کی پارٹی سب سے زیادہ ووٹ لینے کے باوجود اکیلی تنہا حکومت نہ بنا سکتی تھی۔ اس نے ملی حرکت پارٹی اور قوم پرستوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم پرست حکومت میں آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران اربکان کی پارٹی کے بچے کھچے ارکان نے ''فضیلت پارٹی'' بنائی اور اپنا قائد ''رجائی قوتان'' کو منتخب کیا۔ یہ الیکشن میں چوتھے نمبر پر رہی۔ نیا صدر بلند ایجوت معمر اور مریض تھا۔ بعض مرتبہ کئی کئی ہفتے ہسپتال میں داخل رہتا تھا۔

اقتدار میں آنے کے بعد

بدعنوانی اور نظام میں مرکزیت نہ ہونے کے سبب ترکی میں اقتصادی بحران بڑھتا ہی چلا گیا۔ ملک اقتصادی لحاظ سے سنگین بحران کا شکار ہوتا چلا گیا۔ بحرانوں کے اس دور میں عبداللہ گل اور طیب اردگان گروپ نے پارٹی کے عملی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پچھلی تین دہائیوں سے پارٹی جس طرح چلتی رہی ہے، اس کے مطابق وہ ہمیشہ پابندی کا شکار ہوتی رہے گی۔ جب ہم اسلام کے نام یا اسلامی تعارف کے ساتھ میدان میں آتے ہیں تو کامیابی کے قریب پہنچتے ہی جابرانہ نظام ہم پر کسی نہ کسی بہانے پابندی لگا دیتا ہے۔ جماعت کی ہیئت قائمہ کچھ اس طور پر ہونی چاہیے کہ آیندہ اس پر پابندی نہ لگے، لیکن قیادت کے منصب پر فائز ''رجائی قوتان'' کسی بھی طرح کی تبدیلی کو مناسب نہ سمجھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی تبدیلی مؤسسین جماعت کے مقرر کردہ راستے سے انحراف ہوگا۔

خود پروفیسر نجم الدین اربکان ان حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کے روادار یا متحمل نہ تھے۔ کوئی فریق دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔ ہر ایک اپنے موقف پر دلائل لکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ

دونوں گروپوں کا نام اصلاح پسند اور قدامت پسند جیسے حوالوں سے مشہور ہوتا گیا۔ عبداللہ گل نے پارٹی کے سالانہ انتخابات میں رجائی قوتان کے خلاف صدارت کے عہدے کے لیے مقابلہ کیا۔ تبدیلی کے حامی یہ انقلابی مزاج کے نوجوان امیدوار کافی تعداد میں ووٹ حاصل کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہوسکے۔ اس نے رجائی قوتان کی کامیابی کے بعد اسے مبارکباد دیتے ہوئے پھول پیش کیے۔ اس عرصے میں طیب اردگان متنازع فیصلے کے تحت دی گئی سزا پوری کر کے باہر آ گیا تھا۔ ان سب نے خاموش تحریک شروع کی، لیکن وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ جب جیت کے امکانات پیدا ہونے لگے تو اسلام پسندوں کی یہ جماعت ایک مرتبہ پھر خفیہ بادشاہ گر قوتوں کے عتاب کا شکار ہوگئی۔ پانچویں مرتبہ اس پارٹی پر جواب ’’فضیلت پارٹی‘‘ کے نام سے کام کر رہی تھی، پابندی لگا دی گئی۔ وجہ وہی اسلامی نام اور اسلامی کام قرار پایا۔ اس سے ’’اصلاح پسند‘‘ نوجوانوں کی رائے کو تقویت ملی کہ نام کوئی بھی ہو اور کام کا عنوان کوئی بھی ہو، جب حقیقت اسلام کے تابع ہے تو ظاہری تعارف بدلنے میں حرج نہیں۔ ماضی کی پہچان سے چمٹے رہ کر دشمن کو موقع دینا دانش مندی نہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے طرز پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ نئی جماعت بناتے وقت قدامت پسند اور اصلاح پسند الگ الگ ہوگئے۔ قدامت پسند ’’سعادت پارٹی‘‘ کے روایتی مروّجہ نام سے اور جدت پسند ’’انصاف اور ترقی‘‘ (جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی) کے بدلے ہوئے نئے نام سے نئی جماعت کے تحت کام کرنے لگے۔

دوسری جماعت کا ترکی نام ’’عدالت اور کھال کھنی پارٹی‘‘ ہے۔ کھال کھنی بمعنی ترقی۔ اس کے ترکی الفاظ کا مخفف ’’آک‘‘ ہے جس کا معنی سفید یا بے داغ چیز کے ہوتے ہیں۔ اصلاح پسندوں کی اس نوخیز جماعت کا پہلا صدر عبداللہ گل کو بنایا گیا۔ جماعت میں طیب اردگان جیسا مقبول قائد موجود تھا، لیکن اس پر تاحال سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد

تھی۔ لہٰذا اس کے پرانے دوست اور ساتھی عبداللہ گل کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نومولود جماعت کو وجود میں آئے ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ نئے الیکشن سر پر آ گئے۔ دونوں رہنماؤں نے مل کر زبردست انتخابی مہم چلائی۔ عوام میں اس موقع پر حیرت انگیز جوش وخروش دیکھنے میں آیا۔ اس سے پہلے اسلام پسندان پانچ ناموں سے کام کرتے رہے تھے: ملی پارٹی، ملی سلامت پارٹی، رفاہ پارٹی، فضیلت پارٹی، سعادت پارٹی۔ پانچوں سے اسلام پسندی کی خوشبو آتی تھی۔ اس لیے سیکولر طبقہ چوکنا ہو کر انہیں ناکام کرنے کے ہتھکنڈے آزمانا شروع کر دیتا تھا۔ کارکنوں کو مہم چلانے میں بھی طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ نئے نام میں چونکہ عوام کو انصاف فراہم کرنے اور ترقی سے نوازنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اس لیے لادین طبقے کے پروپیگنڈے پر روک لگ گئی تھی، جبکہ تحریکی کارکنوں کو وسیع میدان ہاتھ آ گیا تھا۔ دین دار عوام دل سے اسلام پسندوں کو آگے آتے دیکھنا چاہتے تھے۔ لادین طبقہ بھی سیکولر حکمرانوں کی بدعنوانی اور لوٹ مار کی وجہ سے تنگ تھا۔ وہ بھی طبقاتی انصاف اور ملکی ترقی کا دل سے خواہاں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی قریب آنے لگا اور نوجوان اسلام پسندوں کی نئی حکمت عملی انتہائی کامیاب رہی جن کا چھٹا نام ''انصاف اور ترقی پارٹی'' تھا۔

نام بدل کر سامنے آنے والی نوزائیدہ جماعت نئے انتخابات میں 35 فیصد ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جبکہ سعادت پارٹی کے ووٹوں کا تناسب 5 فیصد کے لگ بھگ تھا۔ لہٰذا وہ اسمبلی میں بھی نہ آ سکی۔ اسمبلی میں صرف دو پارٹیاں آنے میں کامیاب ہوئیں۔ ''آک پارٹی'' اور ''سی۔ ایچ۔ پی'' یہ اتاترک کی بنائی ہوئی ''جمہوریت خلق پارٹی'' تھی۔ جس نے تقریباً بیس فیصد کے لگ بھگ ووٹ حاصل کیے تھے۔ چونکہ اسمبلی میں صرف دو جماعتیں آنے میں کامیاب ہوسکی تھیں، اس لیے تمام وزارتیں انہی دونوں کے درمیان تقسیم ہوئیں۔ عبداللہ گل جس کی جماعتی نشستوں کی تعداد 362 تھی۔ بھاری

اکثریت کے ساتھ اسمبلی میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے وزیراعظم بنادیا گیا۔ اس کا دیرینہ رفیق طیب اردگان دس مہینے کی سزا پانے کے سبب تا حال سیاست کے منظرنامے سے غائب کردیے جانے کی سازش کا شکار تھا۔ یہ سازش آئین کی ایک شق کا سہارا لے کر کی گئی تھی۔ عبداللہ گل نے وزیراعظم بننے کے بعد اسمبلی میں اس شق میں ایسی ترمیم کروائی جس کے سبب طیب اردگان پر لگی پابندی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد اس جماعت کے ایک رکن نے استعفیٰ دے کر طیب اردگان کے لیے ضمنی انتخابات کے ذریعے اسمبلی میں آنے کی راہ ہموار کردی۔ اس رکن کی نشست اس علاقے میں تھی جہاں پر تقریر کرنے پر اردگان کو نااہل قرار دیا گیا تھا۔ اردگان اسی شہر اور حلقے سے جیت کر اسمبلی کا رکن بنا جس میں شعر پڑھنے پر اس پر پابندی لگائی گئی تھی۔ اس شہر کا نام ''ماردن'' ہے۔ یہ اردگان کا سسرالی شہر بھی ہے۔ اس کے بعد کی تاریخِ وفا و حکمت بھی یادگار رہے گی۔ اب کی مرتبہ عبداللہ گل نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ نوجوان قائد رجب طیب اردگان تمام رکاوٹیں عبور کرتا ہوا وزیر اعظم کے منصب تک جا پہنچا۔ مخالفین منہ تکتے رہ گئے اور اسلام پسندوں کی حکمت و فراست نے نئی تاریخ رقم کردی۔ یہ تھی نوجوان اصلاح پسندوں کی تاریخی کامیابی کی روداد۔

اقتدار میں آنے کے بعد ان کا رویہ سب تمام دوسری جماعتوں کے ساتھ ایسا حکیمانہ تھا کہ چند ایک متعصب مخالفین کے علاوہ سب ان کے حامی ہوگئے۔ اس نے اپنی جماعت کو روایتی نظریاتی اسلامی جماعت کے تعارف اور عنوان کے بجائے رفاہی سیاسی پارٹی کی شکل دی تاکہ غیر اسلام پسندوں کو بھی اس میں آنے یا کم از کم اتحاد کرنے کا موقع ملے اور ان پر پابندی بھی نہ لگے۔ اس سے قبل ان پر مختلف نام اپنانے کے باوجود پانچ مرتبہ پابندی لگ چکی تھی۔ چنانچہ تانسو چلر سعود یلماز وغیرہ حتیٰ کہ اس کی سب سے زیادہ مخالف پارٹی سی۔ایچ۔پی کا جنرل سیکرٹری بھی ان کے اندازِ سیاست سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ آ کر شامل ہوگیا۔

توقع تھی کہ یہ آتے ہی حجاب جیسی چیزوں کو لازم قرار دیں گے اور مخالفین کو ہلچل مچانے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے آتے ہی کہا: ”ہمیں لوگوں نے ملکی مسائل کو حل کرنے، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے اور قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ یعنی ہم نے وہ کام کرنے ہیں جن کے لیے ہمیں امیر بنایا گیا ہے۔“ سید القوم خادمہم“ حجاب وغیرہ گھر کے مسائل ہیں۔ انہیں عوام خود حل کریں۔ خود میں اپنی بچیوں کو ہمارے ملک میں حجاب پر پابندی کے سبب باہر ملک پڑھوانے پر مجبور ہوں۔ ہم تو ملک کی دولت ملک پر خرچ کرنے کے لیے کام کریں گے۔ [اس میں سابقہ لادین حکمرانوں پر تنقید تھی کہ انہوں نے مذہبی شعائر کو ختم کرنے میں سارا زور صرف کیا۔ ملک کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اُلٹا اتنا لوٹا اور بدعنوانی کو اتنا فروغ دیا کہ ترکی بدعنوان ترین ممالک میں شمار ہونے لگا۔ امانت و دیانت کے ساتھ ملک کی خدمات اور مظلوم کی دہلیز تک انصاف پہنچانا عین اسلام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اسلامی احکام کو کوئی خاص مذہبی عنوان دیے بغیر کام کریں۔]

اس وقت صورتِ حال دھماکہ خیز تھی۔ اردگان کی حکمت عملی کو نہ سمجھنے والے موافق و مخالف دونوں متضاد تبصرے کر رہے تھے۔ موافق دیندار پارٹی جس کا نام ”سعادت پارٹی“ تھا اور وہ روایتی سیاست پر اڑے رہنے کی وجہ سے اس مرتبہ پیچھے رہ گئی تھی، اس نے کہا: ”دیکھا بیرون طاقتوں کا ایجنٹ ہے۔ اس نے اسی لیے پارٹی توڑی ہے۔“ مخالف بائیں بازو نے کہا: ”یہ چولہ بدل رہا ہے۔ کھیل کھیل رہا ہے۔ عنقریب شریعت کے نفاذ کا اعلان کرے گا۔“ البتہ عوام کی خاموش اکثریت نے اس کی حکمت و فراست کی داد دینے پر اکتفا کیا۔ جو اس کے مزاج اور طریق کار کو سمجھ رہی تھی۔

مقبول اور نوجوان اصلاح پسند وزیر اعظم نے الیکشن جیتنے کے بعد صحافیوں اور تاجروں کی

جماعت ساتھ لے کر یورپ کا تیز رفتار طوفانی دورہ شروع کیا۔ اس کا مدّعٰی یہ تھا کہ ہم یورپی یونین کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو ہمیں یورپ کے معیار کی مصنوعات تیار کرنا اور صنعت وحرفت میں خود کو اس کے برابر ثابت کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں یہ اتنا مسلسل اور تیز رفتار کام کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ چلنے والے تھک ہار کر باری باری فرائض انجام دیتے تھے، لیکن یہ مسلسل جاگ کر کام کرتا تھا۔ اس کا سونا جاگنا، کھانا پینا اور نہانا دھونا سب جہاز میں انجام پاتا تھا۔ اس دورے کا خاص ہدف ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ جس میں اسے خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ یہ وزیر اعظم بننے سے پہلے ہی متعدد یورپی ملکوں کا دورہ کر چکا تھا۔ اور اس کے اقتصادی ماہرین کئی ممالک کے ساتھ تجارتی امکانات کی تفصیل مہیا کرنے اور یورپی اشتراک کے ساتھ تجارت کے فروغ کی بنیاد رکھنے اور بندراہیں کھولنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ترکی میں معدنیات کی کمی ہے۔ کچھ حاصل کرنا ہے تو اپنے زور بازو سے کرنا پڑے گا۔ یہ حقیقت نو منتخب حکمران کے پیش نظر تھی۔ اس لیے اس نے ملکی وبین الاقوامی تجارت کے فروغ کو ہدف قرار دیا ہوا تھا۔ جس میں اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

وزیر اعظم بننے کے بعد اس نے آئی ایم ایف کے قرضے اتارنے شروع کیے۔ آئی ایم ایف کے قرضے کبھی نہ اترنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ ورلڈ بینک اور اس ادارے کا طریق کار ہی نہ چھڑائے جانے والے چنگل میں لینے کا ہوتا ہے۔ نوزائیدہ حکومت پر ایک طرف تو بیرونی اداروں کے قرضوں کا ناقابل تحمل بوجھ تھا۔ دوسری طرف ملکی تنخواہ یافتہ طبقے کے باقی ماندہ واجبات کثیر مقدار میں واجب الادا تھے۔ اندرونی اور بیرونی قرضے کسی بھی نوزائیدہ حکومت کے لیے کٹھن امتحان ثابت ہوتے ہیں۔ اردگان نے دونوں طرح کی رقومات کی قسط وار ادائیگی شروع کی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ قومی آمدنی کو بڑھایا جائے ۔ خود انحصاری پر مشتمل اقدامات دلجمعی سے کیے جائیں اور بدعنوانی پر قابو پا کر قومی آمدنی کو

دیانت و انصاف کے ساتھ اس کے اصل مصرف پر لگایا جائے۔ جب یہ منتخب ہوا تو ملکی برآمدات 36 ملین ڈالر کے قریب تھیں اور غیر ملکی زرمبادلہ 321.2 ملین ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ ملک اقتصادی بحران کا شکار تھا اور عالمی سطح پر یہ قیاس آرائیاں جاری تھیں کہ عالمی اقتصادی بحران کی زد میں آ کر ترکی اب دیوالیہ ہوا یا تب۔ خصوصاً سیکولر طبقہ اس انتظار میں تھا کہ یہ حکومت معاشی بحران کی زد میں آ کر آج ناکام ہوئی یا کل۔ سب دیکھ رہے تھے کہ نو منتخب نوجوان وزیر اعظم اس کڑے امتحان سے کیسے گذرتا ہے؟

وزیر اعظم بننے کے بعد اس نے اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ ملکی صنعتوں کی حوصلہ افزائی اور معیاری مصنوعات کی تیاری کے لیے آزادانہ مقابلے کی فضا فراہم کرنے کے علاوہ ایک اہم قدم یہ اٹھایا کہ بھاری بھر کم ملکی وزارتیں کم کر کے 22 تک محدود کر دیں۔ اس کے بعد ملک میں مچی لوٹ مار کے راستے بند کرتا گیا۔ ترکی میں ہر طرف بدعنوانی کا راج تھا۔ ہر شعبے میں نیچے سے اوپر تک اس قدر لوٹ مار اور ہاہا کار مچی تھی کہ الامان والحفیظ۔ یہ صورتِ حال سیکولر حکومت کا تحفہ جاتی ورثہ تھی۔ بدعنوانی پر قابو پانے میں اسے حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ اس کا سبب اس کا خلوص اور حسن تدبیر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے ریاست کی طرف سے عوام کو فراہم کی جانے والی سہولتوں میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ ملکی صنعتوں کو فروغ دیا۔ غیر ملکی دوروں میں تاجر برادری کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور نئے نئے تجارتی معاہدے کرتا تھا۔ ترکی کے پاس معدنیات کی کمی ہے۔ اسے معلوم تھا جو کرنا ہے اپنے زورِ بازو سے کرنا ہے۔ لہذا یہ تن دہی سے معیشت کی بہتری کے لیے صنعت و تجارت کو فروغ دینے میں جُت گیا۔ ان مخلصانہ اقدامات کے نتیجے میں چھ سال کی قلیل مدت میں ترکی کی برآمدات 2008ء میں 130 ملین ڈالر سے تجاوز کر گئیں۔

ترکی کی ترقی اور بین الاقوامی برادری میں اس کی ساکھ بہتر بنانے میں اس کی تعلیمی

تحریک کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ سلامتی کونسل کے غیر مستقل ممبران میں ترکی نے 151 ممالک سے ووٹ لیے۔ ان ممالک میں سے اکثریت میں ترکی کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کا بڑا دخل تھا۔ خصوصا افریقی ممالک میں۔ شروع میں یہ تعلیمی ادارے خالص تعلیمی مقاصد کے لیے بنائے گئے، پھر انہی اداروں کے اندر ایسے لوگ مقرر کیے گئے جو ان ممالک کے تاجر حضرات کو ترکی کے تاجر حضرات کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں مدد دیں۔ ان اداروں کا معیار بھی کافی بہتر ہے۔ عمارت کا ڈیزائن، فرنیچر وغیرہ ترکی سے جاتا ہے یا کم از کم ترکی کے معیار کا ہوتا ہے۔ یہ اسکول مرکزی شہروں میں بنائے گئے ہیں اور ان میں خصوصی طور پر طبقہ شرفاء کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس ملک کے ارباب حل وعقد کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے میں ان اداروں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ترکی کے سرمایہ دار خاندانوں اور افراد نے ان اداروں کے ذریعے اپنے لیے دنیا بھر میں دوست بنانے اور راہیں کشادہ کرنے میں آسانی پیدا کی۔ ترکی کی تیز رفتار ترقی میں اس طرح کے اسکولوں کے عمل دخل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقتصادی اور تجارتی گروہوں کو پیسہ کمانے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ انہیں عطیات دینے کی ترغیب بھی دی گئی۔ اس بنا پر پاکستان کے زلزلے میں دیگر کاموں کے ساتھ صدر مشرف کو چار ملین ڈالر کا چیک پیش کیا۔ قربانی کے موقع پر کئی ہزار گائے ذبح کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ اس سے ترکی کے لیے دنیا بھر میں خیر سگالی کے جذبات پھیل رہے اور فزوں سے فزوں تر ہو رہے ہیں۔ ترکی کو اپنی بچھڑی اسلامی برادری سے روشناس کروانے، اسلامی ممالک سے قریب لانے اور محبت و تعلق نیز اثر و رسوخ پیدا کرنے میں انہوں نے شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ سات آٹھ سال سے یہ ''ترکش اولمپک'' بھی کروا رہے ہیں۔ سو ممالک سے پانچ سات سو منتخب بچے آئے ہوتے ہیں اور ترکی کے مختلف شہروں میں محفلیں اور مقابلے منعقد ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ بچے ترکی

زبان میں تقریریں کرتے اور طرح طرح کے ذہنی وجسمانی مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سے جو ماحول بنتا ہے اس سے دنیا کے مختلف ممالک میں ترکی قیادت کی اچھی ساکھ قائم کرنے میں کامیابی ملی ہے۔

ترکی کے اسلام پسندوں کی یہ جد و جہد مستقبل میں کس ہدف کو عبور کرتی ہے؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، البتہ اتنی بات طے ہے کہ ان کو نا کام بنانے کے لیے جہاں عالمی خفیہ طاقتیں (صیہونیت وصلیبیت) سرگرم ہیں، وہیں ہم وطن سیکولر ترک بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ دیکھتے ہیں اسلام پسندوں کا عزم وہمت اور تدبیر وحکمت کتنی کامیابیاں سمیٹتا ہے اور ان کا راستہ روکنے والوں کی پھونکیں چراغ کی لو مدھم کرنے میں کتنی ترک تازیاں دکھاتی ہیں؟ ہمارے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ اور کس طبقے کا ساتھ دے رہے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہم خود ہمارے ہاں کس ثقافت کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور کس کا دست و باز بن رہے ہیں؟ عظیم اور قابل فخر ماضی کی جستجو میں مگن قابلِ داد و تحسین لوگوں کا یا اپنے ہی منہ پر خاک اڑانے والے لائقِ توہین سر پھروں کا؟ کل گزشتہ ہمارے بڑوں نے ''تحریک خلافت'' چلائی تو ہم آج تک ترکوں کی نظر میں سُرخ رو ہیں۔ آج اگر ہم دامنِ خلافت میں پناہ لینے کی کوشش کرنے والوں کی پشت میں چھرا گھونپیں گے تو کل کا مؤرخ ہمیں کن الفاظ میں یاد کرے گا اور آنے والی نسل کن جذبات کے ساتھ ہمارا تذکرہ کرے گی؟ کل اُٹھنے والے اس سوال کا جواب اور اس مقدمے کا فیصلہ آج کے طرزِ عمل میں مضمر ہے۔

طِبّی نسخے

ترکی میں اسلام پسندوں کے طریق کار اور کامیابی کی وجوہات کا دلچسپ تجزیہ، پاکستان کی دینی و سیاسی جماعتوں کے لیے تقابلی موازنہ

☆

ترکی کے اسلام پسندوں کے لیے اتنے شدید مخالفانہ ماحول میں رکاوٹوں اور سازشوں سے بچتے ہوئے مسلسل پیش قدمی کیسے ممکن ہوئی؟ سوال کے جواب اور اس نکتے کے تجزیے کی دو صورتیں ممکن ہوسکتی ہیں: ایک تو یہ کہ معروف ترتیب سے ان کے اقدامات گنوائے جائیں اور قصیدے پڑھے جائیں۔ اس طرح کا اسلوب زیرِ نظر تحریر کی روح کے خلاف ہوگا، جو ایک اعتبار سے سفرنامہ ہے اور ایک اعتبار سے چشم دید حکایت نامہ۔ دوسرا طریقہ جسے ہم اختیار کریں گے، ان مختلف واقعات، حکایات اور رموز و نکات کے حامل مشاہدات کا تذکرہ جو بگوش خود سنے یا بچشمِ خود ملاحظہ کیے۔ اس سے قارئین کی دلچسپی بھی برقرار رہے گی اور انہیں ازخود سمجھنے کا موقع بھی ملے گا کہ عزم و ہمت جب فراست و حکمت کے ساتھ جمع ہوجائے اور اسے صبر و استقامت میں گوندھ دیا جائے تو کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

☆ سیکولرازم کے سائے میں پروان چڑھنے والی دو نسلوں کو، جو تیسری نسل کو جنم دے

چکی تھی، مسجد میں لانا کچھ آسان نہ تھا۔ ترک فطری طور پر آرٹ اور فن کے حوالے سے اعلیٰ ذوق کے مالک اور نفاست و شائستگی پسند ہوتے ہیں۔ اسلام پسندوں نے مساجد کا نظام بحال کرنے پر توجہ دی۔ مساجد میں تعمیر سے لے کر خطاطی تک اور صفائی وستھرائی سے لے کر حسنِ انتظام تک ایسا ماحول قائم کیا کہ آدمی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ سنے تو دُعا دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ترکی کی تاریخی مساجد تو عالمی آثارِ قدیمہ میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ وہاں تو ویسے بھی ملکی و غیرملکی سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ان کی طہارت و نفاست اور خوشبو، تسبیح و مصاحف کا اہتمام تو ویسے بھی خصوصی طور پر کیا جاتا تھا۔ آپ ترکی کی عام مساجد میں چلے جائیں، آپ کو احساس ہوگا کسی نے ان کو ہاتھوں سے نہیں، دل سے بنایا ہے۔ تعمیرات کے فن میں تو ترک ادارے چین کے بعد پوری دنیا میں ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں۔

ترکی میں مساجد کی تعمیر کا انداز مخصوص ہے اور ان میں فراہم کی گئیں سہولتیں مخصوص ترین ہیں۔ محرابوں اور دیواروں پر اعلیٰ معیار کی خطاطی، چھتوں سے لٹکے فانوس، فرش پر بچھے دبیز قالین، پتھر، لوہے، لکڑی اور فائبر کا عمدہ کام۔ خصوصی لکڑی اور پتھر کو تو ترک ماہرین گویا موم کی مانند اپنی مرضی سے ڈھالتے ہیں۔ حمامات کی صفائی کا اہتمام اتنا ہے کہ فائیو اسٹار ہوٹل اس کے آگے گرد ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو مساجد میں ہی نہیں، پوری ترکی میں موجودہ حکومت کا طرۂ امتیاز مانی جاتی ہے۔ مساجد میں تو خصوصی توجہ کے ساتھ نظافت و طہارت کا اہتمام ہوتا ہے۔ وضو خانوں، استنجا خانوں میں منقش ٹائلوں، معیاری نلکوں، گرم ٹھنڈے پانی کی سہولت کے علاوہ محلول صابن، کاغذ کے رومال وغیرہ وافر رکھے ہوتے ہیں۔

یہ سب چیزیں تو اور ترقی یافتہ ملکوں مثلاً: جنوبی افریقا وغیرہ میں بھی ہوتی ہیں، لیکن ایک چیز ایسی ہے جسے ترک حکومت نے خصوصی طور پر اپنایا ہے۔ ترک بلدیہ نے جس کے

مونوگرام میں مینار اور گنبد دکھائے گئے ہیں، مساجد کے باہر ایسے خوبصورت چھپر بنائے ہیں جہاں خوبصورت میز، کرسی دھرے رہتے ہیں۔ یہاں اخباروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دینی رسائل رکھے رہتے ہیں۔ قریب میں ایک کھوکھے میں قہوہ بمع لوازمات اور اسلامی کلینڈر، کتابچے وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں۔ ترک عوام محفلوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ ان محفلوں میں چائے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چاکلیٹ یا جیلی نما مٹھائی بے دریغ چلتی ہے۔ کبھی کبھی ''بقلاوا'' اور ''قدائف'' نامی شیریں سوغات بھی ہمراہ ہو جاتی ہے۔ عصر سے عشاء کا وقت قریب قریب اور فاصلہ کم کم ہوتا ہے۔ سرد موسم کی وجہ سے بار بار گھر آنے جانے کے بجائے نمازی عصر کو آتے ہیں اور عشاء پڑھ کر گھر جاتے ہیں۔ بیچ کا وقت مسجد کے باہر اس عوامی محفل میں گزارتے ہیں جہاں انہیں بلدیہ کی طرف سے بیٹھنے کی آرام دہ اور دل پسند سہولتیں فراہم کرنے کے ساتھ ہلکا پھلکا دینی ادب فراہم کر دیا جاتا ہے۔ نیز امام و مؤذن اور داعی حضرات کو موقع مل جاتا ہے کہ ان نشستوں میں نوجوان نسل سے اختلاط کریں اور ان کی دھیرے دھیرے ذہن سازی کریں۔

ویسے بھی آدمی مسجد کے سائے میں بیٹھا رہے تو بہت سے فتنوں سے بچا رہتا ہے۔ ماہِ رمضان میں یہ رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ بڑی مساجد کے باہر خطاطی اور کتابوں کی نمائش لگتی ہے۔ رات بھر لوگ ان میں شریک ہو کر لاشعوری طور پر اسلامی تہذیب کے مختلف شعبوں کو زندہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کوتاہی ہے کہ ہم برصغیر کے محقق علماء کی کتابیں ترجمہ کر کے ترک بھائیوں تک نہیں پہنچا سکے۔ اس لیے ترک نسل مولانا مودودی سے جتنی واقف ہے، اتنی برصغیر کے بڑے بڑے علماء اور ان کی اصلاحی و انقلابی نگارشات سے واقف نہیں۔ الغرض! بلدیہ نے مسجدیں ایسی بنائی ہیں کہ دل اٹکا رہے۔ قرآنِ پاک ایسے چھاپے ہیں کہ انسان دیکھتا ہی رہے۔ خطاطی اور نقش و نگار ایسے ہیں کہ تہذیب کو مذہب سے جوڑ دیا ہے۔ نتیجتاً

علوم کو دین سے اور نوجوانوں کو مذہب سے جوڑنے کی راہ کھل گئی ہے۔

☆ ''قرآن کریم'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا کردہ وہ نعمت ہے، جس کے بیش بہا فوائد ہیں۔ ایک بڑا فائدہ یہ کہ اُمت اس کے ذریعے پہلے آپس میں اور پھر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑ سکتی ہے۔ دونمہ نسل کے سپوت اور خلافت کے قاتل مصطفیٰ کمال اتاترک نے جہاں اور ظلم ڈھائے اور مصحف شریف کی بے حرمتی کرتے ہوئے، اس وقت کے ایک بڑے عالم جو اس سے اسلامی شعائر کے تقدس واحترام کے حوالے سے بات کرنا چاہتے تھے، کے سر پر...... معاذ اللہ...... دے مارا، وہیں یہ بدبختی بھی سمیٹی کہ قرآن پاک سے پوری قوم کا تعلق توڑنے کے لیے عربی رسم الخط پر پابندی لگادی۔ اس طاغوتی فیصلے سے یک لخت ترکی کی نئی نسل کا تعلق قرآن پاک سے ختم ہوگیا۔ جو پرانے بابے تھے، ادھیڑ عمر کے لوگ، وہ تو چھپ چھپا کر تلاوت کر سکتے تھے، نئی نسل تو دیکھ کر پڑھنے سے بھی رہ گئی تھی۔

راقم الحروف کو ایک بار شوق ہوا کہ موجودہ ترکی میں قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم کا جائزہ لے کہ کس طرح کی بنیادوں پر استوار ہے؟ خالص قرآنی مکاتب تو کم ہی تھے۔ دن کو اسکول اور شام کو قرآن پاک کے نظم کو دیکھنے کا موقع ملا۔ بس سمجھیں جیسے تیسے کر کے اللہ والے کام میں لگے ہوئے تھے۔ البتہ ایک کل وقتی مکتب ایسا ملا جو پاکستان کے ہمارے احباب میں سے جناب جاوید ہزاروی صاحب چلا رہے ہیں۔ موصوف تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایبٹ آباد میں جامعہ زیتون کے نام سے ان کا وسیع وعریض ادارہ معیاری کام کر رہا ہے۔ انہوں نے استنبول کے ایشیا والے حصے میں مکتب قائم کر رکھا ہے۔ اس میں محلے کے لوگ بھی جڑتے ہیں اور ان کا اچھا خاصا حلقہ ہے۔ وہاں ترکی کے ایک عالم مولانا عبداللہ یلدرم جو دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہیں، اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس مکتب میں ترکی

میں پڑھایا جانے والا قدیم قاعدہ دیکھنے کو ملا۔ یہ اس وقت کے ایک بڑے عالم کا لکھا ہوا تھا۔ سادہ کاغذ پر قدیم انداز میں طباعت تھی۔ البتہ مولانا عبداللہ اور ان کے ساتھ موجود ترکستان کے ایک عالم جو جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فارغ التحصیل تھے، تختۂ سفید پر جدید انداز میں بچوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ ہوشربا اخراجات کا تحمل کرتے ہوئے شہری علاقے میں کرائے پر مکان لے کر ایسی خدمت کی ہمت کرنا بھی قابلِ تحسین بات ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب ہزاروی صاحب اور ان کے رفقاء کو خوب خوب ترقیات سے نوازے۔

قرآن شریف اور اس کی زبان شناسی یا حروف فہمی سے تعلق ختم ہونے کے باوجود ترک قوم جب کسمسا کر اٹھی اور اسلام پسندوں کے آنے سے اسے انگڑائی لے کر بیدار ہونے کا موقع ملا تو اس نے پچھلی کوتاہیوں کی تلافی شروع کی۔ استنبول میں ”حیرت وقف“ کے نام سے ایک طباعتی ادارہ ہے جو دنیا کے پانچ بڑے طباعتی اداروں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ ایکڑوں پر پھیلے اس وسیع و عریض ادارے میں اعلیٰ معیار کے مصاحف طبع کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسا نسخہ بھی چھاپا گیا ہے جس میں جو لفظ اوپر کی سطروں میں ہوگا، اس جیسا یا اس کے مادے سے مشتق لفظ نیچے کی سطر میں اسی کے متوازی درج ہوگا۔ بظاہر یہ ایک حیرت انگیز چیز تھی۔ اگر راقم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو یقین نہ آتا ایسے ملتے جلتے الفاظ کو دوسرے رنگوں سے ممتاز کر کے الگ گلابی رنگ دیا جاتا ہے۔ اس سے ان کی خوبصورتی اور معنویت بہترین انداز میں اجاگر ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کے سامنے قرآنِ کریم کے اعجاز کا ایک اور منفرد پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ ان مصاحف کی خطاطی، کاغذ، طباعت، جلد بندی، پیش کش کا انداز ہر چیز میں اعلیٰ معیار کو ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے۔ ہم تو چونکہ استنبول میں ہونے والی کتابوں کی عالمی نمائش میں شرکت کے لیے گئے تھے، اس لیے ہمیں قرآنِ کریم کی طباعت کے علاوہ بھی ترک حضرات کے کام کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی مشہور خطاط حضرات سے ملاقات ہوئی جو

عالمی سطح کے مقابلوں میں حصہ لے کر انعام حاصل کر چکے تھے۔ کچھ اتنے معمر، کہنہ مشق اور کئی مشہور خطاطوں کے استاد تھے کہ ان کے تیار کے گئے شہ پاروں کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہم ایک نقشبندی بزرگ سے ملاقات کے لیے گئے تو انھوں نے ہمیں پنے شوروم میں ملاقات کا وقت دیا۔ ہمیں تعجب ہوا کہ شیخ وقت اور شوروم! سبحان اللہ! کچھ مناسبت سمجھ نہ آئی۔ جب زیارت کے لیے حاضری دی تو معلوم ہوا خطاطی کے نمونوں کو قسما قسم چوکھٹوں میں سجاتے ہیں۔ چمڑا، کپڑا، لکڑی، پتھر، پلاسٹک، فائبر کون سی چیز ہے جس میں آیات واحادیث کی خطاطی کو منتقل کر کے نہ سجاتے ہوں۔ ایک تو ترکی کے مشہور اساتذۂ فن کی کاوشیں، پھر آنجناب اور ان کے دو بھائیوں کے مشاق اور ماہر فن ہاتھوں سے گزری ہوئی دست کاری، نہ پوچھیے کیسے نفیس اور دلربا انداز کے فن پارے تیار ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض انتہائی قیمتی اور نادر قسم کے تھے۔ ہم سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔ انہیں آپ کہاں بھجواتے ہیں؟ ان کا خریدار کون سا طبقہ ہے؟ شیخ تو کچھ نہ بولے۔ ان کے خدام نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بتایا کہ غیر ملکی سربراہانِ مملکت کو جب تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں تو ہمارا حکمران طیب اردگان جو اپنے نام کی طرح طیب ہے (یہ ان کے الفاظ ہیں) کوشش کرتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا تحفہ دے جس میں کوئی پیغام مضمر ہو۔ چنانچہ وہ ہمارے شیخ کے ہاں سے مختلف نادر نمونے منگوا کر انہیں پیش کرتا ہے۔ عربی خط کی یہ خدمت ممکن ہے اسلام پسندوں کو آگے چل کر یہ موقع فراہم کر دے کہ وہ اپنی قومی اور آبائی زبان کے اصل خط کو دوبارہ زندہ کر سکیں۔

ترکی میں خطاطی کی نمائشیں بڑے شوق و ذوق سے منعقد کی جاتی ہیں۔ اساتذہ فن اپنے شاگردوں کی تیار کردہ کاوشوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ترک قوم ان کی بے مثال

حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ایک ایک مشق پارہ منہ مانگی قیمت پر ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ بعض چیزوں کا ہدیہ لاکھوں میں بھی کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ خود اپنے کانوں سنا ہے۔ پاکستان کے قابلِ فخر سپوت، ملک الخطاطین، سید بادشاہ، حضرت اقدس انور حسین شاہ صاحب نفیسؒ جب ترکی تشریف لے گئے تھے، تو وہاں کے بڑے خطاط حضرات سے ملاقات کے وقت انہوں نے اپنے محترم میزبانوں کی فرمائش پر ایک کتبہ بعجلت بطور یادگار لکھ کر پیش کیا تھا۔ پاکستان میں طبع شدہ خطاطی کی کتابوں میں یہ بآسانی مل جاتا ہے۔ ترک خطاط حضرات آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس عاجز کو چونکہ حضرت شاہ صاحب نوّر اللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہتا تھا، اس لیے ان کا تذکرہ چھڑ گیا۔ یادوں کی خوشبو دیر تک ہمیں اپنی مہک سے نوازتی رہی۔

☆ ایک سیکولر ملک میں شراب پر پابندی لگانا اور پھر اسے نبھالینا کس قدر کٹھن ہے؟ اس کا احساس اسی شخص کو ہوسکتا ہے، جس نے کوئی ایسا ملک دیکھا ہو، جہاں پر ام الخبائث، پانی کی طرح بہتی ہو۔ تدریجی اصول کے تحت اس پر پابندی سے پہلے تحدید کی غرض سے محصول بڑھا دیا گیا۔ عام شراب پر 48 فیصد اور مہنگی شرابوں پر 65 فیصد محصول عائد کیا گیا۔ سیکولر طبقے نے واویلا مچایا کہ یہ شدت پسندی کی طرف پہلا قدم ہے۔ اردگان حکومت نے جواب دیا چونکہ حکومت ہر شہری کو علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کرتی ہے اور شراب پینے والے شخص کے علاج پر دوسرے شہریوں سے زیادہ خرچ ہوتا ہے، اس لیے ان سے محصول بھی زیادہ وصول کیا جا رہا ہے۔ جو فضولیات پر پیسہ خرچ کرے تو وہ اخراجات میں حصہ بھی اتنا ہی ڈالے۔ اس طرح برائیوں کی اس جڑ کو مزید محدود کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

☆ شراب سے زیادہ جس چیز کا چھڑانا مشکل تھا، وہ سگریٹ نوشی ہے۔ مرد تو مرد ترکی کی خواتین کو بھی تمباکو نوشی کا اس قدر عادی بنا دیا گیا تھا کہ کئی ملکوں کے بجٹ سے زیادہ رقم

اس لت پر پھونک دی جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا ترکی قوم دنیا کی قیادت چھن جانے کا غم اپنے آپ کو گلا کر غلط کرنا چاہتی ہے یا جام میں ڈوب کر غم دوراں بھلانا چاہتی ہے۔ تمبا کو پر پابندی لگانا حکومت کی رخصتی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح کی چیزوں کے لیے موجودہ ذہین اور زیرک وزیر اعظم طیب اردگان کے ''طِبّی نسخے'' بڑے مشہور ہیں۔ انہوں نے یہ کیا کہ ان کا جو ''چین سموکر'' دوست ان سے ملتا، یہ اس کے ہاتھ سے سگریٹ کا ڈبہ لے کر اسے کچرے کی ٹوکری میں خالی کرتا اور خالی ڈبہ پر اپنے دستخط ثبت کر کے دے دیتا۔ یہ گویا ایک خاموش معاہدہ ہوتا کہ جس طرح میں نے تمبا کونوشی چھوڑ دی ہے، میرے دستخط تمہیں یاد دلاتے رہیں گے کہ تم بھی یہ بری عادت ترک کر دو۔ اردگان کی مقبولیت اتنی تھی کہ اس کا دستخط حاصل کرنے کے لیے لوگ دھویں سے نجات حاصل کرنے کا عزم کر لیتے۔ رفتہ رفتہ اس طرح کے اتنے ڈبے جمع ہو گئے کہ ان کی باقاعدہ نمائش ہوئی۔ تمبا کو چھوڑنے والوں کے انٹرویو ہوئے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اس مضرِ صحت چیز سے بچنے کی ہمت ملی۔ یہ مشکل کام کسی حد تک آگے بڑھا تو عوامی مقامات پر تمبا کونوشی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس طرح اس عادتِ بد کو ختم تو نہیں کیا جا سکا، البتہ کم سے کم کرنے کی تدریجی کوششیں جاری ہیں، کہ یہ بھی ایسی کافر چیز ہے، جو منہ کو لگ جائے تو چھٹتی نہیں۔

☆ یہ قوم چونکہ ان عثمانی سلاطین کی نسل ہے، جنہوں نے صدیوں یورپ پر حکومت کی، اس لیے اس کا ذہن بدلنے کے ساتھ اس کا وجود محدود کرنے کی تدبیریں بھی تندہی سے کی گئیں۔ آپ کسی بھی ترک خاندان میں چلے جائیں، آپ کو چند ہی بچے ملیں گے۔ گول مٹول، لال سرخ، بہار کے تازہ پھولوں جیسے خوبصورت بچے اس قوم کی شناخت ہیں، لیکن ایسی ذہن سازی کی گئی کہ زیادہ بچوں کا رجحان ہی ختم ہوتا چلا گیا۔ ایک خوبصورت، ذہین اور بہادر نسل اپنے پھول سے بچوں کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹنے لگی۔ ''بچے دو ہی اچھے'' کا

پرفریب نعرہ جیسے ہمارے ہاں زبان زبان پر چڑھ گیا یا چڑھایا گیا ہے۔ اس طرح ترک قوم بھی اس نسل کش فتنے کی لپیٹ میں تھی۔ وزیر اعظم اردگان نے ''بچے دو ہی اچھے'' کی جگہ ''کم از کم تین بچے'' کا ذہن دیا۔ اس تدبیر سے یورپ کی طرح غیر متوازن اور بوڑھی نسل کے خطرے سے بھی نجات ملی۔ تحدیدِ نسل کی کوششیں بھی نامراد ہونا شروع ہو گئیں اور ایک ایسا بنیادی نظریہ یا نعرہ بھی وجود میں آ گیا جو اعتدال پسندی اور زمانہ شناسی پر مبنی تھا۔

☆ ایک فلاحی ریاست وہ ہے جو اپنے شہریوں کو کم از کم چار چیزیں فراہم کرے۔ شہری سہولتیں، انصاف، صحت، تعلیم اور امن۔ موجودہ اسلام پسند وزیر اعظم خود مزدور کا بیٹا تھا اور اسے بندۂ مزدور کے وہ تلخ اوقات یاد تھے، جب اسے پھٹے ہوئے جوتے پہن اسکول جانا پڑتا تھا۔ سیکولر دورِ حکومت کی پہچان بدعنوانی، ناانصافی اور شہری سہولتوں کا فقدان تھا۔ استنبول جیسے بین الاقوامی شہر میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ پانی کمیاب تھا۔ سڑکوں پر ازدحام اور دھواں اگلتی گاڑیوں نے جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔ باسفورس جیسی تاریخی جگہ کو کچرا کونڈی بنا کر اس کے مرمریں پانی میں اتنا کوڑا کرکٹ ڈالا گیا تھا کہ گندگی کے جزیرے، ٹاپو بن کر اُبھر آئے تھے۔ پانی غلیظ اور بدبودار ہو گیا تھا۔ شہر کا حسن تو غارت ہوا ہی تھا، تاریخی مقامات کو بھی گھن لگ رہا تھا۔

باسفورس سے منسوب واقعات نہ صرف ترک قوم کی قابلِ فخر یادگاریں تھیں، بلکہ اس سے شہر کی خوبصورتی اور باسیانِ شہر کی تفریح کا بھی گہرا تعلق تھا، جبکہ سیکولر دورِ حکومت میں یہ بدانتظامی اور بدعنوانی کے سبب غلاظت بھری بدرُو کی طرح سڑاند دینے لگ گئی تھی۔ اردگان نے اس کی صفائی کے لیے بین الاقوامی سطح پر پیشکشیں مانگیں۔ کسی نے حامی نہ بھری۔ ایک جاپانی ادارے نے یہ پیشکش کی کہ اسے پاٹ کر سطح زمین کے برابر کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کو شہر کے اندر ہزاروں ایکڑ قیمتی ترین رقبہ ہاتھ آ جائے گا اور ملکی معیشت کو غیر معمولی سہارا ملے

گا۔ غیرت مند حکمران نے جواب دیا:

’’ہمیں ترقی اور خود کفالت کی ضرورت ہے، لیکن آبا و اسلاف کا ورثہ بیچ کر نہیں۔‘‘

اردگان نے اپنے طور سے اس تاریخی آبنائے کی صفائی کی ٹھان لی۔ جتنی نفری اور جتنے آلات دستیاب تھے، سب لے کر باسفورس کے کنارے ڈیرے لگا لیے۔ فاتح نے خشکی میں کشتیاں چلا کر عجوبہ انجام دیا تھا۔ اس کی کشتیاں آ کر جب ’’شاخ زرّیں‘‘ میں اتریں تو قسطنطنیہ کی تصفیے کی مہم کامیابی کے کنارے جا لگی۔ اردگان نے پانی میں سے خشک کچرے کے جزیرے نکال باہر کر کے کارنامہ انجام دیا۔ اس نے اس سمندری ندی کو غلاظت سے پاک کر کے دوبارہ اس قابل بنا دیا کہ اس کے نیلگوں پانی کے آئینے میں ترک نسل اپنے قابل فخر ماضی کا عکس دیکھ سکے۔ اس کی مشینوں اور کارکنوں نے اس تاریخی حوض کا ایسا تصفیہ کیا کہ جہاں سے گزرتے ہوئے لوگ ناک سکیڑ لیتے تھے، آج وہاں چھٹی کے روز پورا دن بیٹھے مچھلی پکڑتے اور ہوا خوری کرتے ہیں۔

☆ سیکولر دور میں ’’شاخ زرّیں‘‘ کے کنارے خوبصورت باغوں کے بیچوں بیچ ایسے تفریحی مراکز یا طعام گاہیں بنائی گئی تھیں، جہاں صرف طبقہ شرفاء یا ان کے اہلِ خانہ ہی سرمائے کی چمک دیکھ سکتے یا دکھا سکتے تھے۔ عام آدمی کا وہاں داخلہ ممنوع تھا۔ یہاں کے خوبصورت درخت عوام کے لیے ’’شجرِ ممنوع‘‘ اور یہاں کی طعام گاہیں اس ممنوع درخت کے پتے تھے۔ یہ تمام تعمیرات اور ان پر ہونے والے خطیر اخراجات چونکہ عوام کی رقم سے کئے گئے تھے، اس لیے اردگان نے جو ایک زمانے میں استنبول کی بلدیہ کا سربراہ تھا، انہیں عوام کے لیے کھولنے اور طبقاتی فاصلے روند ڈالنے کا بیڑا اٹھایا۔ اسلام جس مساوات کی تعلیم دیتا ہے، اس کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا۔ اس نے ان تمام جگہوں کی تزئین و آرائش کی۔ اعلیٰ درجے کی (پنج ستارہ طعام گاہوں کی) سہولتیں درمیانے درجے کے نرخ پر فراہم کیں اور انہیں

شراب سے پاک کر کے عوام کے لیے کھول دیا گیا۔

شروع شروع میں استنبول کے شہری سیکولر دور کے جبر سے ایسے سہمے ہوئے تھے کہ وہاں قدم رکھنے سے ہچکچاتے تھے۔ جب چند دنوں تک کچھ لوگوں کے آنے جانے اور وہاں کی جائز سہولیات سے استفادہ کرنے کا چرچا ہوا تو ہمت کر کے عام شہریوں نے بھی جانا شروع کر دیا۔ عوام کے پیسے سے عوام ہی کو جائز تفریح میسر آئی اور سیکولر کہلانے والوں کی کھڑی کی ہوئی طبقاتی تقسیم کی دیواریں رونڈ ڈالی گئیں۔ اب ایسی تمام جگہیں بلدیہ نے گود لے کر تعمیرِ نو کے مرحلے سے گزار کر عوام کی جائز تفریح کے لیے وقف کرنا شروع کر دیں۔ ان جگہوں پر تحفظ، نظافت اور نفاست کا اعلیٰ انتظام تھا۔ ساتھ ہی اردگان نے اعلان کیا کہ ان طعام گاہوں کی تمام آمدنی عوامی سہولیات پر خرچ ہوگی۔ ایک روپیہ بھی خرد برد تو کجا، کہیں اور بھی خرچ نہ ہوگا۔ عوام کو اس کی بات کا یقین آ گیا، کیا اسلام پسند اور کیا سیکولر اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور کھانے کی قیمت کو شہر کی تعمیر کے لیے چندہ سمجھ کر دیتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ احقر کو بعض مقامی احباب اس طرح کی ایک ساحلی طعام گاہ میں لے گئے۔ اس کے منتظم کو پتا چلا کہ پاکستانی حضرات آئے ہیں تو وہ جس محبت اور وارفتگی سے آ کر ملا، وہ نہ بھولنے والی چیز ہے۔ ترکوں کے پاکستانیوں سے دلی تعلقات اور محبت و دوستی کے عنوان کے تحت میں اس واقعے کو آیندہ کہیں ذکر کروں گا۔

☆ معاشی غارت گروں کی اقتصادی دہشت گردی کی داستان لکھتے وقت راقم الحروف کسی حد تک واضح کر چکا ہے کہ یہ لوگ کس طرح سے دنیا بھر کے ملکوں کو معاشی غلام بناتے اور قرضوں میں جکڑ کر انہیں ہمیشہ کے لیے ماتحت وزیرِ دست رکھتے ہیں۔ جنوبی امریکا کے چند ملکوں کولمبیا، چلّی، ایکواڈور، بولیویا کے حکمرانوں اور صدر صدام کا اور کوئی جرم نہ تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے ان عالمی اقتصادی دہشت گردوں کا آلۂ کار بننے سے انکار

کر دیا تھا اور دنیا کے بعض ملکوں بشمول کچھ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کی کوئی خوبی نہیں سوائے اس کے کہ انہیں ان عالمی غارت گروں کی حمایت اس بنا پر حاصل ہے کہ ان کی معدنی دولت کے اخراج اور ترسیل کا نظام ان قوتوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ معاصر دنیا میں وینز ویلا کے ہیوگوشاویز کے بعد اگر کسی نے ان قوتوں کا آلۂ کار بننے سے انکار کیا ہے اور پھر کامیابی سے ان کی سازشوں......بشمول حکومت گرانے یا قتل کرنے کی کوششوں......کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے تو وہ ترکی کا رجب طیب اردگان ہے۔ اس پر سات سے زیادہ قاتلانہ حملے اس لیے ہوئے ہیں کہ وہ ترکی کی ''معاشی و صنعتی ترقی'' کے لیے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے کیوں نہیں لیتا۔ اپنے وسائل پر انحصار کیوں کرتا ہے؟

یہ عاجز جب ترکی گیا تو ایشیا کو یورپ سے ملانے والے پل پر جاتے وقت خدا ہی جانتا ہے دل میں کیسی کیسی ماضی کی یادیں اور مستقبل کے کیسے کیسے ارمان تھے؟ مجھے بتایا گیا کہ اس پل کے متوازی دوسرا پل اردگان بنا رہا ہے اور چند مہینوں میں اسے عوام کے لیے کھول دے گا۔ یہ پل جہاں ترکوں کے فنِ تعمیر میں مہارت کا شاہکار ہے، وہیں اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ اس کے لیے بین الاقوامی اداروں کے اصرار کے باوجود ان سے قرضے نہیں لیے گئے۔ عوام میں اس حوالے سے نہایت جوش وخروش پایا جاتا ہے کہ یہ پل مکمل ہو تو وہ اس قومی یادگار سے گزرتے وقت ٹیکس کی شکل میں اپنے زیرک اور بہادر حکمران کو محبت کا تحفہ دیں اور اس کا بوجھ اتارنے میں ہاتھ بٹائیں۔

جب سے میں نے یہ سنا تو ترکی کی اسلام پسند جماعت اور اس کے رہنماؤں وحکمرانوں کے نظریاتی کھرے پن اور مؤمنانہ فراست وعزیمت کا پہلے سے زیادہ قائل ہوگیا؛ کیونکہ بین الاقوامی قرضے وہ چیز ہیں جو اچھے اچھے حریت پسند انقلابیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہ قرضے وہ لوگ جاری کر رہے ہیں جن کے زمین پر ہوتے ہوئے شیطانی قوتیں

بالکل بے غم ہیں کہ ان کا چنگل شیطان کے چنگل سے زیادہ مہیب اور ان کی آنتیں شیطان کی آنتوں سے زیادہ لمبی اور پیچ دار ہیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں ان حکمرانوں کی سلامتی کے لیے نہایت خشوع سے دعا کرتا ہوں، کیونکہ جانتا ہوں ان معاشی طاغوتوں کے سامنے ''لا الہٰ'' کا نعرہ بلند کرنے والے کی زندگی کو کتنے خطرات کا سامنا ہوتا ہے۔

☆ آج کل عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بیرونی قرضے لیے بغیر نہ کوئی ملک اپنے باشندوں کو صحت، تعلیم اور مواصلات جیسی سہولتیں فراہم کرسکتا ہے اور نہ ہی عسکری یا دفاعی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ یہ ذہن دراصل قرض لینے والے ضرورت مندوں کا اپنا نہیں، قرض دینے والے غارت گروں کا دیا ہوا ہے۔ یہ قرض نہ تو بغیر سود اور بغیر ظالمانہ شرائط کے دیے جاتے ہیں اور نہ کبھی ان کی منصفانہ واپسی...... مع سود ہی سہی...... ممکن ہونے دی جاتی ہے۔ یہ وہ راز ہے جس کو کھولنے کے لیے بہت کچھ لکھنے اور قوم کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ترکی میں صحت کی سہولتوں کا یہ حال تھا اردگان جو اپنے زمانے میں فٹ بال کا مشہور کھلاڑی تھا اور آج کھیلتا رہتا تو قومی اسمبلی کی سربراہی کے بجائے قومی ٹیم کا کپتان ہوتا۔ یہ ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی سفر میں سڑک حادثے میں زخمی ہوگیا۔ اس کے دوست اسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ معاینہ کرنے والے مسیحاؤں نے اس کے زخموں سے پہلے اس کے کارڈ کا معاینہ کیا اور کہا کہ اس جیسے کارڈ کے حامل شخص کو ہمارا ہسپتال طبی سہولت فراہم نہیں کرسکتا۔ اس کے ساتھی اسے زخمی حالت میں اٹھا کر ایک سے دوسرے ہسپتال میں پھرتے رہے، لیکن اس کے زخموں کو مرہم میسر ہونے تک یہ ایسے کرب سے گزر چکا تھا جو اسے آج بھی یاد ہے۔

اس نے سربراہِ مملکت بنتے ہی یہ اعلان کیا کہ ہر ترک شہری کو 18 سال کی عمر تک طبی سہولتیں مفت فراہم کی جائیں گی۔ سرکاری ملازمین اور معمر شہریوں کے لیے تو یہ سہولت اور بھی آسان تھی۔ دور دراز شہروں میں اتنے بڑے بڑے معیاری ہسپتال بنائے گئے کہ کسی کو

استنبول آ کر خطیر اخراجات کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس سے بد عنوانی کے خاتمے اور آبادی میں اضافے کی تحریک کو بھی تقویت ملی۔ لوگوں کے گھریلو طبّی اخراجات کم ہوئے تو بدعنوانی پر قابو پانے میں بھی مدد ملی۔ اردگان حکومت کے لیے ممکن ہوا کہ عوامی حمایت کے حصول اور مخالفین کے بھڑکائے گئے لاوا کو ٹھنڈا کرنے میں کامیابی کے ساتھ قدم جما کر بڑھتی رہے۔

اس وقت ترکی میں طبی تعلیم بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ راقم پہلے لکھ چکا ہے کہ امریکا و یورپ کے معیار کی تعلیم بہت کم معاوضے پر، بلکہ تقریباً مفت میں دی جاتی ہے۔ نجانے کیوں ہمارے طلبہ کی دوڑ گوروں کے دیس کی طرف لگی ہوئی ہے۔ جہاں حقارت آمیز سلوک اور عمر بھر غیروں کی نوکری کا طوق تحفے میں ملتا ہے۔ ترکی کے ہسپتالوں میں فراہم کی جانے والی طبی سہولتیں بھی معیاری ہیں۔ صفائی اور نظافت کو تو ویسے بھی اسلام پسند حکومت نے اپنی پہچان بنایا ہوا ہے۔ ہسپتالوں اور طعام گاہوں میں اس کا مظاہرہ اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مفت یا سستا علاج جب اعلیٰ درجے کی سہولتوں کے ساتھ عوام کو ملنا شروع ہوا تو خاموش اکثریت کے علاوہ سیکولر طبقہ بھی قائل یا مائل ہوتا گیا۔ ترقی وانصاف فراہم کرنے کی دعویدار حکومت کو صحت و تعلیم اور معیشت کی بہتری کے ذریعے اپنے وعدے پورے کرنے میں قابلِ تعریف حد تک کامیابی ملی۔

☆ ترکی کا ایک بڑا مسئلہ جو سیکولر حکمران اپنی بدعنوانی اور غیر ذمہ داری کے سبب حل نہ کر سکے، انفراسٹرکچر کا ہے۔ استنبول شہر آدھا یورپ میں ہے، لیکن شہری سہولتوں کے اعتبار سے دنیا کے سبب سے زیادہ ازدحام والے، اور کم شہری سہولتوں والے شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس معاملے میں یورپ کا ہم پلّہ ہونا تو کجا، ترقی پذیر ممالک کے بڑے شہروں سے موازنہ بھی مشکل تھا۔ مجھے خود استنبول کے ایک رہائشی ڈاکٹر صاحب نے بتایا ایک دن میں

گھر پہنچا تو دیکھا بیگم صاحبہ رو رہی ہیں۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ کپڑے دھونے کی مشین میں گیلے کپڑے ڈالے تھے۔ پانی نہ آنے کی وجہ سے سب سڑ گئے ہیں۔ اتنا پانی بھی نہیں ہے کہ انہیں صاف پانی سے گزار کر کھنگال لیا جائے۔ استنبول جیسا شہر جو عالمی سطح کے آثارِ قدیمہ سے بھرا ہوا تھا، اس میں جگہ جگہ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر تھے۔ بے ہنگم اور بے قاعدہ گاڑیاں تھیں۔ بدعنوانی اور چور بازاری کا راج تھا۔ جرائم کی افزائش کے لیے سازگار ماحول تھا۔ سات شرعی عیبوں میں سے کون سا عیب تھا جو لادین طبقے نے یہاں پال نہ رکھا ہو۔ اسلام پسندوں نے آتے ہی بدعنوانی کے خاتمے اور صحت و صفائی کے اقدامات کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ آیندہ دس سالوں میں ملک کے مواصلاتی نظام کو بہتر بناتے ہوئے ترکی کی سڑکوں کو پندرہ ہزار کلومیٹر تک لے جائیں گے۔ اس وقت ترکی میں 6,200 کلومیٹر طویل سڑکیں تھیں، جو پچھلے 79 سال میں تعمیر ہو سکی تھیں۔ ان کو دس سال میں دگنے سے زیادہ مقدار پر لے جانا پچھلی پون صدی کو پیچھے چھوڑنے والی بات تھی، لیکن دوسری ناقابلِ یقین باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا اور نویں سال میں صورتِ حال یہ تھی کہ 12 ہزار کلومیٹر سڑکیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ ہم جن دنوں وہاں تھے، وزیر اعظم اردگان نے وسط ترکی کے ایک غیر معروف شہر میں ہوائی اڈے کا افتتاح کیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لیے اس شہر سے دوسرے شہروں تک سڑکوں کا جال بھی بچھایا گیا تھا۔ اس سے قبل اس پورے خطے کے لوگوں کو فضائی سفر کے لیے دور دراز کے بڑے شہروں میں جانا پڑتا تھا۔ اس وقت ترکی کی سڑکوں کے نظام کو یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے اور یہ سب اسلام پسند حکومت کی ''فلاحی سیاست'' اور ''رفاہی ریاست'' کے فلسفے کی بدولت ہے۔

☆ ریل کی کہانی اسلام پسندوں کے عزم و ہمت کی مستقل داستان ہے۔ استنبول کے اندرونِ شہر ریلوے کے نظام کو دنیا کے متمدّن اور ترقی یافتہ ترین شہروں کے ریلوے نظام کا

ہم پلّہ قرار دیا جاتا ہے۔ احقر کو خود اس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ زیرِ زمین کئی منزلہ سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے ریل میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کسی جدید اور آرام دہ بیٹھک میں پہنچ گئے ہیں۔ سبک رفتار اور تمام سہولتوں سے آراستہ ریلیں جن میں مسافروں کی اطلاع کے لیے کمپیوٹرائزڈ نظام اور سب سے بڑی خوبی کہ کم وقت، کم خرچ میں باسہولت اور آرام دہ سفر جس میں آپ کو یہ احساس ہی نہیں ہوگا کہ آپ زمین کے پیٹ میں محو پرواز ہیں۔

ریل کے کرایوں کی باسہولت و باکفایت ادائیگی کے لیے مختلف شکلیں متعارف کروائی گئی ہیں۔ لوگ اس نظام کو اتنا پسند کرتے ہیں کہ گاڑی لا کر کھڑی کر دیتے ہیں اور شہر کے دوسرے حصے تک کا سفر بذریعہ ریل کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ استنبول کے باہر پورے ترکی میں ریل کے نظام پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ راقم پہلے لکھ چکا ہے جب مدارس پر پابندی تھی تو علمائے کرام اپنے شاگردوں کو لے کر ریل کے ڈبے میں آخری منزل کا ٹکٹ لے کر سوار ہو جاتے تھے اور دوپہر کو وہاں اتر کر سانس لے کر دوبارہ واپسی کے لیے سفر شروع کر دیتے تھے۔ لوہے کی بنی کیپسول نما سواری میں محفل جمانے اور لوہے کی سڑک پر پھسلتی آہنی درس گاہ میں سبق پڑھنے کا مزا ہی الگ ہوتا تھا۔

☆ اندرونِ شہر سڑکوں کے بیچوں بیچ چلنے والی تیز رفتار، دھویں اور شور سے پاک، وقت کی پابند بسوں کی کہانی اس سے بھی دلچسپ ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استنبول کی سڑکوں پر رینگتا ہوا بے ہنگم ٹریفک مشکلات اور ناقص منصوبہ بندی کا بدنما مجموعہ تھا۔ استنبول بین الاقوامی شہر ہے، جس میں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں۔ ترکی بھر سے یہاں آنے والے غیر مقامی افراد بھی اس شہر کی آبادی اور ازدحام میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں جب سیاحوں کے غول کے غول یہاں ٹوٹتے ہیں تو سڑکوں پر رش اور جام معمول بن جاتا ہے۔ اردگان نے جو اس شہر کی نظامتِ اعلیٰ کے دوران سفری سہولتوں کے

حوالے سے کئی کارنامے انجام دے چکا تھا، یہ اعلان کیا کہ وہ 80 دن کے اندر جدید ترین بسوں کا بیڑا شہروں کے بیچوں بیچ چلا کر دکھائے گا۔ اس کی حکومت کے نئے نئے دن تھے۔ یہ ایسا دعویٰ تھا گویا کوئی سلطان محمد فاتح کی طرح خشکی میں کشتیاں چلانے کی بات کرے۔

اتنے کم وقت میں شہر کے بیچوں بیچ طویل دو رویہ سڑک کی تعمیر اور اس میں جا بجا اسٹاپ اور بالائی پل، بظاہر مشکلات کی پٹاری کھول کر خود اپنے اوپر بھڑیں چھوڑ دینے والا کام تھا۔ لوگوں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا۔ موافقین اس کی کامیابی کے بارے میں متردد تھے اور مخالفین اسے نیچا دکھانے کے لیے دانت تیز کر رہے تھے۔ یہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں جُت گیا۔ ٹھیکیداروں کو بروقت ادائیگی نے اسے سرخرو ہونے میں آسانی فراہم کی۔ جب 70 دن رہ گئے تو اس نے موقع پر جا بجا اطلاعاتی کتبے لگا دیے کہ اب 10 دن رہ گئے ہیں۔ پھر اُلٹی گنتی شروع ہو گئی۔ استنبول کے شہریوں میں تجسس اور سنسنی عروج پر تھی۔ ہر اگلے دن کتبہ تبدیل ہو جاتا تھا۔ 9 دن، 8 دن۔ لوگ لمحے گن رہے تھے اور ہر گزرتے لمحے پر پوری ترکی کی آنکھیں اور کان لگے ہوئے تھے۔ جس روز ''دو دن باقی ہیں'' کا کتبہ لگایا گیا، اس دن یعنی اٹھترویں روز منصوبے کا افتتاح کر کے بسیں چلا دی گئیں۔ لوگوں کو سہولت کی سہولت اور تفریح کی تفریح میسر آ گئی۔ کیا موافق کیا مخالف، سب اس کی حسن کارگردگی کے گُن گانے لگ گئے۔

استنبول کا کوئی بھی شہری جوان بسوں میں سفر کرتا ہے، وہ اردگان کے کارنامے پر اسے داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صاف ستھری آرام دہ اور جدید بسیں، پیسے اور وقت کی بچت، سب سے بڑھ کر اس کوفت سے نجات جو رش میں پھنس کر ہوتی ہے۔ لوگ گھر سے گاڑی میں آتے ہیں اور محفوظ میدان میں گاڑی کھڑی کر کے آرام سے ماہانہ بنیادوں پر لیے گئے سستے ٹکٹ میں ان بسوں پر سفر کر کے وقت و پیسہ بچاتے اور چڑچڑے پن سے نجات پاتے

ہیں۔ ان بسوں کے ٹکٹ کا نظام بھی انتہائی تیز رفتار اور نسبتا سستا ہے۔ آپ ایک کارڈ لے لیں اور اس کے ذریعے سے خودکار دروازوں سے اندر داخل ہوں جہاں مستعد اور خوش اخلاق عملہ آپ کی رہنمائی کو تیار کھڑا ہوگا۔ راقم کے لیے یہ مشاہداتی سفر دلچسپ تجربہ رہا۔ جب بس سے اترے تو سیر کا شوق تو پورا ہوگیا، لیکن اب اپنے ٹھکانے تک کیسے پہنچیں، یہ مسئلہ بن گیا۔ ایک مقامی شخص سے پتا پوچھا تو اس نے ہاتھ کے اشاروں سے جو ہوسکتا تھا، سمجھایا۔ ہم ابھی تک تردد میں تھے۔ اشاروں کی زبان مبہم جو ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد دوسرے سے بھی پوچھنا چاہا۔ وہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آ کر ہاتھ سے پکڑ لیا کہ چلیں میں آپ کو چھوڑ کر آتا ہوں۔

ہم سے بھی انکار نہ ہوا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ ٹیکسی پکڑنے پر اتفاق ہوگیا۔ ساتھ چل پڑے۔ جب رہائش گاہ پر پہنچ کر ٹیکسی سے اترے تو اس نے ترکی زبان میں ڈرائیور کو پیسے لینے سے سختی سے منع کر دیا اور اصرار کرکے خود پیسے دیے۔ ہم نے بھی اس سے پورا پورا بدلہ لیتے ہوئے اسے کھانے پر روک لیا اور بغیر عشائیہ تناول کیے جانے نہ دیا۔ ایک پڑوسی ترجمان میسر آگیا۔ خوب گزری جب راہ نما و راہ جُو اکٹھے مل بیٹھے۔ ایک یادگار نشست تھی جس میں ترکوں کے پاکستانیوں سے محبت کے تعلق کی وجوہات معلوم ہوئیں۔ چند چشم دید واقعات کے تناظر میں موقع آگیا ہے کہ میں انہیں تفصیل سے بیان کروں۔

☆ ترک عوام کی پاکستانیوں سے محبت معاصر دنیا کا عجوبہ ہے۔ اس وقت جبکہ ہمارے اجتماعی اور عالمی کرتوتوں کے سبب ”گرین پاسپورٹ“ کے حاملین کو دنیا بھر کے فضائی اڈوں پر شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ احترام واکرام تو دور کی بات ہے، ہمارے مسلّمہ بنیادی حقوق بھی پامال کیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں دنیا کے صرف دو ملک ایسے ہیں، جہاں پاکستانیوں کی عزت واحترام ہے: ایک سری لنکا اور دوسرا ترکی۔ دونوں میں راقم

کو جانے کا موقع ملا ہے۔ سری لنکا والے تو طبعاً بھی دھیمے مزاج اور صلح پسند قسم کے مرنجان مرنج لوگ ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے ان کے دلوں میں نرم گوشہ پائے جانے کی وجہ کوئی اتنی قدیم نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ ایک احسان کی بنا پر سری لنکا بھارت کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے کے بجائے واضح طور پر پاکستان کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ البتہ ترک حضرات کی پاکستان سے غائبانہ محبت و حاضرانہ مودت کی جڑیں گہری اور اس کی وجوہات تاریخی ہیں۔

اس اتحاد و یکجہتی کے پیچھے مذہبی و مسلکی موافقت بھی ہے اور سیاسی و روحانی یگانگت بھی۔ جب جنگ عظیم دوم میں یورپی اتحادی طاقتیں سارے تیر ایک ترکش میں جمع کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف متحد ہو گئیں تو ہندوستان کے مسلمانوں نے مثالی ایمانی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا۔ برصغیر میں ''تحریک خلافت'' اور ''تحریک ترک موالات'' اور ''تحریک ریشمی رومال'' جیسی تاریخی تحریکیں چلیں اور یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں کے لیے جن بے مثال ایمانی جذبات کا مظاہرہ کیا اور جس طرح کی قربانیاں دیں اس کو ترک حضرات نے بھلایا ہے نہ بھلائیں گے۔ ہمارے آباء و اجداد اس وقت جو سدابہار پھول ہمارے لیے بو گئے، وہ ہمیشہ کے لیے ایسی خوشبو دیتے رہیں گے کہ ان کی جانفزا مہک ترکوں کو پاکستان اور پاکستانیوں کا گرویدہ بنائے رکھے گی۔ ترک خاندانی قوم ہیں۔ تین براعظموں پر حکومت کرنے والے سلاطین کی اولاد، خاندانی لوگ کسی کی نیکی نہیں بھلاتے۔ ہم لوگوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لیے عثمانی خلافت کے تحفظ کے لیے قربانی دے کر نہ صرف ایک عظیم نیکی کی سعادت حاصل کی تھی، بلکہ عقلاً وسیاستاً بھی ایسی دور اندیشی اور معاملہ فہمی پر مبنی فیصلہ تھا، جس کا پھل ہماری کئی نسلیں کھاتی رہیں گی۔

اس سے بڑی اور کیا بات ہو گی کہ جن ملکوں کی خوشامد کرتے کرتے ہماری کمر دھری اور

عزت داغ داغ ہوگئی۔ وہ ہمارے وزرا اور جرنیلوں کی بیلٹ اور جوتے اترواکر تلاشی لیتے ہیں اور جن ترکوں کو ہم نے قیام پاکستان کے بعد کبھی پوچھا بھی نہیں، وہ قیام پاکستان سے قبل کی ساری نیکیاں پاکستان کے کھاتے میں ڈال کر ہمیں وہ عزت دیتے ہیں جو روح کو سرشار کردے۔ آج جبکہ عالمی برادری میں ہمیں برابری کا مستحق نہیں سمجھا جارہا، آیئے میں آپ کو بتاتا ہوں، ہم گنہگاروں کے بارے میں ترکی میں کیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔

ابتدا تو مجھے حج وعمرہ پر آنے والے ترک حضرات کے رویّے سے کرنی چاہیے، لیکن اس کا مشاہدہ تو آپ سب کرتے رہتے ہوں گے۔ جتنا اس ملک کے زائرین آپ سے خندہ رو، خندہ پیشانی سے ملتے ہیں، اتنا کم ہی کوئی ملتے ہوئے اچھا لگتا ہوگا۔ یہ تو عام مشاہدہ ہے، لہٰذا میں انہی واقعات کا ذکر کروں گا جن میں حج وعمرہ کے متبرک ماحول کا نہیں، عام دنیوی ماحول اور عام غیر جانبدار ذہن کے ترک عوام کے حیرت انگیز محبت آمیز رویّے کا تذکرہ ہوگا۔

راقم پہلے تذکرہ کرچکا ہے کہ سیکولر طبقہ مساوات مساوات کی رٹ لگاتا اور انصاف کا راگ الاپتا ہے، لیکن جتنی ناانصافی اور عدمِ مساوات ان کے ہاں ہوتی ہے، اس کا ذکر بھی اخلاق واقدار کے حاملین کے لیے دکھ اور صدمے کا باعث ہے۔ اسلام پسندوں کا مقبول ترین نمایندہ طیب اردگان جب اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں استنبول شہر کا ناظم بننے میں کامیاب ہوگیا تو اس نے دوسرے حیرت انگیز اور تیز رفتار ترین کاموں کی طرح عوام کے دل جیت لینے والا ایک کام یہ کیا کہ سیکولر دور میں طبقاتی تفریق کی علامت کے طور پر جتنے ادارے سرکاری رقم سے صرف طبقۂ شرفاء کے لیے بنائے گئے تھے، انہیں بلدیہ کی تحویل میں لے کر ازسرِ نو تعمیر کیا اور پھر عوام کے لیے کھول دیا۔ اس طرح وہ تفریحی مقامات جہاں ان عوام کا داخلہ ممنوع تھا جن کے خون پسینے کی کمائی سے عشرت کدے تعمیر کیے جاتے تھے، ان کو صاف ستھری تفریح میسر کردی اور طبقاتی تقسیم کا خاتمہ کرنے میں آسانی ہوئی۔

کچھ احباب شاخِ زرّیں کے کنارے ایسی ایک جگہ لے گئے جہاں جرنیلوں اور سرمایہ کاروں کے لیے مخصوص ساحلی عمارت کو عوام کی طعام گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم جب داخل ہوئے تو صفائی اور نفاست کا معیار قابلِ رشک تھا۔ کسی طرح سے منیجر کو علم ہو گیا کہ پاکستانی مہمان آئے ہیں۔ اپنے کمرے سے اُٹھ کر اس ہال میں آ گیا، جس کے ایک کونے کو ہم نے نشست کے لیے منتخب کیا تھا۔ ذرا قریب پہنچ کر اس نے جس وارفتگی اور از خود رفتگی کے عالم میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے استقبال کیا، وہ نہ بھولنے والی چیز ہے۔ بغل گیر ہونے کے انداز میں جس گرم جوشی سے اس نے ہمیں خوش آمدید کہا، یوں لگتا تھا برسوں کا بچھڑا دوست ہے۔ بعد ازاں اس نے اجازت لی کہ آپ کے لیے ایک خصوصی چیز بنوا کر بھجوانا چاہتا ہوں۔ اس کا خلوص دیکھ کر ہم سے انکار نہ ہوا۔ ایک خاص طرح کی مچھلی بڑی نفاست سے سجا کر پیش کی گئی۔

ابھی اس سے انصاف نہ ہوا تھا کہ خدمت گار ایک اور ترک ڈش لے کر پہنچ گیا۔ پوچھا یہ تو ہمارے کہے گئے میں شامل نہ تھی۔ جواب ملا یہ بھی ہمارے منیجر صاحب کی طرف سے ہے۔ ایک چیز انہوں نے اجازت لے کر اور ایک بغیر اجازت کے بھیجی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں دونوں طرح کا حق حاصل ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اتنا کچھ بھجوا دیا تھا کہ ہمیں اپنا طلب کیا ہوا کھانا ساتھ لے جانا پڑا۔ آخر میں منیجر صاحب رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئے اور کہا کہ میرے لیے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ آج پاکستانی دوست ہمارے ہاں مہمان آئے ہیں۔ ان کا عملہ بھی ہمارے ساتھ خصوصی مہمانوں جیسا سلوک کر رہا تھا۔ یہ بتاتا چلوں کہ اس طعام گاہ کا موازنہ کسی بھی پانچ ستارے والے ہوٹل سے کیا جا سکتا تھا۔ ایسی جگہوں میں تو لوگ مصنوعی مسکراہٹ بھی کفایت شعاری سے استعمال کرتے ہیں۔

اسی دن ہمارے کچھ ساتھی کتابوں کی نمائش سے ذرا تاخیر سے نکلے۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ وہ جہاں کھانے کے لیے گئے وہاں شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔ دُلہا کے والد کو پتا چلا کہ کچھ پاکستانی حضرات آئے ہیں تو وہ انہیں لینے کے لیے آ پہنچا کہ میری خوشی میں شریک ہوں۔ انہوں نے حجاب محسوس کیا اور تکلف کیا۔ وہ کہنے لگا: میرے اور میرے خاندان کے لیے یہ انتہائی نامبارک بات ہوگی کہ پاکستانی دوست یہاں موجود ہوں اور ہمارے خاندان کی تقریب میں شریک نہ ہوں۔ انہیں ناچار حامی بھرنی پڑی۔ اس نے لے جا کر انہیں دُلہا کے ساتھ بٹھایا اور شرکائے تقریب میں بڑے فخر سے اعلان کیا کہ آج ہمارے ساتھ ہماری نیک تمنّاؤں اور خوشیوں میں ہمارے پاکستانی دوست بھی شریک ہیں۔ بتائیے! کسی غیر ملکی کو ہمارے ہاں کھانے کی عام میز سے اٹھا کر شادی کی خاندانی تقریب میں اصرار کے ساتھ شریک کرنے کا کوئی تصور ہے! ترکوں کے ہاں بھی نہیں، سوائے پاکستانیوں کے لیے۔ اور یہ یقیناً ہمارے لیے خوش قسمتی ہے۔ اس سے ہمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ایک تیسرا واقعہ سلطان محمد فاتح کی مسجد کی زیارت کے دوران پیش آیا۔ یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ کا ایک گروپ وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے ہمارا لباس اور حلیہ دیکھ کر پوچھا آپ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ہمارے ساتھی نے بتایا: پاکستان سے۔ اس نے کہا: زرداری کے ملک سے۔ مسٹر ٹین پرسنٹ کے ملک سے۔ یقین کیجیے مجھے تو شرم سے پسینہ چھوٹ گیا۔ البتہ ہمارے ہم سفر دوست نے انہیں بڑی خود اعتمادی سے کہا: زرداری صاحب کو آپ ٹین پرسنٹ سمجھتے ہیں، ہم انہیں ون ہنڈریڈ ٹین پرسنٹ سمجھتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا، دراصل جب کوئی ہمارے سامنے آپ کے حکمران پر پھبتی کستا ہے تو ہمیں بہت برا لگتا ہے۔ نیز ہم جب پاکستان کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہاں دھماکے اور قتل و غارت گری ہو رہی

ہے تو ہمیں بہت صدمہ ہوتا ہے۔ پاکستانی بھائیوں سے کہیں: آپس میں لڑا نہ کریں۔ ہماری خاطر ہی سہی۔ ہمیں دکھ سے بچانے کے لیے صلح کرلیں۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ آپ کا پیغام پاکستانی قارئین تک ضرور پہنچائیں گے۔ اس تحریر کے ذریعے ہم اس امانت کو قارئین تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کررہے ہیں۔ اللہ کرے کہ بیرونِ ملک خصوصاً ہم سے ہمدردی رکھنے والے ملکوں میں ہمارے بارے میں اچھا تاثر پایا جائے اور ہم دشمنوں کے لیے تضحیک اور دوستوں کے لیے صدمے کے بجائے دشمن کے سینے پر مونگ رکھنے اور دوستوں کی دلی خوشی و مسرت کا باعث ہوں۔

تعاقب اور تعاون

☆انتخابات 2013ء کے موقع پر معاصر برادر ملک کے سیاسی تناظر میں لکھی گئی تحریر

پہلے ترکی میں اسلام پسندوں کی کامیابی کے پیچھے کارفرما دو عناصر سنیے گا۔ پھر کوشش کیجیے گا کہ پاکستان میں ان کی تطبیق ہو سکے، شاید ہم ویسے ہی فوائد حاصل کرنے یا دونوں ملکوں کو قریب لانے کی طرف پیش رفت کر سکیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ترکی بھائی ابھی حقیقی کامیابی سے بہت پیچھے ہیں۔ طویل سیکولرازم نے ان کی سماجیات و معاشرت پر اتنے گہرے مغربی اثرات ڈالے ہیں کہ واپسی کے سفر میں ابھی کئی کٹھن مراحل طے کرنے ہیں۔ راقم نے چونکہ قریب سے ان دونوں جہتوں کا مشاہدہ کیا۔ اپنے دُہرے سفر کے دوران سیاحتی مقامات پر بھی جانے کے بجائے صبح شام اس مقصد سے ملاقاتیں، انٹرویو اور مشاہدے کرتا رہا اپنی قوم اور دین دار برادری کو بتا سکوں کہ ہمارے معاصر حضرات کس طرح کھائی کے بیچ تنے ہوئے رسّے پر چلنے میں کامیاب رہے؟ اس لیے جو کچھ لکھ رہا ہوں، وہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات ہے۔ اللہ کرے کہ میں منصفانہ تجزیہ کر سکوں اور حقیقت کے قریب تر بات کہنے میں کامیاب رہوں۔

ترکی کے اسلام پسندوں کو سمجھنے کے لیے وہاں کے سیکولر طبقے سے جو مدد ملی، اس نے

بہت فائدہ دیا۔ راقم ایک دن اپنے دوست احباب سے اجازت لے کر نکل پڑا۔ میرا عزم تھا کہ آج مخالفین کے منہ سے اپنے دوستوں کی غیبتیں سن کر موازنہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ قدرتی طور پر میرا رُخ یونیورسٹی کی طرف تھا اور وہاں سے فارغ ہو کر ترکی کے قہوہ خانوں کی طرف۔ اللہ کا کرنا کہ یونیورسٹی میں ہی ایک سیکولر پروفیسر صاحب مل گئے، لہٰذا قہوہ خانوں میں گیا تو سہی، لیکن ''مشقِ سخن'' کی خاص ضرورت نہ پڑی۔ پروفیسر صاحب کہنہ مشق استاذ اور نیم سیاست دان تھے۔ ان کی گفتگو تو اس بات سے شروع ہوئی کہ ان ''شریعت'' والوں کو ''سعودی عرب'' پیسے دے رہا ہے۔ فقیر کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ بالجبر سنجیدگی طاری کیے رہا۔ پھر جو انہیں میٹھے کھٹے سوالات سے گھیرا تو انہوں نے اسلام پسندوں کی کامیابی کی جو وجوہات باتوں باتوں میں بتائیں، وہ اس دن کی سعی پُر مشقت کا حاصل ٹھہریں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان سعادت یا فضیلت والوں ...... یہ دو وہاں کی اسلام پسند جماعت کے نام رہے ہیں۔ چونکہ ڈاڑھی وہاں کم ہی ہوتی ہے، اس لیے اس مظلوم سنت کو برا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع قوم پرستوں یا بے دینوں کو نہیں ملتا، وہ اس کے بجائے ان کی جماعت کا نام لے کر کوستے رہتے ہیں...... کی کامیابی میں ان کا اتنا ہاتھ نہیں، جتنا ہماری طرف سے ان کے تعاقب کا ہے۔

اس کی وضاحت انہوں نے یوں کی کہ یہ لوگ ہماری کچھ کوتاہیوں کے سبب بلدیاتی انتخابات میں جیت گئے تو انہوں نے جو وعدے کیے تھے، ہم نے ان کا گھیراؤ شروع کیا کہ انہیں پورے کرو۔ ہمارا خیال تھا یہ نااہل ہیں، اپنوں کو نوازیں گے۔ بدعنوانی کریں گے اور جلد ہی لوگ ان سے اُکتا جائیں گے۔ ادھر سے ہوا یوں کہ کچھ ان کا اپنا شوق اور کچھ ہمارا شور، دونوں سے تحریک پا کر (یہ پروفیسر صاحب کی رائے تھی) انہوں نے بہترین خدمات انجام دیں۔ قوم کے سرمائے کو ضائع ہونے سے بچایا۔ اقربا پروری کی روایات کو ختم کیا۔

بدعنوانی کا خاتمہ کیا۔ خود بیرون ملک اثاثہ جات بنوائے نہ دوسروں کو بنانے دیے۔ ان کی مقبولیت بڑھتی گئی اور انہوں نے اپنی اہلیت ثابت کرنا شروع کر دی۔ ہم لوگ اس انتظار میں تھے کہ یہ اپنے وعدے پورے کرنے کے بجائے مذہبیات کے مظاہرے پر زور دیں گے، تب ہم ان کے خلاف طوفان برپا کریں گے۔ انہوں نے بہت دھیمی رفتار سے اپنا سفر جاری رکھا اور قوم کی دنیوی فلاح کے لیے وہ کام کیے جو سیکولر لوگ بھی دل سے چاہتے تھے۔ طیب اردگان جب بیرونی ملک تجارتی معاہدوں کے لیے جاتا تو بڑے بڑے سیکولر ٹائی کون کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ اس طرح سیکولروں کی زبانیں بند ہوتی گئیں۔ ہمارا موقف وزن سے عاری ہوتا گیا۔ یہ لوگ اتنے ہوشیار تھے کہ اسلامی حکمرانی کے سارے فلاحی اصول اپنا رکھے تھے، بس نام اسلام کا نہیں لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی ان کے ساتھ ہوتے گئے یا ان کی مخالفت سے خاموش ہوتے گئے جو ان کے بدترین مخالف شمار کیے جاتے تھے اور ان کے خلاف دانت تیز کر کے موقع کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

پروفیسر صاحب دل کے پھپھولے پھوڑتے جاتے تھے۔ ہم کان لگا کر اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرتے جاتے تھے۔ ہم وطن پاکستانیوں سے گزارش ہے: انہوں نے جن لوگوں کو حالیہ انتخابات 2013ء بھاری اکثریت سے منتخب کیا ہے، ان کو اس کے حال پر چھوڑ کر بعد میں شکوہ شکایت نہ کریں، بلکہ ان کو ان کے وعدے یاد دلاتے رہیں۔ پروفیسر صاحب کے الفاظ میں ان کا تعاقب کریں۔ جو شخص جس شعبے میں مہارت رکھتا ہے اس کے حوالے سے اپنا فرض بھی ادا کرے۔ حکومت کی غلط کارکردگی پر بروقت اصلاحی تنبیہ پر مشتمل آواز بلند کرے اور قوم کو بھی آگاہ کرے۔ پاکستان میں جب زلزلہ آیا تھا تو سب سے زیادہ مخلصانہ امداد ترک حکومت نے دی تھی۔ ایک اطلاع کے مطابق لاہور کے ترقیاتی کاموں کے لیے جن ترک نجی اداروں کے واجبات پاکستانی قوم ادا نہ کر سکتی تھی، وہ برادر ترک حکومت نے

اپنے پاس سے ادا کر کے پاکستانیوں کے بے لوث تعلق کے جذبات کا اظہار کیا۔ اگر ہم اس کے بدلے میں ترکوں کو اپنی کسی صلاحیت سے فائدہ پہنچائیں (دنیوی سرمایہ تو ان کے پاس ہم سے بہت زیادہ ہے) اور ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں تو دونوں ملکوں کا قریب آنا، پورے عالم اسلام کے لیے نیک فال ہے۔ لاہور میں کام کرنے والے کثیر القومی ترک نجی اداروں میں اگرچہ سیکولر بھی ہیں، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا، اسلام پسند حکومت سیکولروں کو بھی برابر کے مواقع دیتی ہے، اسی لیے اس فرق اور حکمت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نہ سب ترکوں کا رویہ قابل تقلید ہے اور نہ سب اسلام پسند سمبل ہیں۔ ہاں! جیسا جو ہے اس کے کردار اور رویے کا جائزہ لے کر اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا اور دوسرے کی خوبیوں سے فائدہ اُٹھانا ہی حضرت لقمان حکیم کی حکمت اور حضرت امام غزالی کے اصلاحی تصوف کا عنوان ہے۔

دوسری بات جو اس فقیر نے فلسطین اور ترکی دونوں کے اسلام پسندوں میں مشترکہ طور پر پائی اور بڑی استقامت کے ساتھ پائی کہ انہوں نے طے کر رکھا ہے، ہم کسی صورت میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں بولیں گے۔ بندہ نے جان بوجھ کر فریق ثانی سے متعلق انتہائی نازک موضوعات یا سوالات چھیڑے، مگر ماشاء اللہ بڑوں چھوٹوں کو اس اصول پر کاربند پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب شرابی ایک دوسرے سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں کہ ’’چھوڑو جی! مٹی پاؤ۔ اکٹھے بیٹھ کر پیتے رہے ہیں۔ اب کیا ایک دوسرے کی مٹی خراب کریں گے۔‘‘ تو ہم حاجی یا نمازی غازی ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا ہم امید رکھیں کہ ہمارے ہاں کی دینی جماعتیں بھی اسی طرح کا رویہ اپنا کر اپنے اپنے کارکنوں اور حمایتیوں کو اچھا پیغام دیں گی۔

عالمی معاشی غارت گروں کی تاریخی شکست

ترکی میں مئی 2013ء میں ہونے والے حکومت مخالف مظاہروں کے پسِ پردہ معاشی
غارت گروں کے استعماری حربوں کی نقاب کشائی

☆

فارسی کی مثل مشہور ہے: ’’خوئے بدرا بہانہ بسیار‘‘۔ ترکی کے سیکولر طبقے کو گیارہ سال تک بے مثال فلاحی کام کرنے والی حکومت کے خلاف مظاہروں کا بہانہ مل گیا ہے۔ ان مظاہروں کا سبب عالمی میڈیا یہ بتا رہا ہے کہ استنبول کے مشہور زمانہ تقسیم اسکوائر میں حکومت نے بارہ درخت اکھڑوا دیے ہیں اور ان کی جگہ تجارتی مرکز کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ اس ظلم عظیم پر انسانوں سے زیادہ جانوروں اور درختوں کے ہمدرد لادین طبقات کو دردِ دل کے اظہار کا موقع مل گیا ہے اور وہ اس سنگدلانہ قتل ماحولیات پر جس میں پورے ایک درجن درخت جڑ سے اکھاڑ دیے گئے ہیں، سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ درخت اکھاڑے جانے کا عمل گزشتہ نومبر میں تقریباً چھ مہینے پہلے وقوع پذیر ہوا تھا اور اس پر احتجاج کا یہ عمل اب شروع ہوا ہے، جب مئی کے مہینے میں باسفورس کینال، استنبول ایرپورٹ اور باسفورس پل جیسے عظیم منصوبوں کے تعمیراتی معاہدوں پر دستخط ہوئے ہیں یا وہ شروع کر دیے

گئے ہیں اوران کے لیے عالمی معاشی غارت گروں سے سودی قرضہ نہیں لیا گیا۔

بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ مظاہرے شراب پر پابندی کی بنا پر ہو رہے ہیں۔ (یہ پابندی اصول تدریج کے تحت فی الحال محدود اور مخصوص ہے) وہی شراب جو اس تقسیم اسکوائر سے ملحقہ تنگ گلیوں میں پانی کی طرح بہتی ہے، لیکن ایسا کہنے سے اسلام پسندوں کے اصل کارنامے اور ان کے اصل دشمن دونوں چھپ جاتے ہیں۔ جب سے طیب اردگان کی حکومت آئی ہے، اس نے عوامی سہولت کے بے شمار وسیع وعریض طویل منصوبے مکمل کیے ہیں۔ ان میں تازہ ترین استنبول کا فضائی اڈہ ہے جو تکمیل کے بعد دنیا کا سب سے بڑا فضائی اڈہ کہلائے گا۔ اس کی تعمیر کے لیے سینکڑوں درختوں کے علاوہ بیسیوں مکانات، دکانیں وغیرہ خطیر معاوضے کے عوض منہدم کی جائیں گی۔ اس طرح ایک دوسرا بڑا منصوبہ جو جدید ترکی کے قیام سے اب تک کا ایک عظیم منصوبہ قرار دیا گیا ہے، باسفورس پر قائم مشہور زمانہ پل کے متوازی ایک پل کی تیز ترین تعمیر کا ہے، جس پر 80 ارب ڈالر لاگت آئے گی اور جسے جدید تعمیراتی دنیا کا عجوبہ قرار دیا جارہا ہے۔ اس سے بھی باسفورس کے کنارے کئی زندہ، جاندار ارتناور درختوں کا علاقہ قتل عام ہوگا، لیکن اس پر لادین عناصر کو کسی طرح کی تشویش ہوئی نہ اس طرح کے عظیم انسانی منصوبوں کے بارے میں جو اسلام پسندوں کی فلاحی وخدمتی سیاست کا خاصا سمجھے جاتے ہیں، کسی کو لب کشائی کر کے اپنے آپ کو ہی کوسنے دلوانے کی جرأت ہوئی، البتہ تقسیم اسکوائر کے غازی پارک میں چند درختوں کی جگہ روزی کمانے اور گاڑیاں کھڑی کرنے کی سہولت اور عثمانی دور کی ایک یادگار کی تعمیر نو نے لادین طبقہ کو کھل کر سامنے آنے پر اکسا دیا ہے، جبکہ یہاں پہلے ہی تاریخی عمارت تھی جس کا نام ''توپچو شکلہ'' تھا۔ یہ پارک اسی تاریخی عثمانی عمارت کو منہدم کر کے بنایا گیا تھا۔

بات صرف اتنی نہیں کی اس یادگار کا تعلق زمانہ خلافت کے عظیم فرمانروا عثمانی سلاطین کی

جہادی یادگار سے ہے، نہ صرف اتنی بات ہے کہ ترکی کی فضائی میزبانوں کو حجاب کی اجازت بھی دے دی گئی ہے، اس پر تقسیم اسکوائر کے وسیع میدان کے ساتھ واقع تنگ گلیوں کے دن کو سونے اور رات کو جاگنے والے مکین سیخ پا ہو کر باہر نکل آئے ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اردگان حکومت کی ذہانت آمیز اور اسلامیت پسندی پر مشتمل معاشی پالیسی کی بنا پر افراطِ زر کی شرح جو 2001ء میں 63 پر تھی، وہ اب گر کر محض 4.67 پر آ گئی ہے۔ اگر یہ شرح 4.5 پر آ گئی تو سود کی شرح 2 فیصد سے بھی نیچے چلی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کے کئی آزاد اور خودمختار ملکوں کو اپنی معیشت عالمی معاشی غارت گروں کے خوفناک جبڑوں سے بچانے کی ایک اعلیٰ مثال مل جائے گی۔ اس پر سودخور لابی اور عالمی معاشی غارت گر، اردگان کے خلاف ہو کر انہی حربوں کے ذریعے موجودہ اسلام پسند حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس سے پہلے وہ کولمبیا، بولیویا، گوئٹے مالا اور وینزویلا وغیرہ میں آزما چکے ہیں۔ شراب پر پابندی اور حجاب کی اجازت کے بعد سود کی شرح تاریخ میں کم تر نقطے پر آ جانے سے انسانیت کے ان دشمنوں کو اپنا مستقبل تباہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ترکی کے قابل اور مخلص حکمران رجب طیب اردگان نے قدرتی آبنائے باسفورس کے متوازی ایک اور مصنوعی آبنائے تعمیر کرنے کے ٹھیکے پر دستخط کر دیے ہیں جو بحر اسود کو بحیرہ مرمرہ سے ملائے گی اور نہر سوئز و نہر پناما کی طرح دنیا کی معیشت اور سیاست کو ایک نیا رُخ دے گی۔ اس سے ترکی کی معیشت میں غیر معمولی انقلاب برپا ہو جائے گا جسے یورپی طاقتیں ہضم نہیں کر پا رہیں۔ نیز استنبول کے جدید ترین اور دنیا کے وسیع ترین ایرپورٹ کی تعمیر سے ترکش ایرلائن اپنی دو حریف عالمی فضائی کمپنیوں پر سبقت لے جائے گی، اس طرح خشکی اور پانی کی طرح فضاؤں میں بھی اسلام پسند ترکی معاصر دنیا کے مدمقابل بلکہ ان سے برتر ہو جائے گا۔ لہٰذا ان استعماری قوتوں نے ''غازی

پارک بچاؤ'' کی تحریک کے نام سے وہ موقع تلاش کرلیا ہے، جس کے لیے وہ گیارہ سال سے تاک میں تھے۔ اس موقع پر وہ بھول گئے کہ اس حکومت نے جو درختوں کے اکھاڑنے اور شراب کے پینے پر پابندی جیسے دہرے ظلم کی مرتکب ہوئی ہے، اتنے وسیع پیمانے پر عوامی فلاحی خدمات کی ہیں کہ پورا ترکی سرسبز اور خوشحال ہوگیا ہے۔ شراب فروشی یا دوسرے بے ہودہ کام کرنے والوں کو روزگار کے اتنے متبادل مواقع فراہم کیے ہیں اور معاشی ترقی کے علاوہ عوام کو اتنی سہولتیں دی ہیں کہ کسی کو ''ام الخبائث'' بیچ کر کالا دھن بنانے اور من کو سیاہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

عربی کی مشہور حکایت ہے کہ بھیڑیے کو ندی کے کنارے بھیڑ کا بچہ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اس پر دست درازی (پنجہ درازی کہہ لیجیے) کا موقع تلاش کرنے کے لیے اس سے کہا: ''تم پانی کو کیوں گدلا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں، مابدولت برلبِ نہر فروکش ہیں۔'' میمنے نے منمناتے ہوئے کہا: ''حضور! پانی آپ کی طرف سے ہوکر میری طرف آرہا ہے۔'' بھیڑیے نے پینترا بدلتے ہوئے کہا: ''تم نے پچھلے سال بھی اسی طرح کی دراز بیانی کی تھی۔'' میمنہ منمنایا: ''جناب والا! میں پچھلے سال تو پیدا بھی نہ ہوا تھا۔'' اس پر بھیڑیے کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے خونخوارانہ انداز میں پنجہ رسید کرتے ہوئے کہا: ''اچھا! اب تم ہم کو جھوٹا بھی کہتے ہو۔'' یہ کہا اور چیر پھاڑ کر کمزور مظلوم کا صفایا کر دیا۔ سیکولر طبقے کی قوت برداشت بھی سود سے نجات، شراب پر پابندی اور حجاب کی اجازت (نہ کہ پابندی) سے جواب دے گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جس حکومت کو چند مظاہروں سے گرادینا چاہتے ہیں، وہ اتنی کمزور نہیں۔ اس کا سربراہ اتنا جرأت مند اور صاحب ایمان ہے کہ اس نے صاف کہا: ''ہم پارلیمنٹ میں واضح اکثریت رکھتے ہیں۔ اجتماعی رائے سے قوانین بنائیں گے۔ اب کھلے عام عوامی مقامات پر شراب فروخت نہیں ہوسکے گی۔ مساجد

کی تعمیر کی جائے گی اور اذان کی آواز بلند ہوگی۔ تقسیم اسکوائر کے حوالے سے حکومت اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر رہے گی، چاہے مظاہرے ہوتے رہیں۔'' جدید ترکی کے حکمران کے اس دلیرانہ ردِعمل کے سامنے معاشی غارت گروں نے ہتھیار ڈال کر پسپائی اختیار کرلی ہے اور جو پیسہ وہ اسٹاک ایکسچینج سے نکال لے گئے تھے اسے آہستہ آہستہ واپس لا رہے ہیں۔ مندی کا رجحان ختم ہو رہا ہے اور حالات دوبارہ معمول پر آگئے ہیں۔

جدید ترکی کی تاریخ کے مقبول ترین حکمران کا یہ اعتماد اور جرأت بے جا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے کئی پہلوؤں سے اپنے عوام کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ باسفورس میں لادین دورِ حکومت میں استنبول شہر میں صاف پانی دستیاب نہ ہوتا تھا۔ گندگی کے ڈھیروں کی وجہ سے قریب سے گزرنا محال تھا۔ آج استنبول یورپ کے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلے میں کھڑا ہے۔ اس میں صفائی اور صحت کے انتظامات دنیا کے کسی متمدن ملک سے کم نہیں۔ ترکی کی معیشت دنیا کی دس بڑی معیشتوں میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے شرح سود گھٹانے اور شرح آمدنی بڑھانے میں بے مثال کامیابی حاصل کی ہے۔ بس یہی وہ جرم ہے جو عالمی اقتصادی دہشت گردوں سے برداشت نہیں ہو رہا اور وہ ہیوگوشاویز کی طرح ایک اور طاقتور اور ذہین حکمران کے سامنے خود کو شکست خوردہ محسوس کر رہے ہیں اور انہیں خطرہ ہے کہ اس طرح تو پوری دنیا ان کے سودی چنگل سے نکل جانے کا راستہ پالے گی۔ راقم الحروف اس صورتِ حال کی طرف ''معاشی غارت گروں'' پر لکھے گئے قسط وار مضامین میں واضح اشارہ کر چکا ہے۔ دوسری طرف تقسیم اسکوائر میں عثمانی سلاطین کی جہادی یادگار اور اس کے ساتھ اسلامی ثقافت کے مرکز کی تعمیر یقینی طور پر تقسیم اسکوائر کے چاروں طرف واقع پراسرار تاریک گلیوں میں منشیات فروشی اور جسم فروشی کا مکروہ کاروبار کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور متبادل روزگار کے مواقع پر ترکی کے انصاف پسند لادین عناصر بھی مطمئن اور خوش ہیں۔

انہیں نظر آ رہا ہے کہ یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو پوری دنیا میں ناپسندیدہ کاموں میں مبتلا لوگوں کے لیے معاشرے کا صالح حصہ بننے کی مثال قائم ہو جائے گی اور دھتکارے ہوئے ان مظلوم مرد و خواتین کو بھی عزت کی زندگی اور وقار کی روزی میسر ہو جائے گی۔ گویا طیب اردگان اپنے انتخاب سے پہلے کیے گئے اس وعدے کو پورا کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں، جو انہوں نے اپنے عوام سے کیے تھے۔ طیب اردگان نے ان مظلوم خواتین سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''اسلام پسند تمہارے حقیقی ہمدرد ہیں۔ یہ تمہیں عزت اور عصمت کی راہ پر چلنے کا سہارا دے دیں گے۔ تب تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟'' خواتین نے اپنا دکھڑا سناتے ہوئے اور روتے ہوئے وعدہ کیا تھا: ''آپ ہمیں ایک مرتبہ طاغوت کے مسلط کردہ استحصالی نظام سے نجات دلا دیں، ہم کبھی آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔'' آج طیب اردگان جب تقسیم اسکوائر میں تجارتی مرکز اور اسلامی مرکز دونوں یکجا بنا کر اپنا وعدہ پورا کر رہا ہے۔ نیز ترکی کو معاصر دنیا پر خشکی، تری اور فضاؤں میں سبقت اور عالمی طاقتوں کی غلامی سے نجات دلانے کے قریب پہنچ گیا ہے تو لادین طبقے کو آگ بگولا ہونے کے بجائے سوچنا چاہیے کہ وہ کب تک عظیم انسانی تاریخ کا وارث ہونے پر فخر کرنے کے بجائے جھوٹے اور فریبی سیکولر نظریات کے اسیر رہیں گے۔

دنیا کا دروازہ

ترکی کے سفر میں ہمیں جن یادگار جگہوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان میں سے تین ''باب العالم''، ''مولوی خانہ'' اور ''پھولوں کا ٹیلہ'' تھے۔ ان جگہوں کا ذکر نہ سیاحت کی کسی کتاب میں ہے نہ کوئی ان کو زیادہ جانتا ہے۔ ان کا تعلق چونکہ خالص نظریاتی و تحریکی سرگرمیوں سے ہے اور یہ عاجز صرف ایسے ہی کاموں اور ایسے ہی مقامات کی جستجو میں گیا تھا، اس لیے یہاں حاضری دینے، مشاہدہ کرنے اور ایمان افروز یادیں ساتھ لے کر لوٹنے میں کامیاب ہوا۔ آج میں چاہتا ہوں کہ قارئین کو ان میں شریک کروں۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔

''باب العالم'' غیر ملکی طلبہ کے لیے ترکی کے اسلام پسندوں کا بنایا ہوا ایک ادارہ ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے طلبہ کو مل بیٹھنے، اپنے اپنے ملّی و قومی مسائل ایک دوسرے کے سامنے پیش کرنے اور مل جل کر مسلم امہ کے اجتماعی مسائل پر غور کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ترکی میں معیار تعلیم اتنا بہتر اور سہولتیں اتنی اچھی ہیں کہ 155 ممالک کے 36 ہزار سے زیادہ طلبہ وہاں زیر تعلیم ہیں۔ ''باب العالم'' جیسے ادارے ان طلبہ کو مثبت سرگرمیوں میں مشغول رکھنے کے ساتھ تنظیم اور اتحاد کی تربیت دیتے ہیں۔ یعنی ناموافق

حالات میں کم وسائل سے بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنا اور مل جل کر متحد ہو کر کام کرنے کا ذہن بنانا۔ یہاں ایک برادرانہ ماحول میں دنیا بھر سے آئے ہوئے ہر رنگ اور نسل کے طلبہ کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ دوسرے مسلم ممالک کے طلبہ کے مزاج اور ماحول کو سمجھ سکیں اور مستقبل میں ان کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔ خلاصہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں یہاں کالج یونیورسٹی کے طلبہ کو امت کے لیے سوچنے اور پوری امت کے ساتھ مل کر جینے کا ذہن دیا جاتا ہے۔

اس غرض کے لیے کوئی باقاعدہ تربیتی نشستیں یا ذہن سازی پر مشتمل مستقل لیکچر نہیں ہوتے۔ ادارے کا ماحول بھائی چارے اور خلوص پر مشتمل ہوتا ہے کہ طرح طرح کی نیتیں لے کر غیر ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والے کا اندرونی میل کچیل آہستہ آہستہ دھلنا اور اس سے ایک روشن ضمیر انسان کی برآمدگی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً: آپ دیکھیں کہ اس ادارے میں جیسے ہی انسان داخل ہوتا ہے، اسے اپنے سامنے ایک بڑا سا اشتہار مختلف زبانوں میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس میں ایک ہی جملہ دہرایا گیا ہے: ''ہم ایک زندہ قوم ہیں۔'' اندازہ لگائیے جہاں کالا گورے سے، چپٹی ناک والا کھڑی ناک والے سے اور سانولے رنگ والا کھلتے ہوئے رنگ والے سے، ایک ہی بات کہہ رہا ہو کہ ''ہم ایک ملت ہیں'' ہمارے مسائل، خوشی اور غمی، کامیابی اور ناکامی ایک ہے، وہاں انسان کی روح سرشار ہوگی یا نہیں؟ پھر آپ آگے جائیں تو آپ کو یہ محبت بھرا رویہ دیکھنے کو ملے گا کہ غیر ملکی طلبہ کو غیر ملکی نہ کہا جائے، ''مہمان طلبہ'' کہا جائے۔ پھر آپ اندر جائیں گے تو ایک مشترکہ نشست گاہ کے بعد چھوٹے چھوٹے کمروں میں ہر ملک یا خطے کا ڈیسک بنا ہوا ملے گا۔ افریقا کا الگ، وسطی ایشیا کا الگ، جنوبی ایشیا کا الگ، مشرق بعید کا الگ۔ ہر ملک یا خطے کے طلبہ کی اپنی ذاتی شناخت اور پھر ان شناختوں کی خوبصورتی ساتھ لے کر اجتماعیت میں مدغم ہو جانا، اس تربیت گاہ کی بنیادی سوچ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے، اجتماعی سوچ

اور اکٹھے ہو کر کام کرنے کا مزاج نہیں ہے۔ ہمارے ایک منہ پھٹ اور ضمیر فروش قسم کے حکمران خود کو اتاترک کے پس خوردہ کا شوقین بتاتے تھے اور انہوں نے اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہمیں ’’سب سے پہلے پاکستان‘‘ کا نعرہ دیا تھا، جبکہ ان کے مثالی ممدوح ملک میں ’’سب سے پہلے اُمت‘‘ کا یہ تصور دینے کی محنت دیکھ کر انسان مسرت انگیز حیرت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ہم جب اس ادارے میں داخل ہونے لگے تو چند نوجوان اسٹینڈ اور ان کے دوسرے چند ساتھی تصویروں کی چھوٹی سی نمائش اٹھائے اندر داخل ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ دن بھر یہ اسٹینڈ لے کر ان پر تصویریں جما کر شہر کے مختلف مصروف مقامات کی سڑکوں کے کنارے نصب کر دیتے ہیں۔ ان میں شام کے مظلوم مسلمانوں کی حالت زار کو مختلف زاویوں سے دکھایا گیا ہے۔ خاموشی اور سلیقے سے ترک قوم کو پڑوس میں ٹوٹنے والی قیامت سے آگاہی کا یہ عمل دن بھر جاری رہا ہے۔ اب یہ سارا سامان واپس لے آئے ہیں۔ کل یہی سامان دوسرے ملک یا خطے کے طلبہ لے کر دوسری طے شدہ سڑکوں پر جائیں گے اور شام کے مسلمانوں کے لیے غائبانہ ذہن سازی کا یہ عمل باری باری دُہرائیں گے۔

دوسری مرتبہ جب ہم اس ادارے میں گئے تو جمعہ کا دن تھا۔ دروازے کے قریب ایک معمر ترک نے ہمیں پہچان لیا اور ترکی میں کہا: ’’جمعہ کے دن کی تمام خیر آپ کو نصیب ہو۔‘‘ ہم نے ترکی کا یہ جملہ یاد کر لیا اور نماز تک کئی ملنے والوں کو ان کی زبان میں یہ دعا دی۔ جگہ جگہ مسکراہٹیں بکھرتی اور پھلجڑیاں چھوٹتی رہیں۔ اس مرکز میں عربی اور ترکی کی مفت تدریس ہوتی ہے۔ مطالعاتی اور تفریحی دورے ہوتے ہیں۔ خصوصاً عید کے دن تمام ’’مہمان طلبہ‘‘ کے لیے ایسی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں کہ انہیں گھر سے دوری کا احساس نہیں ہوتا۔ جب مہمان طلبہ کو سند ملتی ہے یا تعلیم مکمل کر کے واپس جاتے ہیں تو اس ادارے میں ان کے اعزاز

میں تقریب منعقد کی جاتی ہے اور انہیں ایسے اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا ہے کہ ان کے اپنے بھی کیا ان کی خوشی میں شریک ہوتے ہوں گے؟ اس رویّے کو دیکھ کر غیر مسلم طلبہ بھی آہستہ آہستہ اسلام کے قریب آتے ہیں اور پھر مسلمان بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کئی غیر مسلم طلبہ محض حسن سلوک اور حسن اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے ہیں۔ یہاں کی سرگرمیوں میں سب سے بہتر اور مفید وہ لیکچرز ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں مسلم اُمہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے حوالے سے دیے جاتے ہیں۔ ترکی زبان کی ایک موٹی سی کتاب میں یہ ساری معلومات جمع ہیں۔ اللہ کرے کسی طرح دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو جائیں۔ اس طرح کے اور ادارے بھی دوسرے ناموں سے کام کر رہے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ اگلے دس یا بیس سالوں میں اس طرح کی تربیت گاہوں میں تیار ہونے والے طلبہ دنیا بھر میں ایک دوسرے سے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کام کرنے کے لیے پرعزم جماعتوں کی شکل میں بکھرے ہوں گے۔

گولڈن ہارن کے کنارے

ایک دن ’’شاخ زرّیں‘‘ (گولڈن ہارن) کے کنارے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک تفریح گاہ قسم کی عمارت میں ’’درس قرآن‘‘ جیسی تقریب ہو رہی ہے۔ تعجب ہوا اور دماغ میں تجسس سمایا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ اس عمارت کا دورہ کرنے کی ٹھان لی۔ معلوم ہوا کہ یہ قدیم زمانے کا متروکہ ’’مولوی خانہ‘‘ ہے جسے موجودہ محکمۂ اوقاف نے تعمیر نو کے بعد مختلف قسم کی تعمیری سرگرمیوں کے لیے کھول دیا ہے۔ ’’مولوی خانہ‘‘ مقامی اصطلاح میں حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے سلسلۂ تصوف سے منسلک خانقاہوں کو کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ ایک زمانے میں پررونق خانقاہ ہوتی تھی۔ اتاترک کے دور میں دیگر مساجد، مدارس اور خانقاہوں کی طرح اسے بھی مقفل کر دیا گیا۔ آج کل بعض سیکولر کالم نگار انقرہ سے کالم لکھ لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ’’اتاترک‘‘ لادین یا دین دشمن نہ تھا۔ اس کے بعد کے لوگوں نے یہ سب کچھ کیا۔ یہ غلط محض ہے۔ اس نے اپنے دور ہی میں یہ سب کچھ کیا۔ تبھی اس کے جانشین اس سے زیادہ ظالم اور سنگدل تھے اور ہیں۔ جب یہ خانقاہ بند تھی، اس زمانے میں خدا جانے دیدہ دانستہ یا کسی کی غلطی سے اس میں آگ لگ گئی۔ اس بارے میں آج تک شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ پوری عمارت جل کر کھنڈر ہو گئی۔ 2005ء میں

اسلام پسندوں کی حکومت نے قدیم یادگار عمارتوں کی فہرست بنا کر انہیں بحال کرنے کا کام شروع کیا تو اسے بھی پرانے انداز پر برقرار رکھتے ہوئے تعمیر و مرمت شروع کی۔ پتھر پر پتھر اور لکڑی پر لکڑی لگا کر اسے از سرِ نو حیات تازہ بخشی گئی۔ اس حیات کا تعلق محض مٹی گارے کی تازہ نقشہ گری سے نہ تھا، بلکہ اسے نوجوانوں کی ایسی جماعت کے سپرد کیا گیا جو اسے خانقاہ نہیں بنا سکی، مگر وہ جو کہتے ہیں انسان ولی نہ ہو تو کوئی بات نہیں، لیکن بالکل خالی بھی نہ ہو۔ اس انداز میں ان نوجوانوں نے اسے درسِ قرآن، بیانات، لیکچرز اور مختلف اجتماعات کے ذریعے مثبت و تعمیری سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ یہاں قدیم اسلامی ثقافت کے احیا اور اسلامی تحریکوں کے ماضی و مستقبل جیسے موضوعات بھی زیرِ بحث رہتے ہیں۔ ہم جب پہنچے تو ایک شاندار ہال میں درس قرآن ہو رہا تھا۔ اسلام پسندوں کی مخصوص نظافت و نفاست اور سلیقہ و تدبیر حاضرین اور ان کو پیش کیے جانے والے ماحضر سے بخوبی جھلک رہی تھی۔ ہفتے کی شام اور اتوار کی صبح اس قسم کی محفلیں ہوتی رہتی ہیں۔ ترک اسلام پسند چونکہ بوجوہ دینی شناخت یا علامات کو بہت زیادہ واضح نہیں کر سکتے، اس لیے وہ مختلف عنوانات سے نوجوانوں کو جوڑنے اور دھیرے دھیرے دوستانہ موانست پیدا کر کے نظریاتی موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات کو میں تین مثالوں سے سمجھانا چاہوں گا:

(1) ایک مرتبہ یہاں استنبول کا ناظم نوجوانوں کو یہ سمجھانے کے لیے آیا کہ استنبول شہر میں کون سے تاریخی ورثے ایسے ہیں جن کی حفاظت ضروری ہے۔ ''استنبول فہمی'' کے نام سے یہ مجلس ''خلیج فورم'' کے عنوان سے ہوئی۔ بظاہر اس میں دین کی کوئی بات نہیں، لیکن یہ سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں کہ یہ تمام عمارتیں کسی نہ کسی حوالے سے اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتی تھیں اور نوجوانوں کی ان کی طرف متوجہ کرنا درحقیقت مذہبی ثقافت کے احیا کی کوشش ہے۔

(2) اس عمارت میں فقط دینی بیانات ہی نہیں ہوتے، چند دن پہلے ایسا اجتماع بھی ہوا

تھا جس میں نوجوانوں کو اس موضوع سے آگہی دی گئی تھی کہ آپ حکومت کی طرف سے مختلف مقاصد، مختلف شعبہ جات، مختلف طبقات اور مختلف تجارتوں اور صنعتوں کے لیے مختص کی گئی رقم کن اصولوں اور طریق کار کے تحت حاصل کر کے اپنے مستقبل کے منصوبوں میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ کم سے کم محصول اور زیادہ سے زیادہ نفع دینے والے منصوبوں سے آگاہی کے بعد ان پر عمل درآمد کے لیے عملی مدد بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے اگلے اجلاس کے متعلق اطلاع تھی کہ وزیر خارجہ کا مشیر آ کر افریقا میں سرمایہ کاری کے مختلف منصوبوں کے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں جب کسی نوجوان کو اتنی معاونت فراہم کی جائے، بدلے میں نہ اسے کسی جماعت میں شرکت پر مجبور کیا جائے، نہ معروف معنوں میں دینداری کی شرط ہو، تو وہ خود بخود ذہن لینا شروع کرے گا یا نہیں؟ یہ ہم میں اور معاصر ترک اسلام پسندوں میں بہت بڑا فرق ہے کہ وہ اپنے رفقائے کار کے دین و آخرت کی فکر کے ساتھ دنیا اور معیشت بنانے کی منصوبہ بندی بھی کرتے ہیں۔

(3) تیسری مثال یہاں.........یعنی سمندر کنارے تفریح گاہ.........میں آنے والے ان نوجوان طلبہ کی ہے جنہیں مختلف محلّوں میں شام کے اوقات میں بچوں کی مفت تعلیم و تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ان کو اسکول کے دو مضامین پڑھانے کے ساتھ سیرت کے حوالے سے گھنٹے گھنٹے کے 40 لیکچر دیے جاتے ہیں جو انہوں نے بچوں کے سامنے دینے ہوتے ہیں۔ کسی بھی محلّے کے باشندے کسی بھی گھر میں سات بچے جمع کر لیں تو یہاں سے ایک قابل نوجوان معلم انہیں مفت دو مضمون پڑھانے بھیج دیا جاتا ہے جو سیرت و کردار سازی کے حوالے سے بھی ان پر محنت کرتا ہے کہ فی الحال کسی جبر اور مجبوری سے شکل و صورت اسلام کے مطابق نہ بھی ہو تو ذہن و سوچ تو شریعت کے مطابق ہو۔ اس پر تو کوئی قدغن نہیں لگا سکتا۔ یہ نوجوان بھی بچوں کو کسی مخصوص جماعت یا تنظیم میں شمولیت کی دعوت نہیں

دیتے۔ بس ان کے معیارِ زندگی کے مطابق ایک مخصوص اجتماعی سوچ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کا کوئی نام یا عنوان نہیں، لیکن بالآخر اس فائدہ آخر کار اسلام اور اسلام پسندوں کو ہی کسی نہ کسی شکل میں آج یا کل مل جاتا ہے۔

اس عمارت میں ہم داخل ہوئے تو ایک طرف مسجد اور سامنے دوسری طرف ''سلام خانہ'' تھا۔ استقبالیہ کو یہ نام دیا گیا تھا۔ آگے بڑھے تو سمندر کنارے شاندار ہال اور اس کے مقابل دوسری طرف قطار میں مختلف کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس ایک چھتری تلے 26 مختلف قسم کے اجتماعی اور تحریکی کام جاری تھے۔ ان کمروں کے آخر میں بالکل سرے پر ''لنگر خانہ'' تھا۔ معلوم ہوا کہ جب یہاں تصوف اور روحانی تربیت کا نظم تھا، تب ہر آنے والے سالک کی تربیت کا آغاز لنگر خانے میں خدمت سے ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد درجہ بہ درجہ آگے کے کمروں میں جگہ دی جاتی تھی۔ لنگر خانے کو اندر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پرانے زمانے کی چوڑی چوڑی دیواروں میں محراب نما طاقچے اور ان میں دیگ دھرنے کے بڑے بڑے چولہوں کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ تعمیر نو کے بعد اسے مطالعہ گاہ بنا لیا گیا تھا۔ ہمیں موقع ہاتھ لگا تو یہاں موجود ایک نوجوان سے تفصیلی بات چیت ہوئی اور ان بہت سی باتوں کی تصدیق ہوئی جو اوپر دوسرے حضرات سے سن کر درج کی گئی تھیں۔ جہاں اس وقت سمندر کے کنارے بڑا ہال ہے، یہ خانقاہ کی مرکزی عمارت تھی۔ اس میں آج تک دیواروں کے سرے پر چھت سے ذرا نیچے خوبصورت ترین خطاطی میں مرشد رومیؒ کے فارسی اشعار چاروں طرف تحریر تھے۔ چشمِ تصور سے دیکھا جا سکتا تھا کہ سمندر کنارے اس پر فضا مقام میں جب عظیم مشائخ کی موجودگی میں یہ اشعار پڑھے جاتے ہوں گے تو کیا سماں بندھتا ہوگا اور اس محفلِ سماع میں سالکین پر کیسا وجد و کیف طاری ہوتا ہوگا؟ ہم نے گھوم پھر کر ہال کے مختلف حصے، بالکونیاں ملاحظہ کیں۔ نیچے بچھے قالین اور ان پر دھری میز کرسیاں وغیرہ اور ان میزوں پر

خوبصورت میز پوش، اتنی لطافت ونفاست سے آراستہ تھیں کہ کسی بھی معیاری آڈیٹوریم سے بدرجہا بہتر تھیں۔ سامنے دیوار پر آج کے درس کا عنوان بڑے لفظوں میں تحریر تھا۔ ترکوں کا کمال یہ ہے کہ دین کی دعوت ہو یا دنیاداری کا کوئی شعبہ، کام بڑے ڈھنگ اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ یہاں آنے والے سامعین کے لیے آرام دہ نشستیں، جدید سمعی وبصری آلات، پرتکلف ماحضر، مسحورکن ماحول، خوش اخلاق تحریکی کارکن، غرض کہ بہت سے چیزیں ایسی ہیں جو مل جل کر نو وارد پر مطلوبہ اثرات قائم کر ہی دیتی ہیں اور منتظمین کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

پھولوں کا ٹیلہ

ایک دن ہمیں ’’پھولوں کے ٹیلے‘‘ کی سیر کا موقع ملا۔ قارئین سمجھتے ہوں گے کہ یہ کسی تفریحی مقام کا نام ہے۔ یہ ایک تحریکی مرکز کا علامتی نام ہے اور ان متعدد تحریکی مراکز میں سے ہے جو ترکی میں ہر طرف محلوں کی سطح پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے منسلکہ کارکن ڈاڑھی ٹوپی کے بغیر اور اپنے آپ کو متشرع ظاہر کیے بغیر نظریاتی ذہن سازی کے کام میں جڑے ہوئے ہیں۔ ’’پھولوں کا ٹیلہ‘‘ فرض کر لیجیے کہ ایک فرضی نام ہے۔ یہ دراصل محلے کی سطح پر ایک بیٹھک، بلکہ یوں کہہ لیجیے ذرا لمبی چوڑی بیٹھک ہوتی ہے۔ اس میں کچھ حصہ نماز کے لیے وقف ہے، کچھ کتب خانے کے لیے، کچھ ہلکے پھلکے کھیلوں کے لیے، اور کچھ میں ٹیبل کرسی لگے ہوتے ہیں تاکہ بچے یا نوجوان وہاں بیٹھ کر فارغ وقت کسی مثبت سرگرمی میں گزاریں۔ ہفتہ واری درس قرآن کے وقت یہ سارے حصے مشترکہ سماعت گاہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف ترکی کا مخصوص قہوہ خانہ ہوتا ہے، جہاں سے ’’ترکی چائے‘‘ مع لوازمات فراہم کی جاتی ہے۔ ترکی میں جب زبان بندی کا جبری دور اس حد تک ظالمانہ تھا کہ لوگ تیسری منزل پر بیٹھے کوئی بات کرتے ہوئے کھڑکی کھول کر جھانک کر دیکھتے تھے کہ کوئی سن تو نہیں رہا، اس زمانے میں دین و مذہب کی طرف رجوع کے عمل کی بنیاد اس طرح کی بیٹھکوں نے بھی

رکھی۔ کام کا آغاز روشنی والے ایک کھمبے کے نیچے بیٹھ کر کیا گیا۔ بس دو ساتھی آمنے سامنے بیٹھ کر دین اور اہل دین کی حالتِ زار پر کڑھتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ کیا کیا جائے؟ اس فکر میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت ڈالی کہ آج اس طرز کا کام قریہ قریہ، بستی بستی ہو رہا ہے اور بچوں، نوجوانوں، خواتین اور ادھیڑ عمر حضرات میں الگ الگ ہو رہا ہے۔ اس کام سے تعلیم، تربیت، تصوف، فلاحی خدمات، سیاست اور جہاد فی سبیل اللہ کوئی شعبہ ایسا نہیں، جسے تقویت نہ پہنچ رہی ہو۔

میں اس ڈھکے چھپے تعارف کی ابتدا اس بیٹھک سے کروں گا جہاں محلے کے ہر سطح کی عمر کے لوگ شام ڈھلتے ہی جمع ہو جاتے ہیں اور انسانی دلچسپی کے مختلف موضوعات کے علاوہ ان مسائل پر بحث کرتے ہیں، جو اس وقت کرۂ ارض کے باسیوں کو درپیش ہیں۔ جہاں کوئی مسئلہ ہے اس کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور مسلمان اسے کسی طرح حل کر سکتے ہیں؟ اجتماعی مسائل کے علاوہ کارکنوں کے ذاتی اور محلے کی سطح کے مسائل کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ترک اسلام پسندوں میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر کارکن کو معاشی منصوبہ بندی میں مدد کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بے لوث مدد اور ہر طرح کا تعاون کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ گھریلو اعتبار سے ایک مطمئن شخص ہی تحریکی اور اجتماعی کام میں بے دھڑک حصہ لے سکتا ہے۔ معاشی پریشانیوں کا شکار انسان کتنا ہی مضبوط تحریکی کیوں نہ ہو، کچھ عرصے بعد ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی بیٹھکوں میں ہر شریک کے نجی مسائل اور ان کا حل بھی زیرِ غور لایا جاتا ہے۔ بیٹھک کا اندرونی نقشہ میں بیان کر چکا ہوں۔ بیرون میں بس ایک چھپر یا سائبان سا ہوتا ہے، جس کے نیچے کھلی ہوا میں دورویہ سنگی نشستیں دھری ہوتی ہیں۔ ایک طرف حمامات وغیرہ اور وضو کا انتظام ہوتا ہے۔

اب بیٹھک سے نکل کر ذرا ساتھ والے ہال کی طرف چلتے ہیں۔ یہاں نوجوان بچوں

کے لیے کراٹے وغیرہ جسمانی ورزش سکھانے کا انتظام ہے۔ راقم کو سیہان انعام اللہ خان سے نیاز مندی حاصل رہی ہے۔ اس لیے اس فن کو تھوڑا بہت سمجھتا ہوں اور اس کے مختلف انداز میں سے دل لگی کے بہانے اور حقیقی مقابلے کو بھی کافی حد تک جانتا ہوں۔ چند ثانیے وہاں گزارتے ہی اندازہ ہوا کہ کافی جاندار طرز حرب ہے۔ ان کے استاد سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں سے ہے، جنہوں نے باسفورس تیر کر پار کیا ہے۔ ترک حکومت ہر سال گرمی میں باسفورس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تیراکی کا مقابلہ کرواتی ہے۔ امیدواروں کی جسمانی حالت کے مختلف طریقوں سے جائزے لیے جاتے ہیں۔ بعدازاں انہیں ممتحنین اور حفاظتی عملے کی نگرانی میں مقابلے میں شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس مقابلے میں ترکی بھر سے شوقین افراد شرکت کرتے ہیں اور جیتنے والوں کو خصوصی انعامات دیے جاتے ہیں۔ کراٹے کا یہ استاد ان اعزاز یافتگان میں سے تھا، جنہوں نے یہ لمبی چوڑی آبنائے تیر کر پار کی تھی۔

نوجوانوں کے اس مرکز سے فارغ ہو کر بچوں کی شامیں اچھی صحبت اور مفید سرگرمیوں میں مشغول رہنے کے لیے قائم کیے گئے مرکز میں جانا ہوا جو قدرے فاصلہ پر کئی منزلہ عمارت کے تیسرے مالے میں تھا۔ اندر داخل ہوئے تو اُلٹے ہاتھ ایک قطار میں ایک چھوٹی سی سماعت گاہ اور دو درس گاہیں تھیں۔ سماعت گاہ میں ترتیب سے نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں بچوں کے تقریری مقابلے یا مہمان مقررین کے بیانات ہوتے تھے۔ درس گاہوں میں ان دو مضامین کی دُہرائی ہوتی تھی جو بچے دن کو اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور عموماً دنیا بھر کے بچے اس میں کمزور ہوتے ہیں یا انہیں ان میں اضافی تدریس کی ضرورت ہوتی ہے: یعنی ریاضی اور سائنس۔ ایک طرف کھیلوں کا انتظام تھا۔ اس کے ساتھ کمپیوٹر لیب بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کے رنگ و روغن، فرش کی صفائی اور نظافت کا معیار وہی تھا جو ترکی کے تعلیمی

اداروں کی شناخت بن چکا ہے۔ چند ساعتیں یہاں گزار کر نیچے اترے تو ادھیڑ عمر کے ان بزرگوں سے ملاقات ہوگئی جو اس سارے نظام کی سرپرستی کرتے اور اسے چلانے کے لیے مالی معاونت فراہم کرتے ہیں۔ یہ اسی محلے کے خوش مزاج معمر ترکوں کی ایک جماعت تھی جس نے ہنستے مسکراتے ہمارا استقبال کیا اور بزرگانہ شفقت سے بھرپور رویّے کے ساتھ کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارا۔

محلے محلے کی سطح پر قائم ان جماعتوں کا عوام اور محلے داروں سے رویّہ اتنا اخلاقی ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی سے تمام اہل محلّہ خود کو محفوظ سمجھتے ہیں اور اپنے بچوں کو ان کی تجویز کردہ سرگرمیوں میں بھیجتے ہوئے خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ان کارکنوں کا نہ کوئی نام ہوتا ہے، نہ مخصوص شناخت۔ اسے انہوں نے ایک کلب کے طور پر حکومت سے منظور کروایا ہوا ہوتا ہے اور یہاں بظاہر نماز اور ہفتہ واری درسِ قرآن کے علاوہ وہ تمام سرگرمیاں وہی ہوتی ہیں جو کسی سماجی کلب میں ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت ایمان وعزم اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفادات کی فکر کا وہ بیج بو دیا جاتا ہے جس کے برگ و بار انتہائی خوشبودار اور جان فزا ہیں۔

ہم جس بیٹھک میں گئے اس کا سرکاری طور پر منظور شدہ نام ’’چاند کی روشنی‘‘ تھا۔ اس طرح کی روشنیاں محلے محلے کی سطح پر پھیلانا ترک اسلام پسندوں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ ان کی سیاسی تحریک ان کے دفتروں اور سیاسی قائدین کے بیانات کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ اس طرح کی بیٹھکوں کی مرہونِ منت ہے۔ جہاں محلے کے باہر سے آنے والے کو بھی فوراً سب مل کر ’’وصول‘‘ کر لیتے ہیں اور جب کوئی شخص اس کام میں منجھ جائے تو اسے دوسرے محلے والوں کی تربیت اور رہنمائی یا دوسرے لفظوں میں وہاں ’’بیٹھک‘‘ کے آغاز کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

میں نے ان حضرات سے چند سوالات کیے: ملاحظہ فرمائیے، مختصر اور معنی خیز جوابات۔

(1) آپ لوگ کس نکتے پر جمع ہوتے ہیں؟ جواب: سورۂ انفال کی آیت 63 پر۔

(2) کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ جواب: اسلام کو کیسے سیکھا اور سمجھا جائے؟ مسلمانوں سے کس طرح مل جل کر رہا جائے؟

(3) محلے کی سطح پر کام کرنے پر کیوں اصرار ہے؟ جواب: محلے کے ہر شخص کا ذہنی رجحان اور تحریکی قابلیت سب کے سامنے ہوتی ہے۔ وسائل کم درکار ہوتے ہیں۔ جنس اور عمر کے فرق کو پاٹنا آسان ہوتا ہے۔ مرد مردوں کو، خواتین خواتین کو، بچے بچوں کو دعوت دیتے ہیں۔ دشمن کے گھس بیٹھنے کا امکان کم ہے اور گھس جائے تو اصلاح آسان ہوتی ہے۔

(4) اس محنت کا پرنالہ کہاں جا کر گرتا ہے؟ جواب: اُمت کے اجتماعی مفادات کی جھیل میں۔

(5) مخالفین سے کیسے نمٹتے ہیں؟ ان کو اپنا مخلص اور بے ضرر ہونا سمجھاتے ہیں۔ کسی قسم کا بحث ومباحثہ نہیں کرتے اور بات یہ ہے نیک کام میں ہر طرح کے مخالفانہ سلوک کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ”ایک حد کے بعد تمام مشکلات اور رکاوٹیں خود ختم ہو جاتی ہیں۔“

اب آپ اس آخری جملے پر غور فرمائیے، جو میری بیاض میں ”واوین“ کے درمیان درج ہے۔ کیا معرفت بھرا اور نبوی دعوت کے مزاج کا حامل فقرہ ہے۔ جس قوم کے عام بے ریش لوگ اور عوامی مخلوق، جنہیں درسِ قرآن کے لیے عالم بھی میسر نہیں، اس طرح کی گہری بنیادوں والے کام گلی گلی کر سکتے ہیں، اس قوم کو دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنا بھائی خصوصاً پاکستانیوں کو اپنا چچا زاد بھائی کہنے اور اسے نبھا کر دکھلانے سے کون روک سکتا ہے؟

ٹوپی اور تلوار

آج راقم الحروف آپ کو اپنی زندگی کے یادگار واقعات میں سے ایک واقعہ سناتا ہے۔ ماضی قریب میں ہمارے ہاں کمیونزم کی فکری و عسکری یلغار رہی، جبکہ ترکی میں سیکولرازم کی۔ ہم لوگوں نے الحمدللہ کمیونزم کے فکری و حربی حملوں کا ڈٹ کر سامنا کیا اور سرخ ریچھ کو واپس اس کے برفستان میں پہنچا کر چھوڑا۔ البتہ سیکولرازم کے طریق کار اور حربوں سے ہمیں اتنی واقفیت نہیں، جتنی ہمارے ترک بھائیوں کو رہی ہے۔ ہم نے اپنے معاشرے کو اس باطل نظام کی گرفت میں آنے سے بچانا ہے تو آپ کو ترکی میں اسلام کی بازیافت کے لیے ہونے والی جدوجہد کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ راقم الحروف ایک سے زائد مرتبہ ترکی جا چکا ہے، لیکن اب تک آیا صوفیہ دیکھنے بھی نہیں گیا، جبکہ وہ ہم سے کچھ بھی دور نہ تھا۔ میرا نظریہ یہ تھا کہ اسے تو سلطان محمد فاتح نے فتح کر لیا تھا، اب جبکہ اس کے شہر کو عجائب گھر یا منظر گاہ بنا دیا گیا ہے تو دوبارہ مسجد بنانے کی جدوجہد کرنے والوں کے طریق کار کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ سیر سپاٹے سے کیا حاصل ہونا ہے؟ پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس پورے سفرنامے میں سفرنگاری کے بجائے منظرنگاری ہے اور ایسی ہے کہ اس منظرنامے میں کہیں بھی سیر و تفریح، زیارت و ملاقات، دعوت و تقریب کا ذکر نہیں، کوشش کی گئی ہے اسے معنی خیز اور پیغام رساں کی تحریر

بنایا جائے۔ فائدہ پہنچانے اور دلوں کو بدلنے والی ذات تو وحدہ لاشریک کی ہے۔

ایک دن ہم استنبول کے ''حیّ الصالحین'' یعنی اسماعیل آغا نامی محلے میں سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام حضرت اسماعیل آغا آفندیؒ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر نکلے تو سامنے واقع ٹوپیوں، پگڑیوں اور جُبّوں کی دکان میں جاوارد ہوئے۔ حسب توفیق وحسب منشا خریداری سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ بارش نے آلیا۔ ہم دُکان سے نکل کر اس کے بیرونی سائبان تلے کھڑے ہوگئے۔ اب کیفیت یہ تھی کہ ہماری پشت پر دُکان تھی اور سامنے مسجد کا دروازہ، اور ہم کھڑے بارش رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے مسجد کے دروازے پر ایک شخص کھڑا غبارے بیچ رہا تھا۔ یہ عام غبارے نہ تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اس نے ایک بڑے سے بورے میں لمبے لمبے ڈنڈے نما غبارے بھر کر بائیں بازو سے لٹکائے ہوئے تھے۔ یہ لمبے لمبے غبارے وہ گھر سے تیار کر کے لایا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے ان کو بورے سے نکالتا، اور ہاتھوں ہاتھ، فٹافٹ، تیزی اور مہارت سے ان کو مختلف شکلوں میں ڈھال کر بچوں کو دیتا۔ احقر نے غور کیا تو وہ دو ہی چیزیں بنا رہا تھا۔ تاج نما ٹوپی اور دستے والی تلوار۔ لمبے سے غبارے کو وہ چابکدستی سے لپیٹ لپوٹ کر لمحوں میں طغرے والی ٹوپی یا دستہ والی تلوار میں تبدیل کر دیتا تھا۔ یہ تماشا ابھی جاری تھا کہ ایک اور چیز کا احساس ہوا۔ یہ شخص یہ غبارے بچوں کے علاوہ بڑوں کو بھی دے رہا تھا اور مفت بغیر کسی قیمت کے گویا بانٹ رہا تھا۔ راقم نے اپنے ایک ساتھی کو کہا: ''آپ قریب جا کر دیکھیں کیا ماجرا ہے؟ غبارے والے کا ایک غبارہ پھٹ جائے یا ضائع ہو جائے تو اس کا صدمہ کم نہیں ہوتا، یہ کیسا سخی بادشاہ قسم کا غبارہ فروش ہے کہ ہر آنے جانے والے کو مفت بانٹے جا رہا ہے۔'' ساتھی قریب گئے تو اس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو تلوار اور دوسرے کو ٹوپی تھما دی۔ انہوں نے پیسے دینے چاہے تو وہ انہیں مسکراہٹوں سے نواز کر دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان حضرات نے واپس

آ کر تصدیق کی کہ اس کے غبارے صرف ٹوپی اور تلوار کی شکل میں ہیں اور یہ کسی سے پیسے نہیں لے رہا۔ بلا معاوضہ پکڑائے جا رہا ہے۔ ایک عجیب بات یہ بھی بتائی کہ جب ہم نے اس سے پوچھا آپ پیسے کیوں نہیں لے رہے؟ تو اس وقت اس سے ایک راہ گیر بچہ غبارہ لے رہا تھا۔ اس نے بچے کے رخصت ہونے تک کوئی جواب نہ دیا اور جب وہ دور چلا گیا تو بتایا کہ شاید کوئی یتیم بچہ بھی ان میں ہو اور وہ خوش ہو کر مجھے دعا دے دے، اس لیے مفت تقسیم کرتا ہوں اور بچے کے سامنے اس لیے نہ دیا کہ کہیں وہ یتیم ہو تو اس کی دل شکنی یا بے توقیری نہ ہو جائے۔

صورتِ حال تجسس کو بڑھانے والی تھی۔ کئی قرائن صاف بتاتے تھے کہ یہ محض اس نے ہمیں مطمئن کرنے کے لیے ایک ضمنی وجہ گھڑی ہے۔ وہ تو بڑوں کو بھی بلا روک ٹوک غباروں سے نواز رہا تھا۔ پھر یتیموں کو ہی دینا تھا تو یہ پوش علاقہ ہے یہاں اتنی اکثریت سے یتیم کہاں؟ نیز ٹوپی اور تلوار دو ہی چیزوں پر اکتفا و اصرار کیوں؟ راقم نے اس کے غباروں کا بورا نما ''دستی گودام'' خالی ہونے کا انتظار کیا اور پھر ساتھیوں کو دوبارہ اس کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جا کر کہا ہمارے ساتھ ایک پاکستانی شیخ ہے۔ وہ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تب تک خالی بورا لپیٹ کر جیب میں اڑس لیا تھا۔ مسکراتا ہوا سائبان کے نیچے آ گیا۔ احقر نے چھوٹتے ہی ترجمان سے کہا: ''اس سے کہیں: اب سچ سچ بتائے کیا ماجرا ہے؟'' ترک پاکستانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور خوش مزاج بھی ہوتے ہیں۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ میں نے بھی سڑک کی دوسری طرف سے تاڑ لیا تھا یہ شیخ بارش رکنے سے زیادہ میرے فارغ ہونے کے انتظار میں ہے۔ میں نے پچھلے سوال پر گرہ لگائی: ''آپ نے غریب بچوں کی دعائیں لینی ہیں تو صرف ٹوپی اور تلوار ہی کیوں بناتے ہیں؟ بچے تو دوسری چیزوں سے زیادہ بہلتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بڑی دردمندی اور دل

سوزی سے کہا: ”خلافت عثمانیہ کا سایہ سر سے ہٹنے اور سیکولر نظام کے مسلط ہونے کے بعد ہمارے سر سے عزت کی ٹوپی اتر گئی ہے اور ہمارے ہاتھ سے بہادری اور انصاف کی تلوار چھن گئی ہے۔ میں اس امید پر انہیں یہ کھلونے تھماتا ہوں کہ شاید ان بچوں میں سے کوئی عزت کی یہ علامت اور اس کے حصول کا ذریعہ ہمیں واپس لوٹا دے۔“

اس کا یہ ایمان افروز جملہ سن کر ہم سب تھوڑی دیر کے لیے سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھتے رہ گئے۔ وہ ظاہری اعتبار سے معروف معنوں میں متشرع نہ تھا۔ ڈاڑھی منڈھی ہوئی، پتلون پہنی ہوئی اور عام وضع قطع میں تھا۔ معلوم ہوا کہ استنبول کی بلدیہ میں اچھے خاصے عہدے پر ملازم ہے۔ جیب سے کارڈ نکال کر دکھایا جس میں بلدیہ کا مخصوص نشان تھا جس میں مینار اور گنبد بنے ہوتے ہیں۔ کہنے لگا: ”جب ٹوپی سر پر اور تلوار ہاتھ میں آ جاتی ہے تو گنبد مسجدوں پر سج جاتے ہیں اور مینار افق سے بلند ہو جاتے ہیں۔“ ہمیں حیرت پر حیرت کا جھٹکا لگ رہا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہاں کے اسلام پسند کس حکمت عملی اور تدبر سے عوام کی نفسیات اور سوچ کے انداز کے مطابق عجیب عجیب شکلوں سے کام کر رہے ہیں۔ ہم نے اس سے کہا: ”آپ روز ایسا کرتے ہیں؟ خرچ کہاں سے پورا کرتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”ہفتے میں دو تین دن جگہیں بدل بدل کر یہی کام کرتا ہوں۔ میں نے بڑی محنت سے ان چیزوں کے بنانے میں مہارت حاصل کی ہے۔ جہاں تک خرچ کی بات ہے تو اللہ کا کرم ہے۔ طیب اردگان کی حکومت میں سرکاری افسروں کو بدعنوانی سے روکنے کے لیے بہت کچھ مراعات و سہولیات دی جاتی ہیں۔ میں تو استنبول کی بلدیہ میں اچھے خاصے منصب پر تعینات ہوں جہاں کا ناظم ایک زمانے میں خود رجب طیب اردگان رہ چکا ہے جو اپنے نام کی طرح طیب ہے اور ہم اس کے نام کو گدلانا نہیں چاہتے۔ آپ صبح میرے دفتر میں آئیں۔ بیٹھ کر چائے پییں گے۔“

ہم اس کے دفتر تو نہ جا سکے، البتہ اس کی باتیں اور اس دن کا واقعہ بلاشبہ ایک یادگار تجربہ تھا جو ہمیں اس دن دیکھنے کو ملا اور دعوت میں حکمت اور فکر میں خلوص کے نقش کو دل پر ثبت کر گیا۔ سبحان اللہ! جب ایمان دلوں میں اتر جائے تو بظاہر کتنی ہی پابندیاں لگا لی جائیں، یہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔

☆☆☆

روٹ نمبر 23

ترکی میں اسلام پسندوں کے طریق کار اور کامیابی کی وجوہات کا دلچسپ تجزیہ

☆

استنبول کا کوئی بھی شہری جو ان بسوں میں سفر کرتا ہے، وہ اردگان کے کارنامے پر اسے داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صاف ستھری آرام دہ اور جدید بسیں، پیسے اور وقت کی بچت، سب سے بڑھ کر اس کوفت سے نجات جو رش میں پھنس کر ہوتی ہے۔ لوگ گھر سے گاڑی میں آتے ہیں اور محفوظ میدان میں گاڑی کھڑی کر کے آرام سے ماہانہ بنیادوں پر لیے گئے سستے ٹکٹ میں ان بسوں پر سفر کر کے وقت و پیسہ بچاتے اور چڑچڑے پن سے نجات پاتے ہیں۔ ان بسوں کے ٹکٹ کا نظام بھی انتہائی تیز رفتار، باکفایت اور باسہولت ہے۔ آپ ایک کارڈ لے لیں اور اس کے ذریعے سے خودکار دروازوں سے اندر داخل ہوں جہاں مستعد اور خوش اخلاق عملہ آپ کی رہنمائی کو تیار کھڑا ہوگا۔ راقم کے لیے یہ مشاہداتی سفر دلچسپ تجربہ رہا۔ جب بس سے اترے تو سیر کا شوق تو پورا ہو گیا، لیکن اب اپنے ٹھکانے تک کیسے پہنچیں، یہ مسئلہ بن گیا۔ ایک مقامی شخص سے پتا پوچھا تو اس نے ہاتھ کے اشاروں سے جو ہو سکتا تھا، سمجھایا۔ ہم ابھی تک تردد میں تھے۔ اشاروں کی زبان مبہم جو ہوتی ہے۔ لہٰذا اس

کے بعد دوسرے سے بھی پوچھنا چاہا۔ وہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آ کر ہاتھ سے پکڑ لیا کہ چلیں میں آپ کو چھوڑ کر آتا ہوں۔

ہم سے بھی انکار نہ ہوا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ ٹیکسی پکڑنے پر اتفاق ہو گیا۔ ساتھ چل پڑے۔ جب رہائش پر پہنچ کر ٹیکسی سے اترے تو اس نے ترکی زبان میں ڈرائیور کو پیسے لینے سے سختی سے منع کر دیا اور اصرار کر کے خود پیسے دیے۔ ہم نے بھی اس سے پورا پورا بدلہ لیتے ہوئے اسے کھانے پر روک لیا اور بغیر عشائیہ تناول کیے جانے نہ دیا۔ ایک پڑوسی ترجمان میسر آ گیا۔ خوب گزری جب راہ نما و راہ جو اکھٹے مل بیٹھے۔ ایک یادگار نشست تھی جس میں ترکوں کے پاکستانیوں سے محبت کے تعلق کی وجوہات معلوم ہوئیں۔ چند چشم دید واقعات کے تناظر میں موقع آ گیا ہے کہ میں انہیں تفصیل سے بیان کروں۔

☆ ترک عوام کی پاکستانیوں سے محبت معاصر دنیا کا عجوبہ ہے۔ اس وقت جبکہ ہمارے اجتماعی اور عالمی کرتوتوں کے سبب "گرین پاسپورٹ" کے حاملین کو دنیا بھر کے فضائی اڈوں پر شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ احترام واکرام تو دور کی بات ہے، ہمارے مسلّمہ بنیادی حقوق بھی پامال کیے جاتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں صرف دو ملک ایسے ہیں، جہاں پاکستانیوں کی عزت واحترام ہے: ایک سری لنکا اور دوسرا ترکی۔ دونوں میں راقم کو جانے کا موقع ملا ہے۔ سری لنکا والے تو طبعًا بھی دھیمے مزاج اور صلح پسند قسم کے مرنجان مرنج لوگ ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے ان کے دلوں میں نرم گوشہ پائے جانے کی وجہ کوئی اتنی قدیم نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ سری لنکا بھارت کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے کے بجائے واضح طور پر پاکستان کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ البتہ ترک حضرات کی پاکستان سے غائبانہ محبت وحاضرانہ مودت کی جڑیں گہری اور اس کی وجوہات تاریخی ہیں۔

اس اتحاد و یکجہتی کے پیچھے مذہبی ومسلکی موافقت بھی ہے اور سیاسی وروحانی یگانگت

بھی۔ برصغیر میں جب ’’تحریک خلافت‘‘ اور ’’تحریک ترک موالات‘‘ اور ’’تحریک ریشمی رومال‘‘ جیسی تاریخی تحریکیں چلیں تو یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں کے لیے جن بے مثال ایمانی جذبات کا مظاہرہ کیا اور جس طرح کی قربانیاں دیں اس کو ترک حضرات نے بھلایا ہے نہ بھلائیں گے۔ ہمارے آباء و اجداد اس وقت جو سدا بہار پھول ہمارے لیے بو گئے، وہ ہمیشہ کے لیے ایسی خوشبو دیتے رہیں گے کہ ان کی جانفزا مہک ترکوں کو پاکستان اور پاکستانیوں کا گرویدہ کیے رکھے گی۔ ترک خاندانی قوم ہیں۔ تین براعظموں پر حکومت کرنے والے سلاطین کی اولاد۔ خاندانی لوگ کسی کی نیکی نہیں بھلاتے۔ ہم لوگوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لیے عثمانی خلافت کے تحفظ کے لیے قربانی دے کر ایک عظیم نیکی کی سعادت حاصل کی تھی، بلکہ عقلاً و سیاستاً بھی ایسی دور اندیشی اور معاملہ فہمی پر مبنی فیصلہ تھا، جس کا پھل ہماری کئی نسلیں کھاتی رہیں گی۔

اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی کہ جن ملکوں کی خوشامد کرتے کرتے ہماری کمر دھری اور عزت داغ داغ ہو گئی۔ وہ ہمارے وزرا اور جرنیلوں کی بیلٹ اور جوتے اتروا کر تلاشی لیتے ہیں اور جن ترکوں کو ہم نے قیام پاکستان کے بعد کبھی پوچھا بھی نہیں، وہ قیام پاکستان سے قبل کی ساری نیکیاں پاکستان کے کھاتے میں ڈال کر ہمیں وہ عزت دیتے ہیں جو روح کو سرشار کر دے۔ آج جبکہ عالمی برادری میں ہمیں برابری کا مستحق نہیں سمجھا جا رہا، آیئے! میں آپ کو بتاتا ہوں، ہم گنہگاروں کے بارے میں ترکی میں کیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔

ابتدا تو مجھے حج و عمرہ پر آنے والے ترک حضرات کے رویّے سے کرنی چاہیے، لیکن اس کا مشاہدہ تو آپ سب کرتے رہتے ہوں گے۔ جتنا اس ملک کے زائرین آپ سے خندہ رو، خندہ پیشانی سے ملتے ہیں، اتنا کم ہی کوئی ملتے ہوئے اچھا لگتا ہوگا۔ یہ تو عام مشاہدہ ہے، لہٰذا میں انہی واقعات کا ذکر کروں گا جن میں حج و عمرہ کے متبرک ماحول کا نہیں، عام دنیوی

ماحول اور عام غیر جانبدار ذہن کے ترک عوام کے حیرت انگیز محبت آمیز رویّے کا تذکرہ ہوگا۔

ہمارے ترکی پہنچنے سے اگلے دن ہم اپنا سامان کھینچتے ہوئے رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ اس سے ذرا پہلے ایک دکان واقع تھی۔ جب ہم سامنے سے گزرے تو دکان کے اندر سے ایک بوڑھا ترک دوڑتا ہوا آیا اور بولا: ''پاکستانی! پاکستانی!'' ہم نے سر ہلا کر اقرار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس نے چھوٹتے ہی ''جیوے جیوے پاکستان'' کا ترانہ الاپنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھوں سے مٹھی بنا کر دوستی اور محبت کا اشارہ بھی کرتا تھا اور جھومتا بھی تھا۔ بوڑھے ترک کو اُردو یا انگریزی بالکل نہ آتی تھی۔ بس ''جیوے جیوے پاکستان'' اور ''کراچی اسلام آباد'' کے علاوہ اسے کوئی لفظ نہ آتا تھا اور وہ بڑے ہنستے چہرے اور میٹھے لہجے میں جھوم جھوم کر یہی الفاظ کہے جاتا تھا۔ قریب میں ایک صاحب گزر رہے تھے۔ انہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو اس معمر ترک سے پوچھ کر ہمیں خلاصہ سنایا۔ اس خلاصے سے پتا چلا کہ یہ صرف اس عمر رسیدہ ترک کے جذبات نہیں، ترک حکومت سمیت اکثر معقولیت پسند ترکوں کے یہی جذبات ہیں۔ اس ترجمان نے بتایا کہ استنبول میں اگر حکومت نے ایک بس کو جس کا روٹ نمبر 23 تھا، کو پاکستانی ثقافت کے متعارف کروانے کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان سے خصوصی طور پر کاریگر بلائے گئے۔ انہوں نے اسے ترکی اور پاکستانی جھنڈے اور پاکستان میں مروج رنگوں سے رنگا۔ اس پر ''جیوے جیوے پاکستان'' بڑا بڑا لکھ کر لگایا۔ اس سے بہت سے ترکوں کو یہ ایک دو لفظ یاد ہو گئے ہیں۔ ''کراچی، اسلام آباد'' کے نام اس نے خبروں سے سن کر یاد کیے ہیں۔ بس اس کی اُردو دانی کی کل کائنات یہی ہے جس کے ذریعے وہ پاکستانیوں سے محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ بس روز استنبول شہر میں اپنے متعینہ راستے پر سفر کرتی ہے اور دن بھر ترک عوام کو اپنے پاکستانی بھائیوں سے قریب کرتی اور ان کی یاد دلاتی ہے۔ اس طرح کے کتنے اور بوڑھے یا جوان ترک ہوں گے

جو پاکستانیوں کو دیکھتے ہی دل میں محبت کے فوارے پھوٹتے محسوس کرتے ہیں۔ ان جذبات کی قدر ہمیں معاصر دنیا میں بہترین دوست مہیا کر سکتی ہے۔

☆ ...... راقم پہلے تذکرہ کر چکا ہے کہ سیکولر طبقہ مساوات مساوات کی رٹ لگاتا اور انصاف کا راگ الاپتا ہے، لیکن جتنی ناانصافی اور عدمِ مساوات ان کے ہاں ہوتی ہے، اس کا ذکر بھی اخلاق و اقدار کے حاملین کے لیے دکھ اور صدمے کا باعث ہے۔

اسلام پسندوں کا مقبول ترین نمایندہ طیب اردگان جب اپنے سیاسی زندگی کے آغاز میں استنبول شہر کا ناظم بننے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے دوسرے حیرت انگیز اور تیز رفتار ترین کاموں کی طرح عوام کے دل جیت لینے والا ایک کام یہ کیا کہ سیکولر دور میں طبقاتی تفریق کی علامت کے طور پر جتنے ادارے سرکاری رقم سے صرف طبقہ شرفاء کے لیے بنائے گئے تھے، انہیں بلدیہ کی تحویل میں لے کر از سرِ نو تعمیر کیا اور پھر عوام کے لیے کھول دیا۔ اس طرح وہ تفریحی مقامات جہاں ان عوام کا داخلہ ممنوع تھا جن کے خون پسینے کی کمائی سے عشرت کدے تعمیر کیے جاتے تھے، ان کو صاف ستھری تفریح میسر کر دی اور طبقاتی تفریق کا خاتمہ کرنے میں آسانی ملی۔

کچھ احباب شاخِ زرّیں کے کنارے ایک طعام گاہ میں لے گئے جہاں جرنیلوں اور سرمایہ کاروں کے لیے مخصوص ساحلی عمارت کو عوام کی طعام گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم جب داخل ہوئے تو صفائی اور نفاست کا معیار قابلِ رشک تھا۔ کسی طرح سے منیجر کو علم ہو گیا کہ پاکستانی مہمان آئے ہیں۔ اپنے کمرے سے اُٹھ کر اس ہال میں آ گیا، جس کے ایک کونے کو ہم نے نشست کے لیے منتخب کیا تھا۔ ذرا قریب پہنچ کر اس نے جس وارفتگی اور ازخود رفتگی کے عالم میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے استقبال کیا، وہ نہ بھولنے والی چیز ہے۔ بغل گیر ہوتے ہوئے جس گرم جوشی سے اس نے ہمیں خوش آمدید کہا، یوں لگتا تھا برسوں

سے بچھڑا دوست ہے۔ بعد ازاں اس نے اجازت لی کہ آپ کے لیے ایک خصوصی چیز بنوا کر بھجوانا چاہتا ہوں۔ اس کا خلوص دیکھ کر ہم سے انکار نہ ہوا۔ ایک خاص طرح کی مچھلی بڑی نفاست سے سجا کر پیش کی گئی۔

ابھی اس سے انصاف نہ ہوا تھا کہ خدمت گار ایک اور ترک ڈش لے کر پہنچ گیا۔ پوچھا یہ تو ہمارے کہے گئے میں شامل نہ تھی۔ جواب ملا یہ بھی ہمارے منیجر صاحب کی طرف سے ہے۔ ایک چیز انہوں نے اجازت لے کر اور ایک بغیر اجازت کے بھیجی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں دونوں طرح کا حق حاصل ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اتنا کچھ بھجوا دیا تھا کہ ہمیں اپنا طلب کیا ہوا کھانا ساتھ لے جانا پڑا۔ آخر میں منیجر صاحب رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئے اور کہا کہ میرے لیے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ آج پاکستانی دوست ہمارے ہاں مہمان آئے ہیں۔ ان کا عملہ بھی ان کے ساتھ خصوصی مہمانوں جیسا سلوک ہم سے کر رہا تھا۔ یہ بتا تا چلوں کہ اس طعام گاہ کا موازنہ کسی بھی پانچ ستارے والے ہوٹل سے کیا جا سکتا تھا۔ ایسی جگہوں میں تو لوگ مصنوعی مسکراہٹ بھی کفایت شعاری سے استعمال کرتے ہیں۔

اسی دن ہمارے کچھ ساتھی کتابوں کی نمائش سے ذرا تاخیر سے نکلے۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ وہ جہاں کھانے کے لیے گئے وہاں شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔ دُلہا کے والد کو پتا چلا کہ کچھ پاکستانی حضرات آئے ہیں تو وہ انہیں لینے کے لیے آ پہنچا کہ میری خوشی میں شریک ہوں۔ انہوں نے حجاب محسوس کیا اور تکلف کیا۔ وہ کہنے لگا: میرے اور میرے خاندان کے لیے یہ انتہائی نامبارک بات ہوگی کہ پاکستانی دوست یہاں موجود ہوں اور ہمارے خاندان کی تقریب میں شریک نہ ہوں۔ انہیں ناچار حامی بھرنی پڑی۔ اس نے لے جا کر انہیں دُلہا کے ساتھ بٹھایا اور شرکائے تقریب میں

بڑے فخر سے اعلان کیا کہ آج ہمارے ساتھ ہماری نیک تمنّاؤں اور خوشیوں میں ہمارے پاکستانی دوست بھی شریک ہیں۔ بتایئے! کسی غیر ملکی کو ہمارے ہاں کھانے کی عام میز سے اٹھا کر شادی کی خاندانی تقریب میں اصرار کے ساتھ شریک کرنے کا کوئی تصور ہے! ترکوں کے ہاں بھی نہیں، سوائے پاکستانیوں کے لیے۔ اور یہ یقیناً ہمارے لیے خوش قسمتی ہے۔ اس سے ہمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ایک اور واقعہ سلطان محمد فاتح کی مسجد کی زیارت کے دوران پیش آیا۔ یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ کا ایک گروپ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے ہمارے لباس اور حلیے کو دیکھ کر پوچھا آپ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ہمارے ساتھی نے بتایا پاکستان سے۔ اس نے کہا: زرداری کے ملک سے۔ مسٹر ٹین پرسنٹ کے ملک سے۔ یقین کیجیے مجھے تو شرم سے پسینہ چھوٹ گیا۔ البتہ ہمارے ہم سفر دوست نے انہیں بڑی خود اعتمادی سے کہا: زرداری صاحب کو آپ ٹین پرسنٹ سمجھتے ہیں، ہم انہیں ون ہنڈریڈ ٹین پرسنٹ سمجھتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: دراصل ہم جب پاکستان کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہاں دھماکے اور قتل و غارت ہو رہا ہے تو ہمیں بہت صدمہ ہوتا ہے۔ پاکستانی بھائیوں سے کہیں آپس میں لڑا نہ کریں۔ ہماری خاطر ہی سہی۔ ہمیں دکھ سے بچانے کے لیے صلح کر لیں۔ ان طلبہ کے جذبات دیکھ سن کر ہمیں مسرت بھی ہوئی اور اپنی حالت زار پر دُکھ بھی ہوا۔ ترک طلبہ کا یہ پیغام جب ہم آپ تک پہنچا رہے تھے کہ آج ہی خبر آئی کہ ترک حکومت نے شراب پر پابندی لگا دی ہے۔ یہ اسلام پسندوں کی تدریجی حکمت عملی کی ایک اور مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح کی مزید کامیابیاں نصیب فرمائے۔ آمین

زوال کی گھٹا کیسے چھٹی؟

ترکی یورپ کی سرحد پر واقع ہے۔ گویا ایشیا کی جانب سے یورپ میں داخل ہونے کا پہلا اور مرکزی دروازہ ہے۔ حکومت بھی سیکولر اور پڑوس میں بھی سیکولر براعظم۔ گویا نیم پر چڑھے کریلے جیسے معاشرے میں اسلام پسندوں نے جو بے مثال کامیابیاں حاصل کیں، اس کی وجوہات کا جائزہ لینا ان تمام دینی شخصیات اور اداروں و تحریکوں کے لیے ضروری ہے جو روئے زمین پر کسی بھی اپنی دینی جگہ احیائے دین اور غلبۂ اسلام کی محنت کر رہے ہیں۔ ترکی کے اسلام پسندوں نے اپنے ملک کو دینی اعتبار سے دنیا بھر کے غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں کی فلاح و نصرت کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے اور دنیاوی اعتبار سے دنیا اپنے ملک کو دنیا کی دس بڑی معاشی طاقتوں میں سے ایک بنانے کے ساتھ پوری یونین کو بھرملا کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں آپ کا رُکن بننے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو ہمیں اپنا اہم رکن بنانے کی ضرورت ہے۔ چند برس پہلے سیکولر طبقے کے ہاتھوں تباہ شدہ ملک پر صرف آئی ایم ایف کے 23 ارب ڈالر کا قرض واجب الادا تھا۔ چند ہفتے قبل ترکی نے نہ صرف اس کی آخری قسط (412 ملین ڈالر) چکا دی ہے، بلکہ اس کے خزانے میں اس وقت 125 ارب ڈالر جمع ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا؟ سچ یہ ہے کہ کسی ایک شخصیت یا ایک تحریک کا کارنامہ نہیں۔ چند ایک عناصر

ایسے ہیں جنہوں نے اپنی حکمت وتدبر اور محنت وفراست سے ترکی کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ ایک دوسرے کے احترام اور رواداری کے ساتھ اس طرح کی مختلف انداز سے محنت جو بھی کرے گا اس کے نتائج انشاء اللہ! اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

۱- اب رجوع الی الخیر کی تحریک اٹھانے میں سب سے پہلے تو ترکی کے صوفیاء اور خانقاہوں کا نام آتا ہے۔ خصوصاً مجدد وقت حضرت محمود آفندی نقشبندی دامت برکاتہم کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اس وقت روشنی کا چراغ جلایا جب ہرسُو اندھیرے کا راج تھا اور انتہائی نامساعد حالات میں صفر سے شروع کیے گئے کام کو ماشاء اللہ! اس پیمانے تک لے گئے کہ ان کے خلفاء، مریدین جگہ جگہ ''اللہ ھو'' کی صداؤں کے ذریعے دلوں کو بدلنے اور ان میں سے غیر اللہ کو نکالنے کی محنت میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ترکی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے عوام کو بے دینی کے چنگل سے نکال کر دینداری کی راہ پر ڈالا اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کے بنیادی نظریے اور اساسی افکار کا رخ ایک مرتبہ دین کی طرف ہو جائے تو اس کے کردار و کارگزاری کا پرنالہ بالآخر اس جھیل میں گرتا ہے جہاں خیر کے سب چشمے آکر جمع ہوتے ہیں۔

۲- تصوف کے بعد سیاست کو لے لیجیے۔ پروفیسر نجم الدین اربکان کی ''رفاہ پارٹی'' نے اس وقت اسلام پسندوں کی طرف سے اس میدان کارزار میں پہلا قدم رکھا، جب سیاست کو دینداروں کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا گیا تھا۔ انتہائی ناموافق حالات میں یہ شخص علماء ومشائخ کے پاس بھی جاتا۔ ان سے دعاؤں اور توجہ کی درخواست کرتا اور اسکول، کالج کے طلبہ سے لے کر تاجروں اور ملازمت پیشہ لوگوں سے رابطوں میں رہتا۔ کرتے کرتے ترکی کے سیاسی افق پر اسلام پسندوں کے ستارے بھی جگمگانے لگے۔ آج فلسطین کے مظلوم مسلمان ترکی کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں تو اس کا بڑا سبب استاد اربکان کا لگایا ہوا وہ پودا

ہے جس نے رجب طیب جیسے ذہین اور صاحب دل حکمران پیدا کیے۔ جنہوں نے ترکی کو فلاح وترقی کے راستے پر ڈال کر عالمی معاشی غارت گری سے نجات دلوانے میں کامیابی حاصل کرلی اور مظلوموں کی حمایت کو بھی اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔

۳- تیسرے درجے پر تمام ترکی کے ان فلاحی اداروں کا نام نمبر آتا ہے جن کے خلوص اور بے لوث خدمت پر اس وقت پوری دنیا کے مفلوک الحال مسلمان اور غریب انسان رشک کرسکتے ہیں۔ آئی ایم ایچ یعنی ''انسانی حق وحریت'' کے نام سے اس وقت جو فلاہی ادارہ دنیا کے مختلف غریب اور پسماندہ مما لک میں مثالی رفاہی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی بنیاد استاد نجم الدین اربکان، وزیر اعظم طیب اردگان اور آئی ایم ایچ کے موجودہ صدر بلند بلدرم نے مل کر جرمنی میں رکھی تھی۔ یہ وہی ادارہ ہے جس نے پاکستان کے زلزلہ اور سیلاب میں تمام بیرونی این جی اوز سے زیادہ قابل قدر اور معیاری خدمات انجام دیں اور ان حادثات کا ریلا گزر جانے کے بعد بھی وہاں طویل المیعاد تعلیمی ورفاہی منصوبے چلا رہا ہے۔ ترکی کی ان معیاری اور سلیقے سے انجام دی جانے والی خدمات کی بدولت ترکی حکومت اور ترکی عوام نے دنیا بھر کی دعائیں اور محبتیں سمیٹی ہیں۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی نیک تمنائیں اور غائبانہ تشکرات کی بدولت ترکی کی ساکھ کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ اس ادارے کے ماتحت یتیم بچوں کے لیے قائم ہری پور اور مانسہرہ جیسے شہروں میں بلا معاوضہ وہ تعلیمی اور رہائشی سہولتیں دی جاتی ہیں جو کسی اعتبار سے کیڈٹ کالج کے طلبہ کو بھاری بھرکم اجرتیں دینے کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ یہ تعلیمی اور رفاہی ادارے سے بیرون ملک ترکی کے سفارتخانے ہیں جو اس کے لیے محبتیں کماتے اور فاصلے سمیٹتے ہیں۔

٤- ایک چیز جس نے اسلام پسندوں کی حکومت کے لیے پڑے لکھے، تعلیم یافتہ اور فکری موافقت رکھنے والے رجال کار مہیا کیے اور سیکولر شاہی کی بلیک میلنگ سے نجات

دلوائی، وہ ہاسٹل والے لوگ ہیں۔ یہ سلسلہ زیادہ تر شیخ بدیع الزماں نورسی والوں نے قائم کیا۔ انہوں نے ترکی کے بڑے شہروں میں چھوٹے شہروں سے آنے والے اسکول، کالج کے طلبہ کے لیے ہاسٹل قائم کیے۔ یہاں رہائش اور خوراک کی ایسی سہولتیں طلبہ کو دی جاتی ہیں کہ پانچ ستارے والے ہوٹل میں بھی کیا ہوتی ہوں گی؟ راقم اگر خود اس صفائی و نظافت اور معیار و سلیقے کا مشاہدہ نہ کرتا جو ان ہاسٹلز میں عام طلبہ کو دی جارہی ہیں تو ضرور اسے مبالغہ سمجھتا۔ لیکن مشاہدے کے بعد یہ سب کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور ہے جو بچشم خود دیکھی اور محسوس کی۔ ان طلبہ میں غیر محسوس طریقے سے ایسے ذہنی تربیت یافتہ طلبہ کو شامل کردیا جاتا تھا جو نئے طلبہ کا اکرام اور حسنِ اخلاق کی بنیاد پر تعلقات بڑھاتے اور راہ و رسم قائم کرکے ان کے اچھے مستقبل کے لیے ان سے تعاون کرتے ہیں۔ نماز کا وقت آجانے پر انہیں براہ راست نماز کی دعوت دینے کے بجائے ان کے سامنے اہتمام اور خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے اور انہیں یہ تأثر دیتے کہ انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے اپنی سی کوشش کے ساتھ مذہبی عبادات بھی ضروری ہیں۔ آہستہ آہستہ نئے طلبہ دین کی طرف راغب ہوجاتے اور پھر جب پکا دینی ذہن لے کر یہاں سے نکلتے تو ترقی کرکے جہاں بھی پہنچتے، اس محتاط انداز میں دین کی تبلیغ کرتے اور ماتحتوں کو دین سے جوڑتے۔ موجودہ حکومتی قیادت اور اس کا ساتھ دینے والی مشینری اسی طرح کے ہاسٹلز سے تربیت پاکر نکلتی ہے۔ اس نظام میں ڈھل کر نکلنے والے یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جاگیردارانہ ذہنیت اور وڈیرہ پن والا مزاج ان میں نہ تھا۔ مشقت اور تربیت کی بھٹی سے گزرنے کے بعد یہ کندن بن گئے اور اسلام پسندوں کی حکومت کے لیے ایسے ستون اور ان کی حکومتی مشینری کے لیے ایسے کل پرزے ثابت ہوئے جنہوں نے ایسے وقت میں اپنے محسنین کا خاموش اور بھرپور ساتھ دیا جب سیکولر فوج، سیکولر طبقے اور عالمی طاغوتی طاقتیں اسلام پسندوں کی حکومت کی جان کو آچکی

تھیں۔ حکومتی مشینری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اور عوامی زندگی میں بلند سماجی حیثیت رکھنے والے یہ افراد صرف اپنے ملک اور اپنی پسندیدہ حکومت کا ہی درد نہیں رکھتے بلکہ ان کے دل میں پوری امت کا درد اور ان کے اہداف میں پوری امت کی خیر خواہی ہے۔ ہاسٹل کی شکل میں ترکی کے اسلام پسندوں کی یہ اختراعی ایجاد ان کے لیے معاشرے میں ہر طرح کے کارآمد لوگ اور نظریاتی کارکن مہیا کرتی ہے جو انہیں بہت سے غموں سے نجات دلا دیتے ہیں۔

۵- ایک اہم عنصر ''پھولوں کا ٹیلہ'' اور ''چاند کی روشنی'' جیسے نام رکھنے والی بیٹھکیں ہیں۔ احقر ان کا تفصیلی تذکرہ کر چکا ہے کہ یہ کس طرح گلی محلے کی سطح پر بچوں، نوجوانوں اور ادھیڑ عمر مرد و خواتین کی باتوں باتوں میں ذہن سازی کرتے ہیں۔ اجتماعی دھارے سے جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ عوامی سطح پر ذہن سازی میں ایسی بیٹھکوں اور اوطاقوں نے تاریخی کردار ادا کیا ہے اور یہاں تعلیم و تربیت کے علاوہ معاشی و سماجی مسائل کے حل اور باہمی تعاون کے تناظر میں جس طرح عالمی سوچ اور اجتماعی فکر دی جاتی ہے وہ بے مثال اور قابلِ تقلید ہے۔ تفصیل اسی کتاب میں ''پھولوں کا ٹیلہ'' نامی مضمون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

٦- ایک کامیاب کوشش ان نامعلوم کارکنوں کی ہے جو غبارے بیچتے بیچتے سر پر عزت کی ٹوپی اور ہاتھ میں بہادری کی تلوار تھما دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار کارکن ترکی میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اپنے اپنے انداز میں غیر محسوس طریقے پر اسلامی شعائر کی اہمیت دلوں میں بیٹھانے اور دینی جذبات پروان چڑھانے کی محنت اسی طور سے جاری رکھے ہوئے ہیں کہ ان کے رب کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں۔ اس طرح کے لوگوں میں سے ایک کا ذکر جو اتفاقاً ہماری نظر میں آ گئے، ٹوپی اور تلوار نامی مضمون میں آ چکا ہے۔

۷- اس فہرست میں آخر میں ان لوگوں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو خطاطی کے نمونوں

اور اسلامی کتبوں اور طغروں کے ذریعے اسلامی ثقافت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خطاطی، پھر پتھر، لکڑی، چمڑے، کپڑے، پر وغیرہ انتہائی نفاست سے اس کی نقش کاری جہاں سجتی ہے وہاں دیکھنے والے کی نظر ایک مرتبہ ضرور کھینچ لیتی ہے اور یہ نظر ہی ہوتی ہے جو انسان کی زندگی بدلنے اور اسے کہیں سے کہیں جا پہنچانے میں کبھی کبھار اس انداز سے اثر انداز ہوتی ہے کہ ساری عمر کی تفصیلی تبلیغ بھی ویسا نہیں کر سکتی۔

قارئینِ کرام! ممکن ہے اور بھی ایسے عناصر ہوں جن کا برادر مسلم ملک کا معاشرہ تبدیل کرنے اور انقلابی سوچ پروان چڑھانے میں کردار ہو، لیکن ہر مسافر یا مشاہدہ کرنے والا اس چیز کو دیانت داری سے بیان کرنے کا پابند ہوتا ہے جو اس کے سامنے آئی۔ لہٰذا مجھے کی خدمات کے اعتراف سے انکار نہیں۔ البتہ جو کچھ سامنے آیا تو کوشش کی ہے کہ ان صاحب دل اور صاحبِ ذوق قارئین تک پہنچا دیں جو مسلمانوں اور نظریاتی تحریکوں کی کامیابی کے اسباب جاننے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ حکیم لقمان علیہ السلام اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ اصلاح یہ ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کو دیکھا جائے اور اپنی خامیوں کا احتساب کیا جائے تو زوال کی گھٹا چھٹ سکتی ہے اور عروج کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

مقبول ترین ترک رہنما کا تعارف

عربی سے ترجمہ: محی الدین

طیب اردگان کا مختصر تعارف:

ترکی کی موجودہ حکمران جماعت کی مقبولیت اس کے قائد طیب اردگان کی وجہ سے ہے۔ جن کی ولادت 26 فروری 1954ء کو استنبول کے یورپی حصے کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام احمد اور والدہ کا نام تنزیلہ تھا۔ ان کے والد محترم محنت مزدوری کرتے تھے۔ انہوں نے اسکول کی تعلیم کا آغاز 1965ء میں قاسم پاشا قبیلے کے لڑکوں کے ساتھ کیا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد انہوں نے ائمہ وخطبا کی تربیت گاہ میں داخلہ لیا۔ اپنے پاکیزہ مزاج اور دینی رجحان کی وجہ سے جلد ہی یہ مقام حاصل کر لیا کہ ان کے استاد صاحب نے چھوٹی عمر کے باوجود ان کو دیگر طلبہ کو نماز سکھانے پر مقرر کر دیا۔ نوعمری ہی میں ان کی دینی پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ انہوں نے ایسی جگہ نماز پڑھنے سے انکار کر دیا جہاں ان کے سامنے بے پردہ خواتین کی تصویروں والا اخبار اور رسالہ تھا۔ ان کے استاد صاحب کو جب ان کی یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے حیرت آمیز خوشی کا اظہار کیا۔ دینی پختگی کے اپنے ان جیسے

کاموں کی وجہ سے ان کو ائمہ اور مبلغین کی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی ''شیخ'' کے لقب سے نوازا گیا اور اس نصاب کی تکمیل کے بعد وہ امام المبلغین کہلائے۔ اس کے بعد انہوں نے مدرسہ آقصری میں بزنس ایڈمنسٹریشن، معاشیات اور علوم تجارت کی تعلیم حاصل کی۔ آج کل استنبول کا یہ مدرسہ مرمرہ یونیورسٹی کی ''معاشیات اور انتظامی امور کی فیکلٹی'' سے موسوم ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے 1970ء میں فوج میں ایک ریزرو آفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس اثناء میں فوجی خدمات بہت شاندار طریقے سے انجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے بعض مالیاتی اداروں اور نجی کمپنیوں میں بطور ڈائریکٹر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا قابل تعریف اظہار کیا۔

اردگان کی شادی و حج:

14 جولائی 1978ء کو انہوں نے آمنہ نامی ایک باپردہ خاتون سے شادی کی اور ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں کل چار بچے ہیں۔ دو بیٹوں میں سے ایک کا نام احمد براق ہے اور دوسرے کا نام انہوں نے اپنے قائد نجم الدین اربکان ک نسبت سے نجم الدین بلال رکھا، جبکہ دو بیٹیاں اسراء اور سمیہ ہیں۔

جناب طیب اردگان شروع ہی سے ایمانی پختگی رکھتے ہیں۔ اسلامی اخلاق پر کاربند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے پابند ہیں۔ وہ اس قدر مذہبی رجحان و میلان رکھتے ہیں کہ انہوں نے شادی کے بعد سب سے پہلے اپنی بیوی کے ساتھ حج کیا۔ تہجد گذار اور شب زندہ دار ہیں۔ محنت مزدوری میں عار نہیں، بلکہ اسے رزق حلال کا ذریعہ بنانے میں عظمت سمجھتے ہیں۔ وہ تعلیم کے دوران ہی اپنے والد سے گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹاتے۔ اپنے اور اپنے بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے استنبول کی سڑکوں کے کنارے لیموں کا شربت، تربوز اور کیک (جسے ترکی زبان میں ''سمید'' کہتے

ہیں) بیچتے رہے۔ اس کے ساتھ وہ کھیل کود کو بھی انسانی صحت کے لیے ضروری سمجھتے اور اس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ طالب علمی کے دور میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور اب بھی ان کو فٹ بال سے عشق ہے۔ ان کی ذاتی اور خاندانی زندگی بہت ہی سادہ ہے۔ وہ عالم اسلام کے ایک ایسے منفرد حکمران ہیں جو عوام میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ رمضان المبارک میں افطار کے وقت عوامی مقامات میں عام لوگوں سے ساتھ افطار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ان کی اہلیہ ساتھ ہوں تو پھر افطار کے لیے کسی بھی عام آدمی کے گھر چلے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی اور عادات میں تکلف اور بناوٹ نہیں۔ وزیر اعظم ہونے کے باوجود اپنے افراد خانہ کے ساتھ ایک عام فلیٹ میں رہتے ہیں۔ نہ کسی غیر ملک میں کوئی سرمایہ ہے اور نہ کوئی جائداد۔ سیاست وحکومت سے ہمہ وقتی وابستگی کے باوجود ہر بدعنوانی اور آلودگی سے بحمد اللہ محفوظ اور ارباب اقتدار و وابستگان سیاست بالخصوص مسلم ممالک کے حکمرانوں کے دینی وابستگی، انسانی خدمت، ملک وقوم کی خیر خواہی، منصبی فرائض کی دیانت دارانہ ادائیگی اور بدعنوانی کی چھینٹوں سے محفوظیت کے لحاظ سے لائق تقلید ہیں۔

سیاست سے وابستگی اور سیاسی حکمت عملی:

طیب اردگان اپنی دینی محبت کی وجہ سے پروفیسر نجم الدین اربکان کی اسلام سے گہری، فکری وعملی وابستگی سے متاثر اور ان کے گرویدہ تھے۔ ملک میں اسلامی بہار اور اس کی شادابیاں لانے کے لیے نہ صرف اربکان کے ہم خیال ومداح تھے، بلکہ اس دشوار ترین ومحنت طلب کارِ خیر میں ان کے معاون وشریک بھی بننا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی سیاسی جماعت ''قومی سلامتی پارٹی'' میں شامل ہو گئے۔ جب 1975ء میں اربکان کی جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اربکان ترکی سے سوئزر لینڈ چلے تو اردگان نے مقامی نوجوانوں کی قیادت کی صورت میں پروفیسر اربکان کی تحریک کو جاری وزندہ رکھا۔ فوجی

انقلاب نے تمام جماعتوں پر پابندی لگادی۔ 1983ء میں ترکی میں سیاسی پارٹیوں پر سے پابندی ختم ہوئی تو طیب اردگان ویلفیئر پارٹی کے اپنے شہر کی شاخ کے سربراہ بنے۔ انہیں اس پارٹی کی طرف سے 1987ء اور 1991ء میں دوبار پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے نامزد کیا گیا، مگر یہ دونوں بار منتخب نہ ہوسکے۔ البتہ 1994ء میں استنبول کی کارپوریشن کے میئر منتخب ہوگئے۔ یہاں سے ان کی عوامی مقبولیت کا آغاز ہوا۔

طیب اردگان نے عدنان میندریس اور نجم الدین کے اخلاص وایثار اور ان کی دردمندی وجگر سوزی کے باوجود ان کی ظاہری ناکامی سے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکی میں اسلامی ماحول ونظام کا مقصود حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیکولر عناصر بالخصوص فوج اور عدالت سے ٹکرانے، نشانہ بنانے یا ان کو مخالفت کا جواز فراہم کیے بغیر عوام میں اسلامی شعور ودینی رجحان اجاگر کرکے رائے عامہ کی استقامتی قوت کی حمایت حاصل کی جائے۔ اپنے اس فکری نتیجے کو عملی شکل دینے کے لیے انہوں نے 2001ء میں اربکان کی سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کرکے ''جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی'' کے نام سے ایک نئی جماعت بنالی۔ اس علیحدگی کے باوجود وہ اربکان کی خدمات اور ان کی کاوشوں کے معترف ومداح رہے اور ان کی اسلامی تحریک کے بارے میں شکوک وشبہات اور اعتراضات کا احسن معمول رد کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی پارٹی کی بنیادی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہم جمہوری نظام کو تحفظ دیں گے۔ فوج کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ترکی کی بقاء، خوش حالی اور تہذیبی ترقی کے بارے میں اتاترک کے اصولوں سے انحراف نہیں کریں گے۔ چونکہ ملک کے شہریوں کی واضح اکثریت 99 فیصد مسلمانوں کی ہے اس لیے جمہوری اصولوں کے مطابق اپنی پالیسیوں میں اکثریت کی مذہبی آزادی کا خیال رکھیں گے۔

طیب اردگان کی یہ پالیسی کسی کمزور، دین سے فرار یا مقصود کو چھوڑ دینے کی وجہ سے

نہیں، بلکہ حکمتِ عملی کی وجہ سے تھی۔ وگرنہ انہوں نے آزمائشوں میں جس عزیمت وحوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ان کو جیل کی سزا ہوئی تو گھر والوں سے خوشی اور استقامت کے ساتھ رخصت ہوئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ انہوں نے جامع مسجد سلطان فاتح میں نماز جمعہ ادا کی اور جیل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے لوگوں سے یوں خطاب کیا:

”اے میرے پیارو! میں تمہیں الوداع کہتا ہوں۔ صرف استنبول کے لیے نہیں اپنے ملک ترکی بلکہ عالم اسلام کو روشن صبح کا پیغام دیتا ہوں اور اس پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم آزمائش کی اس گھڑی میں مخلوق سے احتجاج کرنے اور اس سے مدد مانگنے کے بجائے اپنے رب کے حضور گریہ وزاری کرو۔ اپنے جذبات کا بے ہنگم استعمال کرنے کے بجائے ان کا آئندہ انتخاب میں بھرپور اور فیصلہ کن اظہار کرو۔“

جیل اور عدالت کی پیشیاں ان کو اپنے مقصود اور اصولی موقف سے نہ ہٹا سکیں۔ ہر آزمائش ان کے عزم میں مزید پختگی کا ذریعہ بنتی رہی۔ انہوں نے عوام سے براہ راست تعلق کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا۔ عوامی جلسوں سے بکثرت خطاب کر کے ایک تو عوام سے رابطہ مستحکم کیا اور دوسرے یہ کہ اسے اسلامی شعور عام کرنے کا ذریعہ بنایا۔ وہ اپنے عوامی جلسوں میں ترکی شاعر ”ضیاء غوک اللب“ کے اشعار پڑھتے، جن کا مفہوم یہ ہے ؎

مساجد ہی ہماری بیرکیں ہیں　　اور گنبد ہی ہمارا ہیلمٹ ہے
مینار ہمارے حراب یعنی نیزے ہیں　　اور نمازی ہمارے لشکر ہیں
اور یہ وہ مقدس فوج ہے　　جو اپنے دین کی حفاظت کرتی ہے

مقبولیت کا آغاز وارتقاء:

طیب اردگان کی عوامی مقبولیت کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ 1994ء میں استنبول کے میئر بنے اور پھر بحیثیت میئر ان کی بے لوث اور دیانت دارانہ عوامی خدمات کی وجہ سے عوام کا ان پر اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے عوام پر بوجھ ڈالے بغیر حکمت عملی سے بلدیہ کے ایسے مالی وسائل پیدا کیے جس نہ صرف بلدیہ پر 2ارب ڈالر کا جو قرضہ تھا وہ اتر گیا بلکہ شہر کی تعمیر وترقی کے لیے مزید چار ارب ڈالر فراہم ہو گئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس سے انہیں عام کے دلوں کی دھڑکن اور محبوب قومی رہنما بنایا، وہ استنبول میں صاف اور شفاف پانی کا انتظام ہے جو بظاہر ممکن نہ تھا۔ مگر اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے طیب اردگان کی بحیثیت میئر دردمندانہ فکرمندی، جذبہ خدمت سے معمور طبعیت وفطرت اور شب وروز کی مخلصانہ کوشش کی وجہ سے حل نہ ہو سکنے والا یہ مسئلہ آسانی سے حل کر دیا۔ دونوں طرف خلیج کے پانی سے اس قدر بدبو آتی تھی کہ یہاں سے گذرنے کے لیے ناک پر کپڑا رکھنا پڑتا تھا۔ ترکی حکومت نے اس پانی کو شفاف اور پینے کے قابل بنانے کے لیے جاپان، امریکا اور یورپ سے مدد مانگی، مگر کسی نے مدد نہیں کی تو 1996ء میں مجودہ وزیر اعظم طیب اردگان نے جو ترک انجینئرز اور سائنسدانوں کی مدد سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک تو اس گدلی اور بدبودار خلیج کو صاف وشفاف بنا کر اس جگہ کو سیاحوں کے لیے جاذب نظر اور پرکشش بنایا، ساتھ ہی صاف پانی کے لیے استنبول کے ترستے شہریوں کے لیے سیکڑوں کلومیٹر لمبی پائپ لائنیں بچھادیں جس کی وجہ سے استنبول کے ہر گھر می حفظان صحت کے عالمی اصولوں کے مطابق ایسا پانی پہنچ رہا ہے جو عام گھریلو استعمال کے علاوہ پیا بھی جا سکتا ہے۔ استنبول میں پانی کی ٹینکی نہیں ہے بلکہ براہ راست نلکوں میں چوبیس گھنٹے پانی موجود رہتا ہے۔ جس طرح اسکردو اور خپلو میں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوڑا کرکٹ اور کچرا اٹھانے کے لیے دنیا

کی ریسائکلنگ سہولیات مہیا کی۔ ماحولیاتی آلودگی ختم کرنے کے لیے گیس سے چلنے والی ہزاروں بسوں کا انتظام کیا۔ ٹریف جام کا مسئلہ حل کرنے کے لیے صرف استنبول میں پچاس نئے پل تعمیر کیے اور درجنوں شاہراہیں بنائیں۔ اپنی محنت، دیانت اور حکمت عملی سے استنبول جیسے بے ہنگم شہر کو دنیا کے بہترین اور خوبصورت ترین شہروں میں لا کھڑا کیا۔ اپنی بے لوث خدمات کی وجہ سے عوام میں مقبول سے مقبول تر ہوتے چلے گئے۔ ان کی سیاسی جماعت کو انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹ می اکثریت حاصل ہوگئی اور وہ ملک کے وزیر اعظم بن گئے اور ان کے جراءت مندانہ اور ایمانی فراست وسیاسی بصیرت پر مبنی اقدامات نے عوام کے دل موہ لیے اور ان کی مقبولیت گہرائی اور وست دونوں لحاظ سے بڑھ گئی۔

نظریاتی وفکری تبدیلی:

اگر چہ طیب اردگان اور ان کی سیاسی جماعت نے تصادم سے گریز کی پالیسی اختیار کی، مگر ان کے اسلامی عزائم مخفی نہ تھے۔ سیکولر سیاست دان اور سیکولر آئین کی حفاظت کی ذمہ دار فوج اور عدلیہ کی مثلث ان کی مخالفت میں متحرک ومستعد ہوگئی۔ مگر انہوں نے جذباتی واشتعالی انداز اختیار کرنے کے بجائے عوام میں اپنی سرگرمیاں تیز کردیں۔ اتاترک کے سیکولر نظریات واقدامات کا بطلان اور ان کے نقصانات کو دلائل وبراہین اور عملی ومشاہداتی مثالوں سے واضح کر کے عوام میں اسلامی نظام کی عظمت اجاگر کی۔ اسلامی اور سیکولر دور میں ترکی کے بین الاقوامی مقام کا فرق نمایاں کر کے عوام کے دل ودماغ میں ان حقائق کا نقش بٹھا دیا کہ ہماری قومی وملکی عزت، بحرانی نجات اور اقتصادی ترقی، مغربی تہذیب ونظام، مذہب گریز مفکرین کے نظریات اور کمیونزم وغیرہ ان دین کش فلسفہ ہائے حیات میں نہیں۔ جن سے آج خود اہل مغرب اور کمیونسٹ ممالک بیزار ان کی ناکامی کے معترف اور ان کے اثرات کے دلدل سے نکلنے کے لیے بے تاب اور کسی ایسے نظام کے متلاشی ہیں جو ان کے

معاشرتی ومعاشی بحرانوں وسیاسی ومعاشرتی پریشانیوں سے نجات دلا دے۔ دوسرے یہ کہ امورِ مملکت میں اسلامی تعلیمات وہدایات پر عمل زوال کا باعث نہیں، بلکہ عروج ووقار کا ذریعہ ہے، ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں، بلکہ معاون ہے۔ تیسرے یہ کہ ہماری قومی وملکی عزت اور ہمارے بین الاقوامی اعزاز واکرام کا انحصار اسلامی تشخص کے اظہار اور اپنے دین سے کامل وابستگی اور اس پر عمل کی پختگی پر ہے۔ صدر مملکت عبد اللہ گل، وزیر اعظم طیب اردگان اور ان کے حکومتی اور سیاسی رفقاء، معاونین، کارکنان اور اہل کاروں نے حکمرانی کو اختیارات کے غیر احتسابی اور من مانے استعمال اور شخصی وخاندانی مفادات کا ذریعہ بنانے کی بجائے خلفائے راشدین وعادلین کی اتباع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالی کی نیابت، عوام کی فلاح و بہبود کا ذریعہ اور خود کو اپنی ذمہ داریوں اور اختیارات کے بارے میں اپنے خالق ومالک، قادرِ مطلق رب العالمین کے سامنے جواب دہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترکی میں حکومت اور عوام دونوں میں موجودہ وزیر اعظم طیب اردگان کی بیدار مغز قیادت میں مشترکہ جدوجہد کی صورت میں خلافت اسلامیہ کے احیاء کے خواب کی عملی تعبیر کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔

عظیم ترک قائد رجب طیب اردگان کی قیادت وسیادت نے نہ صرف ترکی میں اسلامی تحریک کو منظّم ومستحکم کیا، بلکہ پورے عالم اسلام بالخصوص عرب ممالک کے عوام کے اسلامی رجحان ومیلان کے لیے حوصلہ افزا ترغیبی مثال پیش کی ہے۔ اب ان ممالک کے عوام اور مخلص قائدین کے لیے انسانی فلاح و بہبود کا نمونہ امریکا، برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ نہیں رہے۔ ان کی نگاہیں ترکی پر ٹکی ہوئی ہیں۔ اس وقت ہر ملک کے باشعور اور خوشحالی چاہنے والے افراد رجب طیب اردگان کی سی سحر انگیز اور کایا پلٹ قیادت کے طلب گار ہیں۔

معاشرتی فلاح و بہبود:

طیب اردگان کی حکومت سے پہلے ترکی معاشرہ افراتفری کا شکار تھا۔ بیروزگاری عام تھی۔ امن وامان مفقود تھا۔ مگر جب یہ اقتدار نشین ہوئے تو ان کی سیاسی پارٹی نے عوام کے مذہبی اقدار کا احترام کیا۔ سیکولر فوجی قیادت اور دین مخالف عوامی وسیاسی عناصر کی رکاوٹوں کے باوجود حجاب کے معاملے کو دانشمندی سے نمٹایا۔ ترک عوام کی اجتماعی معاشرتی نظام کی حفاظت کی اور اسے (جدا ہو دین سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی) کی کیفیت سے نکال کر دینی حسن سے مزین متوازن سیاسی پالیسی دی۔ ملک بھر میں جاری لوٹ کھسوٹ کو ختم کیا۔ رشوت ستانی اور انڈر ورلڈ سے تعلقات رکھنے والوں کو کڑی سزائیں دیں۔ ناجائز سفارش کرنے والوں کو خواہ وہ حکومت کے لوگ ہوں یا غیر، ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے تمام ممبروں کو ترقیاتی کاموں سے الگ کر دیا۔ سڑکوں وغیرہ کی تعمیر ومرمت سمیت تمام علاقائی ترقیاتی کام میونسپل کمیٹی اور بلدیات کے حوالے کر کے ان کو خود مختار اور فعال بنا دیا۔ ''الناس علی دین ملوکہم'' لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر ہوتے ہیں، کے مطابق ملک میں مذہبی رجحانات کا یہ عالم ہے کہ اس وقت حکومت کے کم وبیش تمام اراکین صرف پانچ وقت کی نماز ہی کے پابند نہیں، بلکہ تہجد گذار بھی ہیں۔

معاشی انقلاب:

2001ء میں ترکی کو معیشت کے لحاظ سے ایسا ملک قرار دیا گیا جو دیوالیہ ہونے کے قریب تھا۔ اقتصادی میدان میں ترکی کی کامیابی کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، مگر رجب طیب اردگان کی منصوبہ بندی پر مبنی سود سے بچنے کی کوشش کی وجہ سے وہی ترکی 2011ء کی پہلی سہ ماہی میں معاشی استحکام کے لحاظ سے پوری دنیا میں پہلے نمبر پر آ گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اقتصادی ترقی کے اہداف مقرر کیے اور پھر اقتصادی ذرائع کو سودی نظام سے پاک کر کے اسلامی اقتصادی نظام کے مطابق کرنے کے لیے مالیاتی اداروں کو

آمادہ کیا۔ بیرونی ملکوں سے تجارت کے حوالے اہم پیش رفت کی۔ سیاحت کو فروغ دیا۔ جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے برسراقتدار آنے سے قبل ترکی میں سیاحوں کی سالانہ تعداد دوملین یعنی بیس لاکھ تک تھی جو بڑھ کر اب بیس ملین یعنی دو کروڑ تک پہنچ چکی ہے اور حکومت اس کو تیس ملین یعنی تین کروڑ افراد تک پہنچانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ اس کے لیے مذہبی سیاحت کو بھی متعارف کرایا ہے یعنی مسلمان، عیسائی، یہودی اور مختلف مذاہب کے وہ افراد جو سیر وسیاحت کے بجائے مذہبی عقیدت کے لیے سفر کرتے ہیں۔ ان کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ترکی میں موجود اپنے مذہبی آثار اور مقدس مقامات کی زیارت کے لیے سفر کریں۔ افراط زر کی شرح میں کمی کی۔ صحت، تعلیم، سیاحت اور رہائشی منصوبوں کے ذریعے ترکی کو بہت زیادہ ترقی دی۔ ہاؤسنگ سکیم شروع کی اور سود کے بغیر قرض دینے کی سکیم میں ادائیگی کی مدت دو سال سے بڑھا کر بیس سال تک کر دی۔ بین الاقوامی کارپوریشنز کے ساتھ شفاف بنیادوں پر تجارتی تعلقات قائم کیے۔ سود سے پاک نظام کے ساتھ تجارت کی بنیاد رکھنے والی موضیاد کمپنی کی حوصلہ افزائی کی۔ تین براعظموں کے درمیان واقع ترکی جس کا اقتصادی دائرہ اب عالمی سطح پر پھیل چکا ہے۔ ترکی کی پیداواری قوت میں بے انتہا اضافہ ہو چکا ہے۔ ترکی کی اقتصادیات کا زیادہ تر انحصار برآمدات پر ہے اور برآمدات کا نصف یورپی مارکیٹوں تک پہنچتا ہے اور باقی نصف دوسرے 80 ممالک میں جاتا ہے۔ کم مدت میں ترکی کے معاشی شعبوں میں استحکام پیدا ہو گیا ہے۔ مقررہ شرح تبادلہ کے بجائے ایک لچکدار شرح تبادلہ پر انحصار کیا جانے لگا ہے۔ شرح پیداوار جس طرح بڑھ رہی ہے، اس کا مطلب ہے کہ ترکی ایک مسلسل شرح پیداوار کی بنیاد رکھ چکا ہے۔ سرمایہ کاری کا حجم ساڑھے چار گنا اور پیداوار کا حجم دو گنا بڑھ گیا ہے۔ رؤوس الاموال (بنیادی سرمایہ) کے حجم میں 75% سے 80% اضافہ ہوا ہے۔ 2001ء سے 2008ء تک سرکاری شعبوں میں سرمایہ کاری 100%

تک جا پہنچی ہے۔ جبکہ خاص شعبوں میں نسبت 300% رہی ہے۔ پیداوار میں اضافہ کے نتیجے میں بیرونی تجارت بڑھ گئی۔ خسارہ بتدریج ختم ہوگیا اور معیشت مستحکم ہوگئی۔

کامیاب خارجہ پالیسی:

اس وقت اسرائیل کے سوا پوری دنیا سے ترکی کے بہترین تعلقات ہیں۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حال ہی میں ترکی نے اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کی تو اقوام متحدہ کے 197 ملکوں میں سے 191 ملکوں نے ترکی کی حمایت کی۔ اس نے آرمینیا کے ساتھ تاریخی دشمنی ختم کرکے صلح کرلی ہے۔ آذربائیجان اور سویت یونین کے درمیان ایک پل قائم کیا ہے۔ یونان، عراق اور مصر سے تعلقات بہتر بنائے ہیں۔ عرب ملکوں کے لیے ویزے کی شرط ختم کردی ہے اور سرحدیں کھول دی ہیں۔ اس وقت 76 ملکوں میں ترکی کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں۔ کردوں سے زیادتیوں کا ازالہ کیا۔ کردی زبان میں ٹی وی چینل جاری کیے اور ترکی میں مئی 2010ء میں ایک چینل عربی زبان کا شروع ہوا۔ جس کی ترکی حکومت نے کسی رکاوٹ کے بغیر باقاعدہ اجازت دی۔

دینی غیرت و اسلامی حمیت:

سوئزرلینڈ کے شہر ڈیوس میں ہونے والے ورلڈ اکنامک فورم کے اجلاس میں اسرائیل کے صدر شمعون پیرز نے اپنی 25 منٹ کی تقریر میں کہا کہ اسرائیل کو غزہ میں کیے گئے قتل عام پر کوئی شرمندگی نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو مستقبل میں بھی وہ اس طرح کے اقدام سے گریز نہیں کرے گا۔ اسرائیلی صدر کی وحشیانہ اقدام اور درندگی کے اعلان پر مشتمل اس متکبرانہ تقریر کا جواب دینے کے لیے اس اجلاس میں موجود ترکی کے وزیراعظم رجب طیب اردگان نے منتظمین سے وقت مانگا۔ منتظمین کے انکار پر وہ اجلاس سے یہ کہتے ہوئے واک آؤٹ کرگئے کہ وہ اس اجلاس میں آئندہ کبھی شریک نہیں ہوں گے۔ چونکہ اجلاس

کے منتظمین کا رویہ مظلوم مسلمانوں کے خلاف اور ظالم اسرائیل کے حق میں جانبدارانہ ہے، اس لیے ان کا دینی غیرت کا یہ جراءت مندانہ انداز ایک طرف صرف ترکوں کے لیے نہیں بلکہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کے لیے تقویت کا باعث بنا جبکہ دوسری طرف اسرائیل، یورپ اور امریکا کے لیے اس لحاظ سے حیرت انگیز تھا کہ ترکی وہ اسلامی ملک ہے جس نے سب سے پہلے اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے اور اس لحاظ سے تشویش ناک تھا کہ طیب اردگان کا یہ حمیتی کردار بظاہر پرسکون سطح کے نیچے عنقریب ابھر اور بپھر کر سامنے آنے کے لیے بے قرار باطل شکن اسلامی بیداری کی موجودگی کی خبر دے رہا تھا۔ 31 مئی 2010ء کو اسرائیل کی وحشیانہ جارحیت اور درندگی کے شکار غزہ کے محصور اور مظلوم مسلمانوں کے لیے غازی بلند یلدرم صاحب کی قیادت میں جس میں پاکستان سے جناب ندیم احمد صاحب چیئرمین خبیب فاؤنڈیشن اسلام آباد اپنی ترک اہلیہ محترمہ نالان صاحبہ سمیت شریک تھے۔ امداد لے کر جانے والے جہاز فریڈم فلوٹیلا پر اسرائیل نے حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں ترکی کے 9 رضا کار شہید اور 19 زخمی ہوئے۔ ترک وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے اسرائیل کے اس وحشیانہ حملے کی شدید مذمت کرتے ہوئے انسانی ضمیر پر حملے سے تعبیر کیا اور نہ صرف اسرائیل کے خلاف سخت موقف اختیار کرنے کا اعلان کیا بلکہ اسرائیلی جارحیت کو بے نقاب کرنے اور عالم اقوام کو غزہ کے مسلمانوں کی مظلومیت و بے بسی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے احتجاج اور ردعمل کے طور پر اسرائیل سے اپنے سفیر کو واپس بلا لیا اور اسرائیلی سفیر کو ترکی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اپنی بحریہ کو چوکس کر کے بحیرہ روم میں فوجی گشت بڑھا دیا۔ اسرائیل سے فوجی تعاون کے معاہدے کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے ترک فوج کی اسرائیلی فوج کے ساتھ مشترکہ مشقیں منسوخ کر دیں اور اس کے ساتھ ہی اسرائیلی طیاروں کو ترکی فضائی حدود استعمال کرنے سے روک دیا۔ اقوام متحدہ

کی 56 صفحات کی فریڈم فلوٹیلا پر حملے سے متعلق رپورٹ کو خلاف حقیقت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ترک باشندوں کی شہادت سمیت غزہ کے محاصرے کے معاملے کو عالمی عدالتِ انصاف میں اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں ترکی کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل اپنے اس سفاکانہ عمل پر ترکی سے معافی مانگے اور زرتلافی ادا کرے۔ جبکہ اسرائیل اقوام متحدہ کے اصولوں سے مطابقت رکھنے والے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ اسلام کی محبت اور نورانیت سے معمور ترک قیادت کا یہ جراءت مندانہ اقدام اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو ترکی کل تک اسرائیل کا دوست اور اتحادی سمجھا جاتا تھا، آج وہی ترکی اسرائیل کی مخالفت میں تمام اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ سرگرم اور متحرک نظر آتا ہے۔ اسرائیل کی وحشت اور درندگی کے خلاف ڈٹا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار رہا ہے۔ جبکہ اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے والے مسلمان ممالک اس معاملے میں مصلحتوں کی چادر اوڑھے خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

مثالی حکومت:

ترکی کے وزیر اعظم طیب اردگان اور صدر مملکت عبداللہ گل کی حکومت ایک مثالی حکومت ہے۔ اس حکومت نے اقتدار نشین ہوتے ہی معیشت سمیت ہر لحاظ سے ملک کی حالت بدل کر رکھ دی۔ عوام میں ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ لوگ انتہا پسند مذہبی ملا ہیں۔ ترکی رسوم ورواج بدل دیں گے۔ چار چار شادیاں کرائیں گے۔ مگر انہوں نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اپنے بارے میں پھیلائی گئی تمام غلط فہمیوں کو اپنے روشن کردار سے دور کر دیا۔ عوام کی نجی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ ان پر اسلامی معاشرت مسلط کرنے کے بجائے اس کے لیے ترغیبی انداز اختیار کیا۔ ان مذہبی دیوانوں نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام وشعائر کی پابندی کرنے والے دین مخالفوں اور

مذہب بیزاروں کے مقابلے میں حکومت کا نظام زیادہ بہتر اور مستحکم طریقے سے چلا سکتے ہیں۔ تمام تر مخالفانہ منفی پروپیگنڈے کے باوجود 2011ء کے انتخابات میں ان کی سیاسی جماعت جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ نے اسلام سے وابستگی کی بنیاد پر پچاس فیصد سے زیادہ ووٹ لیے اور دنیا بالخصوص امریکا اور یورپ کو حیرت زدہ اور فکر مند کردیا۔ امریکا اور یورپ اس لیے بھی پریشان ہیں کہ مصر، لیبیا، شام، عراق سمیت تمام اسلامی ممالک اس وقت دینی انگڑائی کے لیے بطور نمونہ ترکی کو دیکھ رہے ہیں۔ ترکی کے لوگ معاشرتی زندگی کے لحاظ سے جدید مغربی تہذیب پر کاربند ہونے کی نسبت سے مہذب اور مذہبی لحاظ سے سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ یہاں کا نظام حکومت جمہوری ہے۔ معاشی لحاظ سے ملک ترقی یافتہ ہے۔ اس وقت ترکی واحد ملک ہے جس نے اسرائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی ہیں اور اس کے حکمرانوں نے اپنی بصیرت اور حکمت سے بعض موقعوں پر اسرائیل کو اہل کفر و باطل کی تمام تر پسِ پردہ حمایت کے باوجود بظاہر دنیا بھر میں تنہا کردیا۔ ضرورت اور موقع ہے کہ ترکی سے پاکستان اپنے تعلقات اور زیادہ مضبوط کرے۔ تعلقات کی یہ مضبوطی دینی اخوت اور محبت کے لحاظ سے تو یقیناً نتیجہ خیز اور قابل تحسین ہوگی بلکہ معاشی ترقی اور بین الاقوامی وقار و مقام کے لحاظ سے بھی ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس وقت ترکی معیشت اور حکومتی نظام سمیت ہر لحاظ سے ایک مثالی اور معیاری ملک بن چکا ہے۔ ترکی میں تھنک ٹینک آزاد اور خود مختار ہے۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے ممبران جمہوری طریقے پر بحث و تمحیص کر کے کسی نتیجے پر متفق ہوتے ہیں اور پھر اس کی روشنی میں اتفاق رائے سے ملکی پالیسیاں ترتیب دیتے ہیں۔ صدر وزیر اعظم اور وزراء سمیت تمام حکومتی عہدے دار احتساب کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ عدلیہ بالکل آزاد ہے۔

سیسی سے گولن تک

''ہیملن سے گولن تک'' نامی کالم میں راقم الحروف نے گولن گروپ کی جس بلّی کو ''پاک ترک سکول'' کے تھیلے میں بند دکھایا تھا، وہ ترک حکومت کے خلاف اٹھائے گئے حالیہ اسکینڈل میں باہر آ گئی ہے۔ ترکی میں اردگان حکومت کے خلاف کیس 17 دسمبر کو عدالت میں پیش ہوا جبکہ تین دن پہلے 14 دسمبر کو امریکی سفیر کا بیان آیا: ''ہم نے اردگان حکومت کو کہہ دیا تھا فلاں معاملے کو درست کرو۔ انہوں نے ہماری بات نہ مانی اب آپ ایمپائر کے ڈوبنے کا منظر دیکھیں گے۔'' یہاں امریکی سفیر نے جان بوجھ کر گورنمنٹ کی جگہ ایمپائر کا لفظ استعمال کیا ہے تا کہ اردگان کی اسلامی حکومت پر طنز کیا جا سکے۔ صرف تین دن بعد ترک عدلیہ نے جن میں اکثریت گولن گروپ کے اسکول کالجوں سے تعلیم یافتہ افراد کی ہے، اسلام پسندوں کی حکومت کے خلاف اپنی تاریخ کی تیز ترین اور سریع الحرکت کاروائی کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ گولن صاحب کے متعلق امریکا و اسرائیل سے تعلقات کے حوالے سے جو خدشات پائے جاتے تھے، وہ بے جا نہ تھے۔ گولن صاحب جو اسلامک اسکالر اور فلاسفر کے طور پر اپنا تعارف چاہتے ہیں، لیکن نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر اپنا وطن اصلی ترکی اور وہ تمام اسلامی ممالک جہاں ان کے اسکول اور ادارے قائم ہیں، چھوڑ کر امریکا میں قیام پذیر ہیں

اور اسرائیل سے قریبی روابط رکھتے ہیں، نے اس موقع پر اپنے دوستوں کی شہہ پر جس طرح اردگان حکومت کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی ہے، اس نے تمام تکلفات ایک طرف رکھ کر دنیا کو صاف بتا دیا ہے کہ ان کی تعلیمی و اخلاقی تحریک کے ڈانڈے کہاں سے ملتے ہیں اور وہ آج تک کس کے سرمائے پر، کن مقاصد کے لیے اور کس وقت کے انتظار میں تحریک چلا رہے تھے۔

احقر نے ایک گذشتہ کالم میں گولن گروپ اور پاک ترک اسکول کے پردہ زنگاری کے پیچھے چھپے معشوق پر کافی حد تک پردہ رکھنے کی کوشش کی تھی، تاکہ بلاوجہ کا انتشار نہ پھیلے، مگر اب چونکہ یہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں لہٰذا قوم کو ان ''پاک ترک سکول'' اور ان کے چلانے والوں سے قریبی تعارف کروانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ عام پاکستانی حضرات سمجھتے ہیں کہ ہر ترک تنظیم یا ادارہ طیب اردگان سے وابستہ اور ان ہی کے ذہن کا پرچارک ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردگان کو امریکا و اسرائیل اور ترکی کی ترقی سے خائف بعض یورپی ممالک سے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا ''گولن گروپ'' اور ان کی نام نہاد تعلیمی تحریک سے تھا۔ اس تحریک نے جو در حقیقت سیکولر ہے اور امریکا و اسرائیل بلکہ تکلف برطرف صیہونیت نواز اور اسرائیل کی منظور نظر تحریک ہے، نے صیہونی مقاصد کی تکمیل کے لیے ترکی اور بیرون ترکی جو ادارے کھول رکھے تھے، ان کا واحد مقصد وہ تھا جو فروری 2012ء کو ترکی میں سامنے آ گیا...... اور مستقبل میں کسی وقت ہمارے ہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

کہانی 7 فروری 2012ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب تیسری بار منتخب ہونے والے ترک تاریخ کے مقبول ترین وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے خاقان فیضان کو انٹیلی جنس کا سربراہ مقرر کیا۔ صاف ستھرے کردار کا مالک یہ شخص اپنی قابلیت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس میں وہ خامی جو گولن گروپ کو پسند نہیں آئی، اس کا امریکا و اسرائیل کا منظور نظر

نہ ہونا تھی۔ دوسری طرف گولن تحریک سے وابستہ تعلیمی اداروں سے فارغ شدہ اکثریت کو انہوں نے عدلیہ اور پولیس دو اداروں میں اس حد تک بھرتی کروا دیا تھا کہ وہ اردگان کے آدمی کو اپنا سربراہ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس تحریک نے اپنے ہاں کے پڑھے ہوئے افراد کو عدلیہ اور پولیس میں بھرتی کروانے کی مہم عرصہ دراز سے چلائی ہوئی تھی۔ وہ ان دو اداروں کے ذریعے ملک کو اپنے کنٹرول ...... یا اپنی سرپرست قوتوں کے کنٹرول ...... میں رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ چیز ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے اردگان حکومت کو اس امر کی سزا دینے کی ٹھان لی کہ جو شخص امریکا و اسرائیل کو پسند نہیں، اسے امریکا و اسرائیل نواز دو ترک اداروں عدلیہ اور انتظامیہ کا سربراہ کیوں بنایا گیا؟ یہ تقریباً ویسی صورتحال ہے جیسے راجہ بازار میں جلوس گذارنے کا پس منظر ہے کہ چونکہ انتظامیہ میں ایک مخصوص مسلک کے لوگ ایک مخصوص کاز کے لیے بھرتی کروائے گئے ہیں۔ لہٰذا کوئی مانے نہ مانے، کسی کو وجہ سمجھ آئے یا نہ، انہوں نے اس ملک میں وہی کرنا ہے جو انہیں بھرتی کروانے والے سربراہان مسلک نے کروانا ہے۔ اگرچہ اکثریت سر پیٹتی رہے، لیکن ایک مخصوص طبقے کی طرف سے اقتدار کی کنجیاں قابو میں رکھنے کی مہم ہمارے یہاں بھی عرصے سے چلی ہوئی ہے اور پاک ترک سکولز کو کھلی چھوٹ دی گئی اور قوم نے ان کو ''اسلامی ترک بھائی'' سمجھ کر اپنے بچے یہاں بھیجنا نہ چھوڑے تو صیہونیت نواز یہ طلبہ جو کل کسی ادارے میں افسر ہوں گے، یہاں بھی ویسا ہی گل کھلا سکتے ہیں جیسا آج کل ترک حکومت کے خلاف قواعد وضوابط کو پامال کر کے عدلیہ کی طرف سے گل کاریاں کی جارہی ہیں۔ خطیر رقم پر تعلیم پانے والی یہ نسل خدا واسطے کو نہیں، استعمار نوازی کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

کہانی کا دوسرا حصہ جس نے گولن نواز عدلیہ اور پولیس کو سرگرم ہونے اور غیر روایتی سریع الحرکت مقدمات بنانے پر آمادہ کیا، ''درس خانہ'' کو قواعد وضوابط کا پابند کرنے کی

کوشش ہے۔ ’’درس خانہ‘‘ ایک قسم کے ٹیوشن سینٹر کا سلسلہ ہے جو ترکی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اردگان حکومت تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ جب اس کے موجودہ سربراہ برسر اقتدار آئے تو ترکی کے اسکولوں میں ایک جماعت میں 60 بچے زیر تعلیم ہوتے تھے۔ محض ایک عشرے سے کم وقت میں اتنے اسکول قائم کیے گئے کہ یہ عدد نصف پر آ گیا ہے اور فی جماعت 30 بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ اردگان حکومت کا عزم ہے کہ مزید اتنے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں کہ یہ تعداد 20 پر آ جائے۔ اس کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ان ’’درس خانوں‘‘ کا معیار بہتر کیا جائے۔ ان میں محض امتحانات کی تیاری اور سوالیہ پرچے حل کرنے کی تیکنیک سکھانے پر اکتفا نہ ہو بلکہ باقاعدہ معیاری تعلیم دی جائے۔ اس غرض کے لیے ترک حکومت نے اعلان کیا کہ درس خانہ کے منتظمین اپنے ٹیوشن کے ادارے کو پرائیویٹ سکول میں تبدیل کرنے کے لیے حکومت سے بلاسود قرض لے سکتے ہیں۔ دوسری سہولت یہ فراہم کی گئی کہ ان کے اساتذہ کو سرکاری استاذ کے طور پر بھرتی بھی کر لیا جائے گا۔ اگلے مہینے ترک حکومت پچاس ہزار اساتذہ کی اسامیوں کا اعلان کر رہی ہے۔ ان میں ترجیحا ’’درس خانہ‘‘ کے اساتذہ کو تعینات کر لیا جائے گا۔ جو درس خانے ’’گولن گروپ‘‘ کے علاوہ دوسرے کسی انتظام کے ماتحت تھے، وہ فوراً مان گئے اور ان آسان شرائط کو اپنے لیے غنیمت سمجھا۔ گولن گروپ اڑ گیا اور اس نے یہ درس خانے ہاتھ سے جاتے دیکھ کر...... جو اس کی عدلیہ اور پولیس میں من پسند افراد کی بھرتی کی نرسری تھے...... حکومت کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ عدلیہ اور پولیس میں موجود اس سے وابستہ افراد نے گذشتہ چودہ ماہ کے دوران اردگان حکومت سے وابستہ وزیروں اور سیاست دانوں کے خلاف درون خانہ مقدمات کی تیاری شروع کر دی اور جبکہ مارچ 2014ء میں بلدیاتی انتخابات ہونے والے تھے، سے دو ماہ قبل ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے شروع کر دیے۔ ان میں بدنیتی کا عنصر اس قدر واضح ہے

کہ بچہ بھی اصل حقیقت سمجھ سکتا ہے، لیکن گولن گروپ اتنا سوختہ اور برافروختہ ہو چکا ہے کہ جج حضرات تمام قواعد وضوابط کو پامال کرتے ہوئے اردگان حکومت کے خلاف اپنی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ مثلاً:

1- اردگان کا بیٹا اور بیٹی ایک وقف ادارہ چلاتے ہیں جس کا اردگان حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں 2 جنوری کو عدالت میں حاضری کا حکم ہے۔ اب دنیا کا مسلّم قانون ہے کہ عدالت میں حاضری کا نوٹس عدالت اور ملزم کے مابین مراسلہ ہے۔ اسے افشاء نہیں کیا جاتا۔ مگر اس وقت گولن گروپ کی امریکا نواز عدلیہ کی کرم نوازی سے اردگان کے بیٹے کی عدالت طلبی کے خط کا عکس میڈیا اور فیس بک کی زینت بنا ہوا ہے۔

2- حکومت کے خلاف اٹھائے گئے اسکینڈلز کے بارے میں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اس کاروائی کی منظوری 22 افراد پر مشتمل جیوری نے دی ہے۔ جبکہ اس جیوری کے سربراہ سمیت اکثر ارکان کو بھی اس کی خبر نہیں کہ چند مخصوص افراد درون خانہ حکومت کے خلاف عدالتی مہم کیونکر چلا رہے ہیں؟

3- دنیا بھر کا قانون ہے کہ عدالت میں طلب کیے گئے ملزم کے بارے میں مقدمات کی تفصیل سے میڈیا کو آگاہ نہیں کیا جاتا۔ یہاں ملزم بعد میں عدالت میں پیش ہوتا ہے اور جج صاحبان کی فائل میں موجود اوراق میڈیا میں پہلے سے شائع ہو جاتے ہیں۔

4- تین الگ الگ مقدمات کو ایک کر کے یہ تاثر پیش کیا جا رہا ہے کہ حکومتی جماعت ملک کا پیسہ کھا رہی تھی۔ خلق بینک کیس، رشوت ستانی کیس اور بلدیاتی اداروں کے کیس تین قطعاً مختلف مقدمات ہیں، لیکن خود عدلیہ کی طرف سے انہیں جوڑ کر ایک بنا کر دکھایا جا رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے غرض ومقصد انصاف کا بول بالا نہیں، بلکہ معاملہ گولن گروپ کے ہاتھ سے عدلیہ اور پولیس دو تعلیم کے ادارے جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہونے کا ہے۔

میڈیا میں موجود گولن نواز رائٹرز اتنا آگے چلے گئے ہیں کہ ایک لکھاری نے لکھا ہے: ''اگر امریکا اور اسرائیل ہمارا پیسہ بچا کر دیتے ہیں تو امریکا زندہ باد، اسرائیل زندہ باد۔''

طیب اردگان جیسے زیرک شخص کو صورتحال کی حقیقت کا بخوبی ادراک ہے۔ وہ گولن گروپ کے بجائے ان قوتوں سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں جو ان کی سرپرست ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکی کو نہ چاہنے والے یہ صورتحال پیدا کر رہے ہیں۔ انہوں نے صاف کہا کہ اگر کسی ملک کا سفیر اپنے ملک کی بالادستی قائم کرنے کے لیے یہاں غیر سفارتی اقدامات کرے گا تو ہم بین الاقوامی قانون کے تحت اپنے اختیارات کا بھرپور طور پر استعمال کریں گے۔

یہ بھی انکشاف ہوا کہ ''غازی پارک'' کے حوالے سے گذشتہ مئی جون 2013ء میں اسرائیل نواز قوتوں نے اردگان حکومت کے خلاف جو مہم چلائی تھی، اس میں پولیس نے عوام کو بھڑکانے کے لیے حکومتی احکامات کے بغیر جو کارروائیاں کی تھیں، ان میں گولن گروپ کی ہدایات کا ہاتھ تھا۔ اردگان اپنے تجربے اور بصیرت کے تحت تحمل اور تدبیر کے ساتھ مظاہرین سے نمٹ رہے تھے، مگر پولیس میں شامل گولن افسران کی کوشش تھی کہ عوام میں اشتعال پھیل جائے اور نزلہ حکومت کے پر گرے۔ وہ تو خیر گذری کہ حکومتی رویّے اور بصیرت نے ان معاملات پر قابو پالیا جو بین الاقوامی استعمار اور ان کے نمایندے مقبول ترک حکومت کے خلاف برپا کرنا چاہتے تھے۔

اردگان حکومت کے خلاف عدلیہ کے الزامات کی فہرست میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے کرد باغیوں سے مذاکرات کیے ہیں جبکہ کرد کئی ہزار افراد کے قاتل ہیں۔ اس طرح مذاکرات اگرچہ کیے بھی گئے ہیں تو وہ سیاسی حکومت نے نہیں کیے، ترک خفیہ اداروں نے کیے ہیں جن کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے خلاف برسرپیکار گروہوں سے بہرصورت

نمٹیں۔ مذاکرات کی میز پر یا بغاوت کے میدان میں۔ کمال دیکھیے کہ مغربی قوتیں ہمیشہ زور دیتی ہیں کہ اندرونی مسائل کو طاقت کے بجائے بات چیت سے حل کیا جائے اور جب یہی کام اردگان نے کرنا چاہا تو اس کے خلاف مغرب نواز قوتیں خم ٹھونک کر میدان میں آ گئی ہیں۔ گولن گروپ نے تمام حجابات اتار کر تکلف برطرف رکھ دیا ہے اور مارچ میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات کے لیے بائیں بازو والوں سے اتحاد کر کے اس اسلامی فلسفے اور تصنیفات و تالیفات کے پس پردہ حقیقی سوچ سے دنیا کو آگاہ کر دیا ہے جو آج تک ان کی پہچان رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا تنظیم کے ڈانڈے امریکا و اسرائیل سے ملتے ہوں، اس سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی، نہ ان کی نیت و عمل پر اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر اب واضح ہو چکا ہے کہ گولن صاحب رہتے امریکا میں تھے، لیکن ان کا دل اسرائیل کے ساتھ کیوں دھڑکتا تھا؟ نیٹ پر ان کے تعارف میں موجود ہے کہ وہ اردگان حکومت کے برخلاف جس نے ''فریڈم فلوٹیلا'' بھیج کر صیہونیت پر کاری ضرب لگائی تھی، اسرائیل کے لیے بہت نرم رویہ رکھتے ہیں۔ تبھی انہیں مغرب کی خاموش حمایت حاصل ہے۔ ان کا امتیاز یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ اردگان عالم اسلام میں اتحاد کے قائل ہیں جبکہ گولن عرب ممالک کے بجائے وسطی ایشیا اور بلقان کے ممالک سے قرب چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان ممالک سے ترکی کے علاقائی و جغرافیائی تعلقات ہیں اور عرب سے ان کا رشتہ محض دینی، نظریاتی اور فکری ہے۔ لیکن اس کا کوئی جواب گولن گروپ کے پاس نہیں کہ علاقائی رشتہ تو پڑوسی ملک شام کے ساتھ بھی ہے، اس کے مظلوموں اور مہاجروں کے لیے اس مالدار ترین گروپ نے کیا کیا؟ بقیہ ترکوں نے تو ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر دیا۔

الغرض ترکی کا موجودہ بحران اردگان حکومت کے خلاف اسکینڈلز کی نہیں، آئندہ بلدیاتی

انتخابات میں گولن گروپ اور بائیں بازو کے اس اتحاد کی جنگ ہے جو صیہونیت نواز مقاصد کو ترکی میں پورا ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ اردگان کی ترقی کی غیر معمولی رفتار سے خائف قوتیں کھل کر سامنے آ گئی ہیں اور اپنا سب کچھ جھونک دیا ہے، اس لیے معرکہ زوروں پر ہے۔ آر یا پار۔ ہیملن نے کہا تھا: ''میں نے باسفورس کنارے باسفورس یونیورسٹی اس لیے قائم کی ہے کہ سلطان فاتح نے یہاں سے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا۔ میں یہاں سے اسلامبول (استنبول) فتح کروں گا۔'' گولن گروپ ہیملن کے مقاصد کو آگے بڑھا رہا ہے۔ اور اب اس کے نمایندے ایکسپو سینٹر میں اپنے چیف کی ''اسلامی'' کتابوں کا اسٹال لگاتے ہوئے یقیناً شرمائیں گے کہ سعودی عرب نے جس طرح مصری فوج کو 12 ارب ڈالر دے کر اخوان کو دبانے میں مرکزی کردار ادا کیا، گولنسٹ صاحبان نے بھی اردگان حکومت کو گرانے میں بائیں بازو کا ساتھ دے کر اپنے تشخص کو مسخ کر ڈالا۔ ترکی کے یخ بستہ ماحول میں مصر جیسا معرکہ گرم ہے۔ سیسی سے گولن تک مہرے حرکت میں ہیں۔ وہاں اخوان کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے اور یہاں اردگان حکومت گرانے یا کم از کم آیندہ انتخابات میں ہرانے کی تیاریاں ہیں۔ دیکھیں تمام قواعد کو پامال کرنے والی عدلیہ جیتتی ہے یا اردگان کی بصیرت اور خدمات ترک عوام کے دل میں اپنی جگہ کو مزید مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں؟

آخری اطلاعات آنے تک اردگان حکومت کے خلاف یہ پورے کا پورا مالیاتی اسکینڈل محض اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ عراق کی مرکزی اور شمالی دونوں حکومتوں نے عراق کے تیل کی ترسیل بذریعہ ترکی اور وصولی زر کے لیے ترکی کے ''خلق بینک'' سے معاہدہ کر لیا تھا۔ عالمی معاشی دہشت گردوں کو یہ برداشت نہ تھا۔ اردگان نے حکومت سے عام لیتے ہوئے اس معاہدے سے دست برداری کا اعلان کر دیا ہے۔ اب عراق نے دوبارہ یہ معاہدہ امریکی بینک سے کر لیا ہے تو شاید امریکا اور اس کے چہیتے گولن گروپ کے جذبہ حب الوطنی میں ٹھنڈ پڑ

جائے اور معاملات اپنی جگہ واپس آ جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تیلیوں کے اس ہنگامے میں گولن صاحب نے اپنی تحریک کو داغدار کرلیا ہے۔ اور اپنی حیثیت کو واضح طور پر متنازعہ بنا لینے کے بعد اب وہ اپنے حامیوں میں وہ مقام و مرتبہ قائم نہ رکھ سکیں گے جو کبھی ان کے لیے باور کیا جاتا تھا۔

کے ایف جی اور سی آئی اے

ترکی کی موجودہ صورتحال پر دو مضامین چھپنے کے بعد قارئین کی جانب سے بہت سے سوالات کیے گئے کہ خواجہ فتح اللہ گولن (کے ایف جی) کی تحریک، ان کی تاریخ، طریقۂ واردات، ان کے نظریات، ان کے یہودیوں سے تعلقات کی حقیقت معلوم ہو اور مغربی ممالک وخفیہ اداروں کی طرف سے ان کے ساتھ تعاون بالخصوص ترکی میں موجودہ سیاسی بحران اور اسلام پسند حکومت کی کمر میں خنجر گھونپنے کے پس پردہ عوامل معلوم کیے جاسکیں۔ میں ان شاءاللہ حتی الوسع جستجو وتحقیق کے بعد چند باتیں عرض کروں گا۔ اس کالم میں محترم جناب فتح اللہ گولن اور ان کے یہودیوں اور سی آئی اے سے تعلقات کی کچھ گرہیں کھول کر ان کے طریقۂ واردات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ترکی کے قومی سراغ رساں ادارے ”ایم آئی ٹی“ کے سربراہ جو کہ 1986ء میں ریٹائر ہوئے اور بعد میں ”تانسو چلر“ سابقہ وزیراعظم ترکی کے انٹیلی جنس چیف بھی رہے، نے 2010ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ”انقلاب اور فتنے کا قریبی شاہد“ ہے۔ اس میں موصوف نے واضح الفاظ میں لکھا کہ فتح اللہ گولن کی تحریک سی آئی اے کی ایک کور تنظیم ہے جس نے 1990ء کی دہائی میں 130 سی آئی اے کے اہلکاروں کو ازبکستان اور کرغیزستان

میں اپنے اسکولوں میں معلّم کے روپ میں تقرر کیا، تا کہ وہ ان ممالک میں سی آئی اے کے لیے کام کرسکیں۔ گولن تحریک کے امام فتح اللہ گولن 1998ء میں جب ''علاج'' کے لیے امریکا گئے تو سی آئی اے کے دو ایجنٹس گریم فُلر اور فندس جارج کے ذریعے امریکا میں رہائشی اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس دوران اُن کا ربط ضبط سی آئی اے سے اتنا بڑھا کہ رُوس کی حکومت نے اس تحریک کے اسکولوں پر پابندی لگادی اور ''جماعت نور'' کے تمام کام کو روک دیا گیا اور 2002ء سے 2004ء کے درمیان ان کے 20 سے زیادہ کارکنوں کو رُوس سے بے دخل کردیا گیا۔ الزامات کی بنیاد سی آئی اے کے لیے کام تھا۔ 1992ء میں ازبکستان کی حکومت نے بھی ان کے اسکولز پر پابندی لگادی۔ سی آئی اے اساتذہ کے روپ میں بھرتی کیے گئے اپنے ان اہلکاروں سے کیا چاہتی تھی؟ اس نے وسطِ ایشیا میں ان کے ذریعے اسلامائزیشن کی مہم شروع کی تھی تا کہ تیار ہونے والے یہ نیم مسلمان بوقت ضرورت ان کے کام آسکیں۔ ان باتوں کی تصدیق کے لیے یہ نکتہ ملاحظہ کیجیے کہ گریم فُلر جن کا تذکرہ اوپر آیا جو کہ سی آئی اے کے کابل میں اسٹیشن چیف تھے۔ انہوں نے ترکی کے انٹیلی جنس چیف کی کتاب میں دیے گئے حقائق پر گولن کا دفاع کیا۔ انہیں اس دفاع کی کیا ضرورت تھی اور گولن خواجہ سے ان کا کیا تعلق تھا؟ یہ موصوف گریم فُلر وہی ہیں جنہوں نے امریکا میں گولن صاحب کے دفاع میں ایف بی آئی کو خط لکھے اور یہ وہی ذات شریف ہیں جنہوں نے گولن کو امریکا میں گرین کارڈ لینے کی درخواست میں اپنا نام بطور ریفرینس لکھا۔ ان کی ہمدردیاں اور ان کی طرف سے ان حضرات کا دفاع کیا داستان سناتا ہے اور کس چیز کا قرینہ ہے؟ اس کے لیے تھنک ٹینک سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ اب ترکی میں ان حضرات کی سرگرمیوں کی طرف آیئے۔

17 دسمبر 2013ء کو ہونے والے آپریشن کے بعد وزیراعظم ترکی نے اپنے ایک

عوامی خطاب میں واضح طور پر کہا: ''ہمیں معلوم ہے کہ امریکا 17 دسمبر کے کرپشن اسکینڈل کے پیچھے ہے۔'' اسی طرح وزیراعظم نے 31 مئی 2013 کو استنبول کے تقسیم اسکوائر فسادات کے بارے میں واضح طور پر کہا تھا: اس کے پیچھے بھی امریکا ہے۔ ترکی میں امریکا کے سفیر نے اپنے رویّے سے اس کی تصدیق کردی۔ انہوں نے 17 دسمبر کو ہونے والے واقعہ کے بارے میں یورپی یونین کے سفیروں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں پیش گوئی کی: ''ہم نے انہیں کہا تھا کہ ایران کے ساتھ تعلقات ختم کرو، لیکن اِنہوں نے ہمیں نہ سنا۔ اب آپ سب ایک سلطنت کو گرتا ہوا دیکھیں گے۔'' امریکی سفیر کا یہ بیان غماز تھا کہ 17 دسمبر کے واقعہ کے پیچھے امریکا نے وزیراعظم طیب اردگان کی حکومت کو گرانے کی سازش کی تھی۔ تب ہی پر وزیراعظم طیب اردگان نے واشگاف الفاظ میں کہا: ''بعض سفیر اشتعال انگیزی پھیلا رہے ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اپنا سفارتی کام کرو۔ ہم تمہیں اپنے ملک میں رکھنے پر مجبور نہیں ہیں۔''

امریکا کے سفیر نے اس کے جواب میں 21 دسمبر کو اپنے Twitter اکاؤنٹ سے کہا کہ امریکا اس سازش میں شامل نہیں ہے اور کسی کو ترکی اور امریکا کے تعلقات کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ لیکن وہ یہ بتانے سے گریزاں رہے کہ ان کی گفتگو میں ترکی حکومت گرانے کی پیش گوئی کس بنیاد پر دی گئی تھی؟ نہ گولن گروپ یہ واضح کرسکا ہے کہ امریکا کی پیش گوئی کو سچا کرنے کے لیے ترکی حکومت کے خلاف استعمال ہونا ان کے متعلق کیا تاثر قائم کرتا ہے؟

31 جنوری 2014 کو انقرہ کے میئر ملیح گوک جک نے گولن گروپ کے برپا کردہ بحران کے حوالے سے کہا: ''ترکی کی زبردست اقتصادی ترقی کو دیکھ کر واشنگٹن کے نیوکانز پاگل ہوگئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وزیراعظم طیب اردگان اور ان کی جماعت کی حکومت کو

ختم کیا جائے۔'' امریکا جب اس مقصد میں خود کامیاب نہ ہو سکا تو انہوں نے تعلیم برائے ترقی کے نام پر چلنے والی گولن گروپ کی تحریک کو استعمال کر کے ترکی کی اسلام پسند حکومت کو گرانے کی بھرپور کوشش کی۔ امریکا سے اس گروپ کے تعلق کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ ان میں ان کا اپنا رویّہ بھی شامل ہے۔ ترکی کے وزیر اعظم نے 17 دسمبر کے جعلی اور ناکام کیس کو کھولتے ہوئے جب ان پولیس افسروں ججوں اور سرکاری وکلاء کو سرزنش اور تبادلے شروع کیے جو کہ اس سب کے پیچھے تھے تو اس کے جواب کے طور پر فتح اللہ گولن نے اپنے ایک خطاب میں رجب طیب اردگان اور ان کی حکومت کو سخت بددعا دی۔ یہ وہ بددعا تھی جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو دی تھی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: " اَللّٰهُمَّ شَدِّدُ شَمْلَهُمْ، وَدَمِّرُ دِيَارَهُمْ."

طیب اردگان نے اس بددعا کا جواب یوں دیا کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔'' اور کہا: ''بددعا پر لعنت اور دعا کی دعوت۔'' وزیر اعظم کا یہ قول ترکی میں ایک نعرہ بن گیا۔ ''بددعا پر لعنت اور دعا کی دعوت'' اگر فتح اللہ گولن اسلام پسند اور مسلمانوں کا درد رکھتے تھے تو انہوں نے کیوں اتنے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا؟ ایک اسلامی حکومت کو گرانے کی کوشش کے بعد اس کے لیے بددعا دل میں چھپے کن جذبات کی غمازی کرتی ہے؟

اب ہم اس جماعت کے یہودیوں سے تعلقات اور اسرائیل سے قریبی روابط کی داستان پیش کرتے ہیں۔ 17 دسمبر 2013 کے واقعے کے بعد وزیر اعظم ترکی نے بیان دیا کہ ترکی کی حکومت گرانے کی سازش دراصل مئی 2010 میں غزہ جانے والے ''فریڈم فلوٹیلا'' کا ردِ عمل ہے۔ اسرائیل ترکی میں ایسی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا جو فلسطینی مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہو۔ اس ''فریڈم فلوٹیلا'' کی روانگی کے تاریخی موقع پر فتح

اللہ گولن نے فرمایا: ''فریڈم فلوٹیلا لے جانے والوں کو اسرائیل سے اجازت لینی چاہیے تھی اور فریڈم فلوٹیلا پر جان سے گذرنے والے شہداء شہید نہیں ہیں۔'' ان کے اس بیان پر ترکی میں شدید ردِ عمل سامنے آیا اور ان کے کئی ماننے والے ان کو چھوڑ گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فتح اللہ گولن کی جماعت اسرائیل میں اسکول کے ذریعے یہودیوں کی تعلیمی و تربیتی خدمت پورے زور و شور سے کر رہی ہے اور ان کے سکول غزہ یا فلسطینی علاقوں میں بالکل نہیں ہیں، نہ ہی اس جماعت نے کبھی مجبور و مظلوم فلسطینیوں کی مدد کی اور نہ کبھی ان کی خدمت کا نام لیا۔ عالم اسلام کی نظریاتی شخصیت سے بُعد، ترکی کی نظریاتی حکومت کے گرانے میں بھرپور حصہ لینا اور عیسائیوں کے پوپ پال سے لے کر یہودیوں کے چیف ربائیوں تک سے قریبی تعلقات رکھنا، اپنی ذاتی نشست گاہ میں مخصوص یہودی علامات اہتمام سے آویزاں کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو درپردہ فری میسن کے ساتھ تعلقات کی کہانی سناتی ہیں۔

صبر و شکر......آسان زندگی کا آسان نسخہ

صوفیاء کا کہنا ہے کہ صبر و شکر دو ایسی چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کو ہلکی پھلکی اور آسان ترین بنا دیتی ہیں۔ خاص کر تحریکی اور اجتماعی کاموں میں اللہ تعالیٰ کبھی صبر کے مناظر سامنے لاتا ہے اور کبھی شکر کے مظاہر دکھا دیتا ہے۔ مومن کے لیے اس عارضی آزمائشی وقفۂ حیات میں دونوں چیزیں خیر ہی خیر ہیں۔ مصر میں جب ہم اپنے بھائی ڈاکٹر مرسی اور ان کے ساتھیوں کو ابتلا میں مبتلا دیکھتے ہیں تو یقین جانیے اگر صبر کا ثواب سامنے نہ رکھیں تو دل خون خون ہو جائے، جبکہ دوسری طرف ترکی میں طیب اردگان کو مختلف طرح کی اندرونی و بیرونی سازشوں سے کامیابی کے ساتھ نمٹتے دیکھتے ہیں تو شکر کے احساس سے دل کو ٹھنڈک پہنچتی اور مزید کامیابیوں کی دعا بے ساختہ لبوں پر آجاتی ہے۔

ڈاکٹر مرسی اور اخوان کے ساتھیوں نے.....اس عاجز کا ناقص خیال ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے.....کسی قدر جلدی کی۔ ان کا پہلا بیان ہی اس پر مشتمل تھا کہ ہماری منزل القدس ہے۔ القدس کس صاحب ایمان کی منزل نہیں؟ لیکن کیا منزل تک پہنچنے کے لیے جس صبر اور عزم کی ضرورت ہے وہ دل کی بات زبان پر لانے سے متزلزل ہوتا ہے یا نہ لانے سے اس پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ سلطان محمد فاتح کے کمرے میں دنیا کا نقشہ ٹنگا ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت اس

میں سے یورپ کے نقشے پر نظریں جمائے خدا جانے کیا سوچتا تھا، مگر دل کی بات اپنے قریبی ساتھیوں کے سامنے لانا بھی اپنی گہری طبیعت کے خلاف اور مقاصد کے حصول میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے عجوبہ نما طریقے کی دریافت کے لیے اس نے 52 راتیں استخارہ کیا۔ جب وہ خشکی پر تختے بچھا کر چربی کی لہروں پر کشتیاں چلوا رہا تھا، تب بھی صاف نہ بتایا کہ کرنا کیا چاہتا ہے؟ بس اپنے خصوصی دستے ''ینی چری'' سے اس کی امید ہوتی تھی کہ وہ جو کہے گا کر گذریں گے اور پھر دنیا نے دیکھا کہ اس کے تربیت یافتہ اور وفادار دستے کے سردار آغا حسن نے قسطنطنیہ کے قلعے کی دیوار پر چڑھ کر وہ کر دکھایا جو وہ چاہتا تھا، مگر منہ سے بولتا نہ تھا۔ وفا کے بدلے وفا کی شکل میں کام مانگتا تھا۔ آپ القدس سے وفا کرتے، بدلے میں پوری امت آپ سے وفا کرتی۔ اظہار مقاصد کبھی کبھی ''اِسْتَعِیْنُوْا فِیْ اُمُوْرِکُمْ بِالْکِتْمَانِ'' (اپنے کاموں میں رازداری کا اہتمام کر کے مدد لو) کے خلاف بھی ہوتا ہے اور رکاوٹ بھی بن جاتا ہے۔

دوسری چیز جن میں ہمارے مصری بھائی مستقل مزاجی سے دیر تک کام نہ کر سکے۔ وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنے تربیت یافتہ افراد کی بکثرت تیاری اور ان کے اخلاق، نرم مزاجی اور حسن سلوک کے ذریعے بقیہ جماعتوں کے کارکنان یا عام عوام کا دل جیتنا تھا۔ ترکی حضرات نے اس سلسلے میں طویل عرصے سے انتھک محنت کی تھی۔ ایک مرتبہ تینوں افواج کے سربراہوں نے جب بیک وقت طیب اردگان کو (اللہ کرے وہ خود کو اپنے نام کی طرح ثابت کرے) استعفیٰ پیش کیا، تو آہنی اعصاب کے مالک اس رہنما نے پیشانی پر بل لائے بغیر سکون سے تینوں کا استعفیٰ لے کر میز کی دراز میں رکھا اور رخصتی مصافحہ کے لیے تینوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اگلے دن اس کے نظریات کے حامل سربراہان افواج ترکی کی کمان سنبھال چکے تھے اور اسے حیران کرنے کی کوشش کرنے والے خود حیران و سرگرداں تھے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے مصری بھائیوں کی مشکل دور فرمائے۔ فوج کی سربراہی پر سیسی جیسے ابن الوقت مادرزاد یہودی کے براجمان ہوتے ہوئے بہت احتیاط اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیے تھا۔ ابھی کونپل نکلے چند روز ہوئے ہیں۔ بہار آنے، کلیاں چٹکنے، پھول کھلنے، مہک پھوٹنے اور گلدستہ سجنے میں تو بہت سا زمانہ باقی ہے۔ سہج سہج پکنے کا انتظار اور خون جگر سے سیرابی کا فریضہ بھی تو ادا کرنا ہے۔ میرے بھائیو! جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ تمہاری مشکلات دور کرے اور تمہارے سنگدل دشمن پر تمہیں فتح نصیب کرے۔ راقم کا ماتھا اس وقت ٹھنک گیا تھا، جب مصر جانے والے ساتھیوں نے بتایا کہ پیٹرول لینے کے لیے عوام کی کئی میل لمبی قطاریں لگی ہیں۔ نوجوانوں کے پاس ڈالروں کی گڈیاں ہیں جو ہر اس شخص پر نچھاور کرنے کو تیار ہیں جو مرسی حکومت کے خلاف کچھ بھی کرنے کو تیار ہو۔ موساد کو کسی صورت غزہ کے پڑوس میں ایسی حکومت منظور نہ تھی جو فلسطینی مسلمانوں کی ہمدرد ہو۔ لہٰذا پھونک پھونک کر قدم رکھنا ضروری تھا۔

ترکی میں حال ہی میں ترکی کی تاریخ کے ذہین، جرأت مند اور مقبول ترین حکمران نے دو بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ پہلی قومی سطح پر اور دوسری بین الاقوامی سطح پر۔ قومی اور ملکی سطح پر تو یہ کہ خواجہ فتح اللہ گولن صاحب کا گروپ جو اپنے دنیا بھر کے 140 ممالک میں پھیلے ہوئے 1500 کے قریب سکول و کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کو پولیس اور عدلیہ میں بھرتی کروانے کے مشن پر کاربند ہے، اس گروپ کے سربراہ نے جو طویل عرصے سے ’’بسلسلۂ علاج‘‘ امریکا میں مقیم ہیں، اپنے ترکی میں موجود بے شمار پولیس اہلکاروں اور جج و پراسیکیوٹر حضرات کے ذریعے دو طرفہ مہم شروع کی۔ ایک طرف تو حکومت کو گرانے کے لیے بدعنوانیوں کے الزامات لگائے جائیں اور دوسری طرف حکومتی ارکان سے رابطہ کر کے ان کو اپنی جماعت میں شامل کیا جائے۔ یہ ساری مہم دراصل اس لیے تھی کہ 30 مارچ کو ترکی میں

بلدیاتی انتخابات ہونے ہیں۔ امریکا و اسرائیل کی سربراہی میں تمام مغربی قوتیں اس بات پر ایکا کر چکی ہیں کہ طیب اردگان کی جماعت کو ان بلدیاتی انتخابات میں ناکام کر کے اردگان کے لیے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے اور چوتھی مرتبہ منتخب ہونے کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے دروازے ہی بند کر دیے جائیں۔ کچھ عرصے پہلے غازی پارک کا مسئلہ، پھر ترکی کے بازارِ حصص سے اچانک سرمایہ نکال لینے کا واقعہ اور اب گولن صاحب کی قیادت میں جو خیر سے اسلامک اسکالر شمار ہوتے ہیں، اسلام پسند حکومت کو گرانے کے لیے دو طرفہ کاروائی، سب اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ادھر طیب اردگان کی شکل میں ایک ایسا صاحبِ عزیمت شخص ترک قوم کو مل چکا ہے جو ایک طرف مصر کے رابعہ بصریہ میں قتل عام پر آنسو بہاتا اور چار کا نشان بناتا ہے، اس کی خاتون اوّل برما کے مظلومین کے لیے سب سے پہلے دادرسی کے لیے جا پہنچتی ہے، تو دوسری طرف وہ اندرون ملک بحران پر اس خوبی سے قابو پاتا ہے کہ اپنے جس وزیر کی بدعنوانی کا علم ہوتا ہے، اس کو خود فارغ کر کے مثال قائم کرتا ہے اور جب یہ مصنوعی بحران ٹھنڈا ہوتا ہے تو سامراج کے ہمدردوں کے خلاف فوراً آپریشن شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت تک انقرہ اور استنبول کے دو مرکزی شہروں میں اس نے سیکڑوں پولیس افسران و اہلکار اور جج و پراسیکیوٹر برطرف یا تبادلہ کر دیے ہیں کہ انھوں نے بدعنوانی کے خاتمے کے لیے نہیں، بلکہ خود بدعنوانی میں ملوث ہوتے ہوئے غیر ملکی اشارے پر مہم چلائی تھی۔

ظاہر ہے خداداد ذہانت و مقبولیت کے بغیر اتنا بڑا اقدم اٹھانا اور عوام کا اس موقع پر اپنے حکمران کا ساتھ دینا ممکن نہیں۔ چنانچہ گولن صاحب کی بازی الٹ گئی ہے۔ ان کا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ اب وہ فلسفی اور دانشور بن کر ویٹی کن کے عیسائی پوپ اور اسرائیلی یہودی کے چیف ربائی سے ملاقاتیں نبھانے کے ساتھ ''داعیِ اسلام'' کے منصب پر بے داغ

ہاتھوں اور اجلے دامن کے ساتھ فروکش نہ ہوسکیں گے۔ ترکی میں اس وقت ان کا کیا حشر ہو رہا ہے؟ نامناسب نہ ہوگا اگر میں انقرہ سے روزنامہ جنگ کے مکتوب نگار کے حالیہ کالم سے تین چھوٹے اقتباسات نقل کردوں۔ انقرہ سے فرمان حمید لکھتے ہیں:

(1)..... ’’امریکا نے ترکی میں اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے فتح اللہ گولن خواجہ کی تحریک کی ہر لحاظ سے حمایت اور امداد کو جاری رکھا اور متحدہ امریکا ہی کی پشت پناہی کی وجہ سے اس تحریک نے چند سالوں میں دنیا بھر میں اسکول قائم کرتے ہوئے اپنی اہمیت کو منوالیا۔.......وزیراعظم بلند ایجوت اور وزیراعظم سلیمان ڈیرل (بعد میں سات سال تک صدر) دونوں نے غیر ممالک میں بڑی تعداد میں ترک سکول موجود ہونے کی بنا پر ان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کیا۔‘‘ روزنامہ جنگ، 5 فروری 2014ء)

ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ دو سابقہ حکمران تقریباً دو دہائیاں قبل امریکا و اسرائیل کی آشیرباد سے کام کرنے والی اس جماعت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ آج جبکہ ان کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے، اردگان ذرا نہیں ہچکچایا اور اس نے ان کے کھل کر سامنے آنے کے بعد کھل کر جرأت دکھائی ہے۔ ترکی میں ان کے درس خانوں کو قانون کا پابند کرنے اور تعلیم، عدلیہ و انتظامیہ کے شعبوں میں ان کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے وہ کردار ادا کیا ہے جسے راقم نے حکمت و شجاعت کا امتزاج کہا ہے۔ مستقبل کا ہمیں پتا نہیں، لیکن آج تک کی کارکردگی کے تناظر میں ’’اتاترک‘‘ (بابائے ترک) کے خطاب کا حقیقی مستحق اگر کوئی ہے تو وہ اللہ کے کرنے سے ’’اردگان‘‘ ہوسکتا ہے۔ اب دوسرا اقتباس پڑھیے:

(2)..... ’’مولانا طاہر القادری اور فتح اللہ گولن خواجہ۔ یہ دونوں شخصیات ایک جیسے ہی مذہبی نظریات اور سوچ کی مالک ہیں۔ مولانا طاہر القادری نے بھی گولن خواجہ کی طرح پاکستان اور غیر ممالک میں بڑی تعداد میں درسگاہیں قائم کی ہیں، جس کی وجہ سے ان کو بھی

گولن خواجہ کی طرح دنیا بھر میں شہرت حاصل ہوئی اور اسی شہرت کی وجہ سے امریکا کے علاوہ دیگر مغربی ممالک نے بھی مولانا طاہر القادری کی تحریک کی نہ صرف مالی امداد جاری رکھی، بلکہ گولن تحریک کی طرح اس تحریک کو بھی مضبوط بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔‘‘

بے ادبی معاف! شاید فاضل کالم نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مولانا گولن قادری اور خواجہ طاہر گولن دونوں ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ اب تیسرا اور کالم کا اختتامی اقتباس بھی دیکھ لیجیے۔

(3)..... ’’اس وقت عالم مغرب، امریکا اور ان کے حواریوں کو ایک مضبوط نہیں، بلکہ ایک کمزور پارٹی کی ضرورت ہے تاکہ ایزدوان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر ان کے تمام منصوبوں کو روکا جاسکے جن پر انہوں نے عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ مغربی ممالک اس مقصد کے لیے فتح اللہ گولن کو استعمال کر رہے ہیں۔‘‘ (روزنامہ جنگ، 5 فروری 2014ء)

اللہ کرے کہ ترک اسلام پسند جیسے بھی ہیں، کمزور نہ ہوں اور اگلے معرکے میں پھر سرخ رو ہوں۔ ہمارا کام مرثیہ پڑھنا یا قصیدے لکھنا نہیں، لیکن ہم اپنے وجود کے کسی جز سے کس طرح بے خبر یا لاتعلق رہ سکتے ہیں۔

دوسری بڑی کامیابی موجودہ ہر دلعزیز ترک حکمران کو بین الاقوامی سطح پر حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسے جس طرح یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ دنیا کا پہلا حکمران ہے جس نے مسلم و غیر مسلم صحافیوں اور رفاہی کارکنوں پر مشتمل بحری جہاز غزہ کے محصورین کی امداد کے لیے بھیجا۔ جس طرح اسے یہ افتخار بھی حاصل تھا کہ وہ پہلا حکمران ہے جس کی سیاست و فراست سے مرعوب ہو کر اسرائیل جیسے ملک نے معذرت کی۔ اب تازہ خبر یہ ہے کہ اس کی مدبّرانہ سیاست کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسرائیل نے ’’فریڈم فلوٹیلا‘‘ پر حملے میں ہونے والے نقصان کا تاوان اور شہداء کی دیت کی پیش کش بھی کر دی ہے۔ (روزنامہ

امت 4 فروری 2014ء، صفحۂ اوّل) اس سے میرے محترم کالم نگار (جناب جاوید چوہدری صاحب) کے اشکالات کے جواب کی تایید بھی نکل آتی ہے، جو انہوں نے روزنامہ ایکسپریس کے کالم میں ترکی حکومت کے بارے میں اٹھایے تھے اور احقر نے بساط بھر جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

اللہ تعالیٰ غفور و رحیم اور مہربان و کریم ذات ہے۔ مصر کے غموں کو ترکی کی خوشگوار یادوں سے مٹانے کا بندوبست کر دیتا ہے۔ تحریکی نظریات والوں کو صبر و شکر کے ساتھ عزم و ہمت، حزم و احتیاط اور فراست و شجاعت کا امتزاج چاہیے۔ آخری نتیجہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ اللہ اپنا فضل رکھے، وہ تو دونوں صورتوں میں حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

دو جڑواں تحریکیں

خواجہ محمد فتح اللہ گولن 27 اپریل سن 1941ء میں ترکی کے مشرقی صوبے ارضِ روم کے ایک گاؤں ‘‘کوروکک’’ میں پیدا ہوئے۔ یہیں انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ ترکی زبان میں چونکہ ‘‘خ’’ کا لفظ نہیں ہے، اس لیے حوجہ ترکی زبان میں مسجد کے امام یا استاذ کو کہا جاتا ہے۔ فارسی میں یہی لفظ ‘‘خواجہ’’ کے طور پر بولا اور تحریر کیا جاتا ہے۔ مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ترکی کے محکمہ مذہبی اُمور میں ملازمت حاصل کرتے ہوئے امام و خطیب کے طور پر فرائض ادا کرنا شروع کر دیے۔ یہ سرکاری محکمہ ہے جو ملک میں تمام مساجد کی دیکھ بھال، خطبات کی جانچ پڑتال اور اماموں کی تعیناتی جیسے امور سرانجام دیتا ہے۔ اس دوران وہ ایک سرگرم مبلّغ کے طور پر جانے جاتے تھے جن کی خطابت کا ایسا ہی شہرہ تھا جیسا کہ...... یادش بخیر...... ہمارے ہاں کے علامہ طاہر القادری کا تھا۔ البتہ وہ ہمارے علامہ سے اس اعتبار سے ایک ہاتھ آگے نکلے کہ خطابت کے میدان میں سکہ جمانے کے ساتھ انہوں نے ایک مفکر اور دانش ور جیسی ساکھ قائم کرتے ہوئے مذہب سے متعلق 50 کتابیں تحریر کر ڈالیں۔ اب نہیں معلوم کہ ہارون یحییٰ کی طرح انہیں بھی 30 افراد کے پینل نے یہ کتابیں ‘‘بحال خود بجائے خود’’ کی شکل میں لکھ کر دی ہیں یا ان کی اپنی محنت ہے؟ ہمیں حسنِ

ظن رکھنا چاہیے تاوقتیکہ اس خوش گمانی کی گنجائش نہ رہے۔ 1981ء میں وہ اس عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ تاہم انہوں نے وعظ و خطابت کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مغربی طاقتیں پاکستان اور ترکی جیسے نظریاتی ملکوں میں ایسی شخصیات کی تلاش میں رہتی ہیں جنہیں ان کے ''مقاصد عالیہ'' کے نام پر امداد فراہم کی جائے تو وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسے قبول کر لیتی ہیں۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے سے اپنا مطلب نکالنے کے لیے چونا کاری کی مہم چلتی رہتی ہے اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے باطل کا لقمہ کھانے والے اس سے جیت نہیں سکتے، بالآخر بلیک میل ہو کر رہتے ہیں۔ لہٰذا شروع میں جتنا بھی پرخلوص جذبہ اور نیک مقصد ہو، لیکن بالآخر تقویٰ و طہارت اور فقر و زہد والا طرزِ عمل نہ ہونے کی بنا پر ''کیدِ عظیم'' کا شکار ہو جاتے ہیں، لہٰذا گولن صاحب نے بھی شروع میں جتنے بھی اچھے مقصد اور نیک نیت کے لیے مغربی سرپرستوں سے روابط قائم کیے ہوں (یہ بھی ہمارا حسن ظن ہے، ورنہ شروع اور بعد کے فرق کی کیا ضمانت ہے؟) آخر کار وہ صیہونی سرمائے کے سحر میں آ کر اپنی شفافیت کھو بیٹھے۔ 28 فروری 1999ء کو مختلف الزامات کا ہدف بننے کے بعد اپنی عافیت ملک کو ترک کرتے ہوئے امریکا میں پناہ لینے میں محسوس کی۔ تب سے اب تک وہیں ایک مہنگے علاقے میں اعلیٰ درجے کے مکان میں رہائش پذیر یا پناہ گزین ہیں۔

ترکی کے گوشہ نشین مذہبی رہنما خواجہ فتح اللہ گولن صاحب کے ساتھ آج کل ملاقات نہایت مشکل ہے۔ وہ نہ کسی کو انٹرویو کے لیے وقت دیتے ہیں اور نہ زیادہ کھلتے ملتے ہیں۔ ایک پُرفضا مقام پر اعلیٰ درجے کے مکان میں پُرتعیش رہائش کے دوران وہ دنیا بھر میں اپنے پیروکاروں کی رہنمائی جدید ذرائع کے بل بوتے پر کر رہے ہیں۔ اس مقام کو نہایت سخت حفاظتی حصار فراہم کیا گیا ہے اور دیدہ و نادیدہ آنکھیں ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتی ہیں۔ ان کی اس پُراسرار تنہائی کی حدود پار کرتے ہوئے ایک صحافی آخر کار ان تک جا پہنچا۔

اس کا انٹرویو ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس انٹرویو میں ان کی مخفی شخصیت سے پردے ہٹاتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ گولن صاحب یہودی صحافتی گروپ کے شائع کردہ ''ٹائم میگزین'' کی منتخب کردہ ان 100 شخصیات میں شامل تھے جنہوں نے ''تجدد'' کی آواز کو بلند کیا ہے اور ''اعتدال پسندوں'' کی رہنمائی کرکے انہیں ایک نقطے پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہود مخالف باتوں سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے فکر کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد اپنے سابقہ یہود مخالف نظریات پر نظر ثانی کر لی ہے۔ نیز یہ کہ اس بات کا اعتراف کرنے میں انہیں کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کی بعض آیات اور چند احادیث (جو یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہیں) کو سمجھنے میں غلطی کا شکار رہے ہیں، لیکن ''مکالمہ بین المذاہب'' کی برکت اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ میل جول کی فضیلت کے بعد ان پر ان آیات واحادیث کا حقیقی مفہوم کھل گیا۔ اب وہ اسرائیل پر تنقید نہیں کرتے جبکہ ماضی میں ایسا کرتے رہتے تھے۔ الغرض یہ دلچسپ انٹرویو ان کی سابقہ قدامت پسند فکر اور حالیہ ترقی یافتہ جدت پسند نظریہ کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی سطور کو بین السطور سمیت پڑھا جائے۔ بیچ میں کہیں کہیں احقر نے مربع قوسین [] کے درمیان ان بین السطور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے قارئین بقیہ سطور کا مفہوم ازخود کامیابی سے اخذ کر لیں گے۔

جیمی ترابی نامی صحافی لکھتا ہے:

''ترکی اور دنیا بھر کے لاکھوں لوگوں کا کہنا ہے کہ فتح اللہ گولن ایک ترکی مذہبی اور روحانی رہنما اور گولن تحریک کے سربراہ ہیں۔ ان کے پیروکار پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہوں نے امریکا سمیت تقریباً 90 ممالک میں تعلیمی اسکول کھول رکھے ہیں۔ [اب یہ تعداد 140 ممالک اور 1500 اسکولوں تک پہنچ چکی ہے۔] یہ قابل احترام استاذ (جیسا کہ

ان کو کہا جاتا ہے) الزامات سے بچنے کے لیے 1998ء میں ترکی کی سرزمین سے نکل گئے۔ بالآخر پنسلوانیا کے علاقے سیلرس برگ میں آباد ہو گئے، جہاں سے تبلیغ، صحافت، انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنے پیروکاروں کی رہنمائی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ترکی اور وسطی ایشیا میں بہت مشہور ہیں اور تاہم امریکا میں وہ اب تک ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔ گولن تحریک کے رہنما نے ایک خصوصی انٹرویو میں اپنے مخصوص قسم کے اسلام کے مطابق یہود دشمنی کے موضوع پر گفتگو کی۔ اس موضوع پر بھی بولے کہ وہ 14 سال سے روپوش کیوں ہیں؟

یہ گوشہ نشین روحانی شخصیت ''پوکونوس'' میں قائم اپنے پُرتعیش مکان میں رہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا اثر و رسوخ اس قدر نہیں ہے جتنا کہ ان کے ناقدین دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ شاذ و نادر کہیں انٹرویو دیتے ہیں، لیکن حال ہی میں مجھے گولن صاحب سے ملاقات اور انٹرویو کی اجازت ملی۔ میں ان کے پُرکشش مکان (جو کہ ایک تفریحی مقام کی طرح تھا) میں حاضر ہوا۔ اس مکان میں وہ 14 سال سے رہائش پذیر ہیں۔ ان کے جوابات کچھ ترمیم کے ساتھ [یہ ترمیم ناگزیر وجوہات کی بنیاد پر اس صحافی نے خود کی ہے۔ راقم الحروف اس کا مرتکب نہیں۔] مندرجہ ذیل ہیں:

1- کیا وجہ ہے کہ آپ کا انٹرویو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے؟

گولن صاحب: میں ایک چھوٹے سے خاندان میں شرمیلی شخصیت کے ساتھ پلا بڑھا ہوں۔ میں انٹرویو کی درخواست گزاروں کی پیشکش کو ان کے احترام کے پیش نظر قبول کرتا ہوں، ورنہ میں علیحدگی میں اپنی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

2- میں نے سنا ہے کہ آپ کی کوئی خاتون شاگرد نہیں ہے؟

گولن صاحب: ترکی میں ہمارے ساتھی ایک پروگرام چلا رہے ہیں، جس کے تحت طالبات الٰہیات میں گریجویٹ سطح کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہاں اس طرح کا نظام تو

نہیں چلایا جا سکتا، تاہم بہت سی خواتین پابندی کے ساتھ درس میں شریک ہو رہی ہیں۔

3- کیا اسلامی روایت کے مطابق عورت کا کردار اس کے ماں بننے تک محدود ہے؟

گولن صاحب: نہیں! ایسا نہیں ہے۔ ماں کی مقدس حیثیت ایک طرف ہے، لیکن عورتوں کے بارے میں ہماری عمومی رائے یہ ہے کہ مخصوص ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے ڈاکٹری، فوجی آفیسر، جج، کسی ملک کی صدر وغیرہ سمیت تمام ملازمتوں کو ممکن بنانا چاہیے۔ درحقیقت پوری تاریخ میں مسلمان عورتوں نے زندگی کے ہر شعبے میں معاشرے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسلام کے سنہرے دور (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں) حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہنّ (ازواج مطہرات) فقہ میں ایک مقام رکھتی تھیں، اور انہوں نے صحابہؓ کو پڑھایا۔ ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ عورتوں کی سرگرمیوں کو محدود کر کے ان پر پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے آج کل اسلامی احکامات کی غلط تشریح کی بنیاد پر بعض جگہوں میں عورتوں کو معاشرتی زندگی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو کہ پوری دنیا میں اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا موضوع بنا ہوا ہے۔

4- اس ملک میں جو لوگ آپ کی ذات، اعتقادات اور تعلیمات کے بارے میں نہیں جانتے۔ ان کو اگر آپ کوئی پیغام دینا چاہیں تو کیا پیغام دیں گے؟

گولن صاحب: میں اپنے آپ کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا، میں نے لوگوں میں مشہور ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں صرف اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ اپنے نظریات کا تبادلہ کرتا ہوں۔ اگر اس سب کے باوجود لوگ مجھے پہچانتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ میرا بنیادی نظریہ تو یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر کے ان کی بری عادات کو ختم کیا جائے، جس کے نتیجے میں دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ عربی کہاوت ہے:

''جو چیز مکمل حاصل نہیں کی جا سکتی، اس کو مکمل طور پر چھوڑ بھی نہیں دینا چاہیے۔''

5-امریکی عوام کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے جو آپ کے معتقدین کے قائم کردہ چارٹر اسکولوں کے بارے میں فکرمند ہیں؟ آپ ان معلّمین کی زندگی پر کس طرح سے اثر انداز ہونے کی توقع رکھتے ہیں؟

گولن صاحب: سب سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر کسی بھی اسکول کی بنیاد رکھنے اور اسے چلانے میں شریک نہیں ہوں۔ میرا اثر و رسوخ اگر ہے تو میری تقریروں، مذاکروں اور سیمینار کے ذریعے ہے۔ اگر میرے سامعین کے درمیان مجھے کوئی اعزاز حاصل ہے تو میں نے اس اعزاز کو تعلیمی ادارے بنانے پر ان کی حوصلہ افزائی کے لیے استعمال کیا ہے۔ میں نے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم دنیا میں امن اور صلح ایسے لوگوں کی پرورش کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں جو تعلیم یافتہ، اچھی ناقدانہ سوچ رکھنے والے، انسانوں سے محبت کرنے والے اور اپنی صلاحیتوں کو لوگوں کی خدمت میں پیش کرنے والے ہوں۔

[سبحان اللہ! اولاً تو یہ سیاست نہایت دلچسپ اور انوکھی ہے کہ آپ ذاتی طور پر اسکولوں کی بنیاد رکھنے میں شریک نہیں، البتہ آپ کو ان میں اثر و رسوخ حاصل ہے۔ بہت خوب! پھر جو تعلیم یافتہ اور ناقدانہ سوچ والے افراد تیار ہوئے ہیں، انہوں نے دوسرے انسانوں سے پہلے اپنے ملک میں محبت کی جو آگ حال ہی میں روشن کی ہے، اس کی تپش سے خود گولن صاحب کی ساکھ جل کر راکھ ہو چکی ہے۔]

6- آپ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اس کے باوجود آپ ٹائم میگزین کے منتخب کردہ ان 100 افراد میں شامل تھے، جنہوں نے تجدد کی آواز کو بلند کیا ہے، جس کی ضرورت آج بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آج کل

کے اعتدال پسند مزید کیا کر سکتے ہیں، جس سے لوگ ان کی بات سننے لگیں؟

گولن صاحب: اگرچہ دنیا بھر میں اعتدال پسندی کی آوازیں موجود ہیں، لیکن انہیں ایک متفقہ نقطے پر جمع کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید کہ زیادہ اہم بات یہ ہے ہم خود کو ایک نمونے کے طور پر پیش کریں۔ کیا ترکی کو اس کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ تحریک اور یہ معاشرہ اس کی مثال بن سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے اگر ہم اپنا محاسبہ کریں، اپنے آپ سے پوچھیں تو ہمیں پتہ لگے گا کہ دنیا میں دلچسپی اور ہمدردی نہیں رہی۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر سکے اور نہ ہی اپنی اقدار کو مکمل طور پر پیش کر سکے ہیں، لیکن ہم پر اُمید ہے کہ ان شاء اللہ ایسا ضرور ہو گا۔ میرے ان خیالات کا ترکی میں خیر مقدم نہیں کیا گیا تھا، لیکن آج آہستہ آہستہ اس کو قبول کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو آج سے 20 سال پہلے جیسا میں نے کہا تھا کہ جمہوریت ایک ایسا عمل ہے جس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا، تو مخصوص میڈیا تنظیموں نے جو اس وقت حکومت کی حامی ہیں۔ بہت ہی شکوک کا اظہار کیا تھا اور مجھے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

7- آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ ایک ایسے جمہوری نظام میں رہتے ہیں جہاں آپ کو اظہارِ رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے تو پھر کسی اور قسم کی حکومت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا آپ ایسی کوئی مثال دے سکتے ہیں جہاں مسلمانوں کو اظہارِ رائے کی یہ آزادی حاصل نہ ہو؟ اور ایسی صورتحال میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟

گولن صاحب: ترکی سمیت دنیا بھر کے اکثر ممالک میں 1950ء کی دہائی تک مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ شخصی زندگی میں بھی کسی کو مذہب پر عمل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی کرنا چاہتا تھا تو چپکے سے کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ابتدائی سکول میں تھا تقریباً 6 سال کی عمر میں، تو ایک مرتبہ سکول کے وقفے کے دوران

میں نے ظہر کی نماز ادا کی تھی، تو مجھے پرنسپل نے سزا کے طور پر تہہ خانے میں بند کر دیا تھا۔ واقعی بہت ہی زیادہ دباؤ ہوتا تھا۔ آج ایک طرف اس کے جواب میں انفرادی حیثیت میں کچھ لوگ ظلم کا شکار ہیں تو دوسری طرف مسلمان خودکش حملے کر رہے ہیں۔ مذہب ظالم کو روکنے کے لیے ظلم کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ [بہت خوب گولن صاحب! بہت خوب! یہ نہیں بتایا کہ ایسے موقع پر مذہب جس چیز کی اجازت یا حکم دیتا ہے، وہ کیا ہے؟ شاید آپ کا موجودہ مذہب تو اس کی بھی اجازت دیتا ہو کہ ظالم کو دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے۔] آج کچھ علاقوں میں مسلمانوں کو ظلم کا سامنا ہے تو کچھ عیسائیوں کو۔ بعض چیزیں وقت لیتی ہیں۔ پوری انسانیت کو ایک پر امن رویّہ اپنانا چاہیے، لیکن یہ صرف ایک لمبے عرصے میں معاشرے کی نشأۃ ثانیہ کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا ہم اس کو حاصل کر سکتے ہیں؟ [سوال یہ ہے کہ جب تک یہ پر امن رویّہ اور نشأۃ ثانیہ حاصل نہ ہو، تب تک کیا کیا جائے؟] جو کچھ ہو سکا، ہم اسے حاصل کریں گے۔ اور جو ہم حاصل نہ کر سکے اس پر ہمیں ہماری نیت کا ثواب ملے گا۔

8- کچھ لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں اور کچھ آپ سے خوفزدہ ہیں۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ترکی واپس آ جائیں اور کچھ ان اقدامات سے خوفزدہ ہیں جو آپ کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کو جانا چاہیے؟

گولن صاحب: میں نہ تو ایسا پہلا آدمی ہوں اور نہ ہی آخری جس کے بارے میں متضاد آرا پائی جاتی ہوں۔ تاریخ کے مطابق اللہ کے پیغمبروں سمیت حق پرستوں نے رکاوٹوں اور دشمنی کا سامنا کیا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شاید ہم نے لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو درست طریقے سے پیش نہیں کیا یا ہم اپنی بات کی صحیح طرح وضاحت نہیں کر پائے۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یوں کہنا چاہیے: ”اگر ہم یہ بات واضح

کر سکے کہ ہمارے پاس لوگوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں فکر مند ہوا جائے تو وہ ہمارے خلاف اپنے دلوں میں دشمنی نہیں پائیں گے۔" ہمیں شک کا فائدہ دوسروں کو دینا چاہیے۔ دنیا بھر کے معاشروں میں شک کا رجحان ہے اور ترکی کے لوگ بھی اس متاثر ہیں۔ ہمیں ایسا رویہ اپنانا چاہیے جس کے ذریعے ہم ان منفی تاثرات اور شکوک کو ختم کر سکیں۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ کچھ لوگ فطری طور پر بہت سخت رویے والے ہوتے ہیں جس کو وہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ بیک وقت سب کے محبوب اور پسندیدہ شخصیت ہوں۔

9- آپ کے سابقہ خطبوں میں بعض باتیں یہود مخالف پائی گئی تھیں، آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

گولن صاحب: اس معاملے کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے کہ انسان اپنی سوچ اور نظریات میں ارتقائی عمل طے کرتا رہتا ہے۔ اور یہ امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کئی سال پہلے لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں، میں نے چند سوالات اٹھائے تھے کہ کیا آپ آج بھی بعینہ وہی ہیں جو آپ کل تھے؟ اور آپ کے سامعین وہی لوگ ہیں جو کل تھے؟ اس سب کا جواب یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی آپ وہ نہیں ہوں گے جو آپ آج ہیں۔

آپ کے سامعین کا کردار اور ان کے رویّے آپ کے نظریات اور خیالات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں "بین المذاہب مکالموں" کے مراحل کے دوران مجھے مختلف غیر مسلم نظریات کے حامل افراد کو سمجھنے کا زیادہ بہتر موقع ملا اور مجھے اس بات کی ضرورت کا احساس ہوا کہ میں اپنے سابقہ نظریات پر نظر ثانی کروں۔ اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ بعض آیات اور احادیث کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کا

شکار رہا ہوں۔ مجھے یہ پتہ لگا کہ قرآن پاک اور احادیث میں جو مختلف مقامات پر تنقید اور مذمت کا بیان ہے اس کا ہدف کسی مخصوص مذہب کے پیروکار نہیں، بلکہ اس کا ہدف وہ مذموم صفات ہیں جو کسی بھی شخص میں پائی جاسکتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میری گفتگو کو درست پس منظر میں نہیں سمجھا گیا۔ بعض معترضانہ ارادے رکھنے والے لوگوں نے میری تقریروں اور تحریروں سے منتخب جملے نکالے اور ان کو پس منظر اور اس وقت کے حالات کے تناظر میں دیکھے بغیر انہیں پیش کر دیا۔ ''بین المذاہب مکالموں'' کے سلسلے میں میری کوششوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور کہا گیا کہ یہ یہود اور عیسائیوں کے بارے میں مسلمانوں کے نظریات کو نرم کرنے کی کوشش ہے۔ میں نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے بارے میں مجھے یہ یقین نہ ہو کہ آپ علیہ السلام کی سیرت میں موجود ہے۔ آپ علیہ السلام ایسی شخصیت ہیں جو مدینہ کے ایک یہودی رہائشی کے جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تاکہ ایک فوت شدہ انسان کے لیے احترام کا اظہار ہو سکے۔ [اس میں شک نہیں کہ آپ علیہ الصلوۃ و السلام عمر بھر یہود کے لیے نرم رویّہ اختیار کرتے رہے، سوال یہ ہے کہ یہود نے اس کے بدلے میں کیا کیا؟ آپ علیہ السلام پر جادو اور آپ کے خلاف جاسوسی و بغاوت سے لے کر زہر دینے اور جان لینے تک کی کوششوں کے بعد کیا اس امید کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم یہود سے دوستانہ رویہ رکھیں تو وہ ہم سے منصفانہ رویہ رکھیں گے۔]

یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے ماضی میں اسرائیل کے بعض اقدامات پر تنقید کی ہے، لیکن انہی مسجد کے خطبوں میں میں نے دہشت گردی اور خودکش حملوں کی بھی مذمت کی ہے جن کا نشانہ بے گناہ شہری ہوتے ہیں۔

سوال: آپ پنسلوانیا میں ہی کیوں قیام کو اختیار کیے ہوئے ہیں؟

گولن صاحب: اگرچہ ترکی واپس جانے میں مجھے کسی قسم کی قانونی رکاوٹوں کا سامنا

نہیں، تاہم مجھے خدشہ ہے کہ بعض مخصوص حلقے کسی ایسے موقع کے منتظر ہیں جس میں وہ جمہوری عمل کو پیچھے دھکیل سکیں جس کا آغاز 1990ء میں ہوا اور گذشتہ دہائی میں وہ بہت آگے بڑھا ہے۔ مجھے اس بات کی فکر لاحق ہے کہ یہ عناصر میری واپسی کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کو مشکل میں ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ ترکی اور دنیا بھر میں پھیلے گولن تحریک کے رضا کاروں کے مفاد کی خاطر مجھے وطن واپسی کی شدید خواہش کو قربان کرنا ہوگا۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے وطن واپسی کی شدید خواہش کو دبانے کی تکلیف کے ساتھ اس وقت تک یہیں رہنا ہوگا جب تک جمہوری عمل کی تقویت کے متعلق خدشات ختم نہیں ہو جاتے۔ مزید برآں اس دوران میں ترکی میں اپنے بارے میں افواہوں اور الزام تراشیوں کے خلاف ممکنہ قانونی چارہ جوئی اور اصلاح کی جستجو کر سکتا ہوں۔ یہاں میں ان تمام پریشانیوں سے دور ہوں اور نسبتاً کم متاثر ہوتا ہوں۔ مجھے یہ جگہ زیادہ پرسکون لگتی ہے۔“

علامہ قادری صاحب کو کینیڈا اور خواجہ گولن صاحب کو امریکا کی رہائش راس آ گئی ہے۔ دونوں حضرات وہاں سکون سے بیٹھ کر انسانیت کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی بھی خدمت کر رہے ہیں۔ اس دوران کبھی کبھار ان کی پرسکون جھیل میں انقلاب کا پتھر آ گرتا ہے تو وہ اپنے اپنے ممالک کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی کوشش ایک جیسے ہتھیار اور ایک جیسے انداز سے کرنے لگتے ہیں۔ امریکا و کینیڈا جیسے خود جڑواں ملک ہیں، اسی طرح انہوں نے پاکستان و ترکی جیسے برادر ملکوں کے لیے علامہ صاحب اور خواجہ صاحب کی جوڑی تیار کی ہے، تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ سبحان تیری قدرت!

دیکھا جو تیر کھا کے......

ایک مشہور شعر ہے:

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

عین ان دنوں جب امریکا و اسرائیل کی منظورِ نظر تعلیمی وفلاحی تحریک ....جو مشہور ترک اسکالر اور مصنف جناب فتح اللہ گولن کے زیرِ قیادت چل رہی ہے...........نے ترکی کی منتخب حکومت کے خلاف بحران کھڑا کیا ہوا ہے، ہمارے ہاں کے ایک مشہور صحافی (جناب جاوید چوہدری) نے ''بزنس'' کے نام سے ترکی کے بارے میں کالم لکھ ڈالا ہے جس میں واقعیت اور تحقیق سے متضاد چند باتوں کی بنیاد پر ترکی سے پاکستان کے تجارتی تعلقات کے حوالے سے کچھ مشورے دیے ہیں۔ اس طرح ترکی کے موجودہ بحران نے جہاں ''گولن گروپ کا اسلامی تعلیمی وفلاحی تحریک کا نقاب اتار پھینکا ہے، وہیں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہمارے لکھاری لکھتے وقت تحقیق کا اہتمام کرتے ہیں نہ ملت کے حقیقی اجتماعی مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ ترکی کے بحران کے عروج کے وقت جب پاکستان کی فضاؤں سے انہیں ہمدردانہ جذبات کی خوشبو آنی چاہیے تھی، غیر معیاری اور غیر تحقیقی تحریروں

کی درشتی نے برادرانہ فضا کو مکدّر کر دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی طرح دانش کا تقاضا ہے نہ ملک وملت کی خدمت۔

ہمارے معروف کالم نگار نے ترکی کے حوالے سے تین نکات اٹھائے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کیا اس کے لیے یہ موزوں وقت تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں نکات گولن گروپ کے زیر اثر ترک عدلیہ اور پولیس کے بے وقت کی راگنی سے ملتا جلتا ہے۔ گولن گروپ سے تعلق رکھنے والے مجسٹریٹ صاحبان ان دنوں اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ ''آئی ایچ ایچ'' نامی ترک فلاحی ادارہ (''انسانی حقوق وحریت'' کا مخفف) جو دنیا بھر میں فلاحی سرگرمیوں کے لیے معروف ہے اور انتہائی نیک شہرت رکھتا ہے، پر بھی نزلہ گرانا شروع کر دیا ہے۔

اس ادارے نے پاکستان میں زلزلہ اور سیلاب جیسی آفات کے دوران انتہائی معیاری اور اعلیٰ درجے کی رفاہی خدمات انجام دیں۔ دنیا بھر میں جہاں بھی کوئی انسانی مسئلہ پیش آتا ہے، یہ ادارہ اپنی بے لوث خدمات کے ساتھ آگے آگے ہوتا ہے۔ حال ہی میں شام کے مہاجرین کے لیے اس کے تین ٹرک امداد لے کر جا رہے تھے۔ ایک ''فرض شناس'' مجسٹریٹ صاحب نے ان پر چھاپہ مار کر خبر اڑائی کہ ان میں اسلحہ ہے۔ اس الزام پر کچھ ہونا تھا نہ ہوا، لیکن گولن گروپ سے وابستہ افراد نے واضح کر دیا کہ وہ اپنے سرپرستوں کے کہنے پر کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ چاہے انہیں اس کے لیے اپنے ہی ملک کے ایک بین الاقوامی رفاہی ادارے پر ''القاعدہ'' سے تعلقات کا الزام ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔ ہوا اس مرتبہ بھی یہی کہ ابھی ٹرکوں کو روکا نہیں گیا تھا کہ ترک ذرائع ابلاغ میں موجود گولن گروپ کے صحافیوں کے ذریعے خبر پہلے ہی چلا دی گئی تھی کہ اسلحہ برآمد ہونے والا ہے۔

ادھر امریکا و اسرائیل نے وہ کارڈ بھی کھیلنا شروع کر دیا ہے جو اس کا آزمودہ حربہ ہے۔ شام کی سرحد پر واقع نصیری فرقے کے ایک مقتدر رہنما کو گرفتار کر کے اشتعال پھیلانے اور

شیعہ سنی فسادات جیسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش بھی بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ مرکزی کردار اس مرتبہ بھی گولن گروپ کا ایک پولیس افسر ہے جس نے بلا وجہ گرفتاری جیسی اشتعال انگیز حرکت سنگدلی کے ساتھ انجام دی، تاکہ شام ترکی سرحد پر تنازعات کا طوفان اٹھ کھڑا ہو اور اردگان حکومت ایک اور بحران میں گھر جائے۔

اب ہم متذکرہ بالا کالم میں اٹھائے گئے تین نکات کی طرف آتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ترکی کے اسرائیل کے ساتھ دو طرفہ تعلقات ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

"ہم لوگ ترکی کو ابھرتا ہوا اسلامی ملک سمجھتے ہیں جب کہ ترکی خود کو صرف ترقی یافتہ اور ماڈرن ثابت کرتا ہے ہم ہمیشہ طیب اردگان اور عبداللہ گل کی اہلیہ کے اسکارف، ترکی میں اسلامی روایات کی واپسی، نئی مسجدوں کی تعمیر، شراب پر پابندی، مذہبی گفتگو کی آزادی اور امریکا اور اسرائیل کے خلاف ترک لیڈرشپ کے خیالات کی مثال دیتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر ترکی کو آج کی اسلامی ریاست اور طیب اردگان اور عبداللہ گل کو ماڈرن صلاح الدین ایوبی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں یہ طیب اردگان ہی تھے جنھوں نے 2005ء میں اسرائیل کا دورہ بھی کیا تھا اور اسرائیل کے صدر کو ترکی کے دورے کی دعوت بھی دی تھی اسرائیلی صدر شمعون پیریز نومبر 2007ء میں ترکی آئے تو ترکی کی موجودہ قیادت نے نہ صرف ان کا فقید المثال استقبال کیا بلکہ ان سے ترک پارلیمنٹ سے خطاب بھی کروایا یوں شمعون پیریز اسرائیل کے پہلے ایسے صدر بن گئے جنھیں کسی اسلامی ملک کی پارلیمنٹ میں قدم رکھنے اور اس سے خطاب کا اعزاز حاصل ہوا اور ترکی دنیا کا پہلا اسلامی ملک ہو گیا جس نے کسی اسرائیلی صدر کو اتنی اہمیت دی آج بھی ترکی کے اسرائیل کے ساتھ تجارتی صنعتی اور سیاحتی تعلقات قائم ہیں۔" (روزنامہ ایکسپریس، بدھ 25 دسمبر 2013ء)

موصوف محترم یہ سب کچھ لکھتے وقت بھول گئے کہ طیب اردگان وہ واحد اسلامی رہنما تھا

جس نے سوئزرلینڈ کے شہر ڈیوس میں ہونے والے ''ورلڈ اکنامک فورم'' کے اجلاس میں اسرائیلی صدر شمعون پیریز کی تقریر کے جواب میں تقریر کا وقت نہ ملنے پر اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اسرائیلی صدر کا وہ سنگدلانہ بیان تھا جس میں انہوں نے کہا کہ اسرائیل کو غزہ میں کیے گئے قتل عام پر کوئی شرمندگی نہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو وہ مستقبل میں بھی اس طرح کے اقدام سے گریز نہیں کرے گا۔

راقم یہ سطریں پڑھتے وقت سوچ رہا تھا کہ ایسی باتوں سے ان شہیدوں کی روح پر کیا گذرتی ہوگی جو ''فریڈم فلوٹیلا'' نامی امدادی بحری قافلہ لے کر غزہ گئے تھے۔ فلسطینی بھائیوں کے گرد قائم محاصرہ توڑ کر ان تک امداد پہنچانے کی یہ پہلی مؤثر بین الاقوامی کوشش تھی۔ جس میں ترک صحافیوں اور فلاحی کارکنوں نے پوری دنیا سے منتخب صحافی اور مبصر اکٹھے کیے۔ بین الاقوامی تبصرہ نگاروں کی موجودگی میں ایک بحری جہاز ''ماوے مرمرہ'' اپنے محصور ومظلوم فلسطینی بھائیوں کی امداد کے لیے بھیجا۔ اسرائیلی فوجیوں نے اس کو روکنے کے لیے بہیمیت کا مظاہرہ کیا اور اس پر دھاوا بول دیا۔ ان کے حملے سے شہید ہونے والے آٹھ ترک کارکنوں کی لاشیں جب استنبول پہنچیں تو پورا شہر ان کے استقبال کے لے امڈ آیا اور دنیا بھر میں اس کا ایسا اثر ہوا کہ اسرائیل کو کھلے لفظوں میں معافی مانگنی پڑی۔ گویا ترکی وہ پہلا ملک ہے جس نے یہ جرأت کی اور بین الاقوامی روایات کا سہارا لیتے ہوئے اس خوبصورتی سے کی کہ دنیا بھر کے ذہنوں کو جھنجھوڑ ڈالا اور انہیں باور کرا دیا کہ غزہ کے مظلوم فی الواقع مظلوم ہیں۔ اسرائیل کی وحشت و بربریت کھل کر سامنے آ گئی اور اسے اتنا شرمندہ ہونا پڑا کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسے جس اسلامی ملک کی حکومت سے معذرت کرنا پڑی، وہ اردگان کی حکومت تھی۔

جہاں تک اسرائیل کا دورہ کرنے یا شمعون پیریز کو اپنے ہاں بلانے کی بات ہے تو کسے

معلوم نہیں یہ ان دنوں کی بات تھی جب اسرائیل یہودی بستیوں کے لیے دیواریں تعمیر کرنے اور محصورین کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس دورے کا واحد مقصد اسے احساس دلانا تھا کہ وہ فلسطینیوں کو بالکل ہی بے آسرا اور بے سہارا سمجھنا چھوڑ دے۔ نیز اس کے قریب جا کر (نہ کہ اس کو قریب کر کے) اس کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ اسلامی ممالک کی طرف سے سب سے پہلے اسرائیل کے ساتھ تعلقات ختم کرنے کی دھمکی ترکی نے ببانگِ دہل دی تھی اور ترکی پوری دنیا کا واحد ملک تھا جس نے اسرائیل کے لیے سرکاری سطح پر سخت ترین الفاظ استعمال کیے تھے۔ جہاں تک اسرائیل سے تجارتی، سیاحتی تعلقات کی بات ہے تو یہ موجودہ ترک حکومت کے قائم کردہ نہیں۔ یہ اسے ورثے میں ملے ہیں اور سابقہ سیکولر دور کا تحفہ ہیں۔ ان کا الزام کم از کم اس حکومت کو نہیں دیا جا سکتا جس نے یہ داغ دھونے کے لیے متعدد شہداء کی قربانی دی ہے۔

دوسرا نکتہ بھی غیر سنجیدہ اور غیر محققانہ انداز کا شاخسانہ ہے۔ ہمارے معروف قلمکار لکھتے ہیں:

”ہم ترکی میں اسلامی روایات کی بحالی کے گن گاتے ہوئے یہ بھی بھول جاتے ہیں یہ اسلام پسند طیب اردگان اور عبداللہ گل ہی کا دور ہے جس میں ترکی میں عشق ممنوع اور میرا سلطان جیسے فحش ڈرامے بن رہے ہیں اور یہ ڈرامے نہ صرف ترکی میں دکھائے جاتے ہیں بلکہ پاکستان کی ثقافت کو بھی خراب کر رہے ہیں۔ آپ خود سوچیے! اگر طیب اردگان اور عبداللہ گل آج کے سلطان صلاح الدین ایوبی ہیں تو یہ پھر میرا سلطان اور عشق ممنوع جیسے غیر شرعی ڈراموں کی اجازت کیوں دے رہے ہیں؟ بات صرف اتنی ہے ہم ترکی میں ریاست مدینہ تلاش کر رہے ہیں جب کہ ترکی صرف اور صرف ایک ترقی یافتہ ماڈرن ملک ہے ہم اسے زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ ماڈرن اسلامی ملک کہہ سکتے ہیں ترک بہت سیدھے اپنے خیالات میں واضح اور بزنس فرینڈلی لوگ ہیں یہ جان چکے ہیں یہ نیل کے ساحلوں

سے کاشغر کی خاک تک اسلامی دنیا کی ٹھیکیداری نہیں کرسکیں گے۔ یہ سمجھ گئے ہیں ترقی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہاں صرف مذہبی آزادی ہوتی ہے۔''

اس طرح کا ایک مضمون اردو ڈائجسٹ میں چھپا تھا جس کی وضاحت راقم نے انہی دنوں کی تھی کہ یہ ڈرامے ترکی کے سند یافتہ سیکولر دور کی یادگار ہیں جب نماز اور حج کی اجازت بھی نہ تھی۔ سیکولر فلم ساز ان سے دہرے مقاصد حاصل کررہے ہیں۔ عثمانی دور کی بدنامی، موجودہ ترک حکومت کی اسلام کی طرف رجوع کو ناکام کرنے کی کوشش اور اس کی ساکھ کو خراب کرنے کی منصوبہ بندی، نیز بے تحاشا آمدنی اور دنیا بھر میں فحاشی کا فروغ۔ ترکی کی موجودہ حکومت نے ان ڈراموں کے پاکستان میں چلائے جانے پر سختی سے ناراضگی کا اظہار کیا ہے، لیکن ملک کے سیکولر قانون کے تحت جب وہ ملک اس پر پابندی نہیں لگا سکتے تو بیرون ملک کیسے یہ ممکن ہے؟ پاکستان کا حکمران جب انہیں اپنے ہاں چلانے سے نہیں روکتے تو عوام کیسے رکے گی؟ آپ اور ہم سب کو ایک ہی الفاظ میں کوسنے لگیں تو آخر اس سے کیا ملے گا؟

قارئین کو یاد ہوگا کہ جب اس سال ترک صدر عبداللہ گل حج کرنے کے لیے گئے تو اخبارات نے سرخی لگائی: ''ستر سال میں پہلے ترک حکمران کی حرمین حاضری'' اس موقع پر سعودیہ میں ترک سفیر نے اپنے سیکولر ہونے کی شناخت قائم رکھتے ہوئے اپنے بیان کے ذریعے یاددلانا ضروری سمجھا کہ اس سے کہیں اسلام پسندوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ انہوں نے کہا: ''اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ترکی سرکاری طور پر سیکولر ملک نہیں۔ ترکی اب بھی سیکولر ملک ہے۔'' جہاں کے اسلام پسند جس طرح کی مشکل صورت حال میں بہتری لانے کی اپنی سی کوشش کررہے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی برادرانہ ہمدردی کا تقاضا ہے نہ کہ کسی اور کے ماضی کے گناہ ان کے سر تھوپنا۔ یہ انصاف پسندی نہ ہوگی۔ یہی جواب ان تمام باتوں کا ہے

جو ترکی معاشرے میں پائے جانے والی مغربی زندگی کے مظاہر کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ جہاں ستر سال تک اذان، نماز، حج، اسلامی لباس پر پابندی تھی، وہاں کی موجودہ حکومت کو محض دس سال بعد یہ الزام دینا کہ وہ فلاں فلاں خرابی ختم نہیں کر سکی، ہرگز قرینِ انصاف نہیں۔ جس ملک میں فوج سیکولر قانون کی محافظ ہو، اس میں اس ایک عشرے کے عرصے میں جو کچھ اردگان حکومت نے کیا ہے، اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کو غیر معقول رویّے کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے محترم قلم کار کو ان حقائق کی خبر نہیں۔ آئندہ وہ ضرور بہتر رویے کا مظاہرہ کریں گے۔ جس طرح ان امید ہے کہ وہ آئندہ ”ٹھیکیداری“ لفظ کو اپنی تحریر میں جگہ نہیں دیں گے۔

تیسرا اعتراض نہایت دلچسپ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

”یہ درست ہے طیب اردگان ترکی میں گورننس میرٹ ایمانداری اور لاء اینڈ آرڈر کے چیمپین ہیں۔ انہوں نے ایشیا کے مرد بیمار کو نہ صرف اپنے قدموں پر کھڑا کیا بلکہ یہ اسے میراتھن ریس میں بھی لے آئے لیکن آپ یہ بھی ذہن میں رکھیے یہ سب کچھ کرتے وقت طیب اردگان کے دماغ میں اسلام نہیں تھا۔ یہ صرف ترقی، امن اور خوشحالی چاہتے تھے۔ ترکی کو بزنس چاہیے بھائی نہیں، جب کہ ہمارے قائدین طیب اردگان کو اپنا بھائی بنانے میں مصروف ہیں اور ہم عوام ترکی کے دل میں موجود پاکستانیوں کی محبت ٹٹول رہے ہیں۔ ہم آج بھی اس زعم کا شکار ہیں کہ ہم نے 1922ء میں ترک خلافت کے خاتمے پر مسلمان ہو تو ہندوستان چھوڑ دو کی جو تحریک چلائی وہ آج تک ترک حافظے میں موجود ہے اور ترکی آج بھی ہمیں اس قربانی کا دودھ پلاتا رہے گا۔“ (حوالہ بالا)

لگتا ہے ہمارے محترم قلمکار نے ایک دن کے لیے بھی ترک معاشرے کو دور سے بھی نہیں دیکھا۔ نہ انقرہ سے لکھنے والے فرقان حمید کو پڑھا ہے۔ ترک آج تک برصغیر کے

مسلمانوں کے اس احسان کو نہیں بھولے جو انھوں نے نقدی اور زیور کی شکل میں جنگ عظیم دوم کے دوران ترکی بھیجا تھا۔ فرقان حمید تک نے لکھا ہے کہ اس زیور سے جو کچھ بچا اسے سکّوں میں ڈھال کر ترکی کے بینک کے ابتدائی خزانے کے طور پر استعمال کیا گیا اور آج ترک معیشت جس مقام پر کھڑی ہے، اس کی پہلی اینٹ اسی رقم سے رکھی گئی تھی جو برصغیر سے گئی تھی اور آج ہمارے آباء واجداد کی یہ قربانی پاکستان کے مسلمانوں کے کھاتے میں جگمگا رہی ہے۔ ترکی میں جو بھی پاکستانی گیا ہے، وہ گواہی دے گا کہ ترک دوکاندار اور ڈرائیور سے لے کر عام مقامی تک ہر آدمی پاکستانیوں کو ''کاردیش'' کہتا ہے۔ یعنی وہ بھائی جو مشکل وقت میں آپ کے شانہ بشانہ لڑتا ہے۔ ترکی اور سری لنکا دنیا کے وہ ملک ہیں جہاں پاکستانیوں کی دل سے عزت کی جاتی ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے منفی تأثر پھیلا کر خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی نظروں سے بھی گرا رہے ہیں جن کے علاوہ کسی کی نظر میں ہمارا کوئی مقام پہلے سے نہیں ہے۔ یقیناً یہ رویہ قابلِ اصلاح ہے۔ راقم نے اس طرح کے متعدد واقعات اپنے ترکی پر لکھے گئے کالموں میں درج کیے ہیں جن سے ترکوں کی پاکستان سے بے لوث اور بے ساختہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ البتہ سیکولر ترک جیسے گولن گروپ اور پاک ترک سکول سے وابستہ افراد یقیناً وہی رویہ رکھتے ہیں جو ہمارے قلم کار نے لکھا ہے، لیکن دیندار ترک یا عام ترک پاکستان کو اپنا بھائی ہی نہیں، محسن بھی سمجھتے ہیں۔ راقم نے تو اس بس کی تصویر بھی چھاپی تھی جس پر ''جیوے جیوے پاکستان'' خوبصورت انداز میں لکھا ہے اور ترک حکومت نے اسے پاکستان سے محبت کے اظہار کے طور پر چلایا ہے۔ ترکی ان تین لفظوں (جیوے جیوے پاکستان) کو پاکستان کا ترانہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں ہمارے ایسے حقیقی برادرانہ احساسات کسی قوم کے دل میں پائے جاتے ہیں تو وہ ترک ہیں۔ ہمیں اس خوب صورت جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی بہترین

کاوشیں بروئے کار لانا چاہییں۔ فضا کو بہتر کرنا چاہیے۔ ایک سیکولر ترک اور عام ترک میں فرق کرنا چاہیے۔ ورنہ اس فضا کے مکدّر رہونے سے ہم اپنے حقیقی ہمدردوں سے محروم ہوکر ہوکر تنہا ہو جائیں گے۔

پاک ترک اسکول کی جانب سے خط

جناب ایڈیٹر صاحب!

ایک وضاحت

ہمارے مؤکل ''پاک ترک اسکولز'' کی ہدایت پر ایک وضاحت پیش کی جاتی ہے، جو ہفت روزہ ضرب مؤمن 3 تا 9 جنوری 2014ء کے شمارے میں کالم بعنوان: ''سیسی سے گولن تک'' سے متعلق ہے۔ یہ تحریر فاضل مصنف مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی ہے۔

فاضل مصنف کے کالم میں کیے گئے تجزیہ اور استدلال کے احترام کے ساتھ ساتھ ہمارے مؤکل اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ''پاک ترک اسکولز'' جو پاکستان میں ہیں، یہ رفاہی اور غیر سیاسی کوشش ہے۔ پاکستان میں ان کے قائم کرنے کا مقصد شعبۂ تعلیم میں انسانی تعمیر و ترقی ہے، جس میں تمام پاکستانیوں کا فائدہ ہے۔ خاص طور پر غریب، ضرورت منداور مستحق لوگوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنا ہے، تاکہ وہ اپنا ذریعۂ معاش اور روزگار خود تلاش کرنے کے قابل ہوسکیں۔ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا مقصود ہے، تاکہ وہ غربت کا خاتمہ کر کے اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

''پاک ترک اسکولز'' جناب فتح اللہ گولن اور ان کی تحریک ''ہزمت'' سے مکمل طور پر آزاد

اور بری الذمہ ہیں۔ جناب گولن کا پاک ترک اسکولز کے انتظام وانصرام اور مبانی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ادارے پر ان کا اثر ورسوخ ہے۔ یہ ادارہ انسانی ہمدردی کے ایجنڈے پر چلایا جا رہا ہے۔ ہمارے مؤکل اپنی خودمختاری اور جناب فتح اللہ گولن اور اس کی تحریک سے غیر وابستگی کی نشاندہی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی ایسا عندیہ جو جناب گولن کے ساتھ کوئی تعلق ظاہر کرتا ہو، اس کو بھی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے کلائنٹ اس پر زور دیتے ہیں کہ پاک ترک اسکولز کسی غیر ملکی طاقت یا اس کے اتحادیوں سے سیاسی یا کسی اور حوالے سے کسی قسم کی وابستگی، تعلق اور ہمدردی بالکل نہیں ہے۔ ان اسکولز کا مقصد انسانی ہمدردی کے علاوہ کچھ نہیں۔

جناب فتح اللہ گولن، اس کے فلسفیانہ افکار اور اس کے لاکھوں عقیدت مند جو ترکی اور بیرون ممالک میں ہیں، ان میں سے کسی کی حوصلہ افزائی یا دفاع کا ارادہ کیے بغیر ہمارے مؤکلین کا کہنا ہے کہ ترکی کی تاریخ میں پرانے اور حالیہ واقعات کی توضیح ایک سے زائد تعبیرات اختیار کی جاسکتی ہیں۔

انفرادی تجزیہ، جس سے آپ متفق ہیں، یہ تعمیر نو کی کوششوں، تاریخ اور واقعات کی تعبیر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جناب گولن کے افکار اور موجودہ تاریخ میں کردار کی متضاد توضیحات اور اندازے لگانا سعی لاحاصل ہے۔

صرف اس رائے کی وضاحت اور تائید کے لیے بہت ساری مثالیں حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ جناب گولن نے اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر 60 سے زائد کتابیں لکھی ہیں، ان کا خلاصہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

تاہم ہمارے کلائنٹ کسی سیاسی بحث مباحثے اور نظریاتی تنازعے میں پڑنا نہیں چاہتے، اور نہ ہی وہ آپ کی حمایت یا آپ کے مؤقر جریدے کے ذریعے اپنے کام میں بہتر

کارکردگی کے لیے تعاون کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

ہم آپ کے مشکور ہوں گے، اگر آپ اپنے معتمد جریدے میں اس وضاحت کو مناسب جگہ دیں، ورنہ ہمارے مؤکل کے پاس قانونی چارہ جوئی کا اختیار موجود ہے۔

آپ کا ممنون

ملک عبدالستار اعوان

M.A, LL.B Hons, LL.M.

Advocate High Court

For and on behalf of Juridicum

ایک حل طلب معمّہ

محترم جناب ملک عبدالستار اعوان ایڈووکیٹ صاحب!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر! آپ کی وضاحت من وعن چھاپ دی ہے۔ اس میں آپ نے زور دیا ہے کہ آپ کے مؤکلین کے تعلیمی اداروں کا گولن گروپ سے کوئی تعلق یا کسی قسم کی وابستگی نہیں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنے موکلین کے ذریعے درج ذیل امور کی وضاحت فرما دیجیے تاکہ خط کے موضوع کے حوالے سے پیدا شدہ ابہام یا تضاد ختم ہو جائے۔ ہم آپ کی وضاحت کو چھاپتے ہوئے نہایت خوشی محسوس کریں گے۔

1- فتح اللہ گولن صاحب کی تنظیم بنام ہزمٹ موومنٹ (hizmetmovement) کی آفیشل ویب سائٹ پر پاک ترک اسکول کے مونوگرام کے ساتھ درج ہے:

9 دہائیوں کے بعد ترکی دوبارہ کراچی میں۔ ترک تنظیم کی طرف سے سندھ میں اسکولوں کا نظم قائم کرنے کی پیشکش۔

اس کے بعد اس منصوبے کا ذکر ہے جس کے تحت سندھ بھر میں پاک ترک اسکول قائم کیے گئے۔

2- گولن صاحب کی اپنی آفیشل ویب سائٹ http://hizmetnews.com پر ان کے تعلیمی و فلاحی اداروں کی شاخوں کے طور پر پاک ترک اسکول کا جا بجا بلکہ واحد ادارے کے طور پر تذکرہ ہے۔ ہر کوئی اس کا وزٹ کر سکتا ہے۔

3- گولن اسکول ورلڈ وائڈ کے بلاگ پر دنیا بھر میں اس تحریک کے تحت چلنے والے سکولوں کی فہرست میں لکھا ہے:

گولن سکول جو پاکستان میں پاک ترک کے نام سے ہیں۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات مصطفیٰ کمال اتاترک اور ترکی ترانے کے بارے میں خصوصیت سے سیکھتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ تصویر بھی دی گئی ہے جس میں پاکستان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے سامنے ایک شخص ڈھول بجا کر ترانہ گا رہا ہے اور پیچھے پس منظر میں اتاترک کی قد آدم تصویر ثبت ہے۔

4- پاک ترک سکولز کی آفیشل ویب سائٹ میں گولن صاحب کی ایک تصویر دی گئی ہے۔ لاہور میں منعقد ایک تقریب میں لی گئی اس تصویر کے تحت لکھے گئے تعارف میں پاک ترک اسکول کی یہ ویب سائٹ ناظرین کو بتاتی ہے:

21 نومبر 2012 کو فاؤنٹین میگزین کی جانب سے اور پنجاب یونیورسٹی کے تعاون سے مثالی انسان اور مثالی معاشرہ فتح اللہ گولن کے نظریات کی روشنی میں کے عنوان سے لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ فتح اللہ گولن اس تنظیم کے شریک منتظم ہیں جو پاک ترک اسکول چلا رہی ہے.........

5- نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے الفاظ ہیں:

پاک ترک اسکول فتح اللہ گولن کے دماغ کی ایجاد ہیں۔ اس کے بعد بڑے وقیع الفاظ میں گولن صاحب اور ان کی تحریک کا تعارف ذکر کیا گیا ہے۔

13 6-اکتوبر 2012 کے روزنامہ ڈان میں ایک خبر لگی تھی جس کا متن کچھ یوں تھا:

ایک ترک ادارے نے سندھ حکومت کو صوبے میں تعلیم کے شعبے کی ترقی کے لیے پورے صوبے میں آرٹ کے ادارے قائم کرنے کی پیشکش کی ہے۔ سندھ حکومت کو یہ پیشکش پاک ترک اسکول اینڈ کالجز آف فتح اللہ گولن موومنٹ کے سربراہ کی قیادت میں آنے والے وفد نے کی۔ وفد کی قیادت اونال سور کر رہے تھے۔ اونال سور نے یہ اعلان جمعرات کے روز سندھ اسمبلی کے اسپیکر نثار کھوڑو کی دعوت پر ایک مقامی ہوٹل میں عشائیے میں شرکت کے موقع پر کیا۔ تقریب میں ترکی قونصلر مراد مسٹر اونارٹ (Murat M. Onart) اور دیگر کئی قانون سازوں نے بھی شرکت کی۔

مسٹر سونار نے ترکی میں تعلیمی شعبے کی ترقی کے لیے فتح اللہ گولن کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ تمام مسائل ایک مشترکہ گراؤنڈ تلاش کر کے حل کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ فتح اللہ گولن اس کے علاوہ، ملک کے آٹھ شہروں میں مزید اٹھارہ اسکول بھی چلا رہے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ بھی ذوالفقار علی بھٹو انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے مختلف منصوبوں میں تعاون کیا گیا تھا۔ مسٹر اونال سور نے پاک ترک اسکول اینڈ کالجز کا نیٹ ورک کو وسعت دینے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمارا ادارہ اعلی اور معیاری انسٹیٹیوٹس قائم کرنے کے لیے بالکل تیار ہے اگر ہمیں کراچی میں زمین دے دی جائے۔ (ڈان نیوز، 13 اکتوبر 2012)

http://dawn.com/2012/10/13/turkish-firm-offers-to-set-up-schools-in-sindh/

7-وکی پیڈیا میں گولن موومنٹ کی تعلیمی میدان میں کارکردگی کے تعارف کے تحت لکھا ہے:

گولن موومنٹ تعلیمی میدان میں بہت متحرک ہے۔ اس تحریک کے تحت چلنے والے

اسکولوں میں 20 لاکھ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور بہت سے طلبہ کو سکالرشپ بھی دی جاتی ہے۔ ان اسکولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس تحریک کے ترکی میں 300 اور دنیا بھر میں 1000 سے زائد اسکول ہیں۔ اس فہرست میں پاک ترک اسکولز اینڈ کالجز کا نام بھی شامل ہے۔ لنک مندرجہ ذیل ہے۔

http://en.wikipedia.org/wiki/G%C3%BClen_movement

http://www.turkokullari.net/index.php?option=com_weblinks&catid=14&Itemid=22

اس کے علاوہ کوئی عام شخص بھی اگر یہ سرچ کرے کہ گولن گروپ کے تعلیمی ادارے کا نام پاکستان میں کیا ہے؟ یا یہ سرچ کرے کہ پاک ترک سکول کا نظریاتی راہنما و سرپرست (فرد یا تنظیم) کون ہے؟ تو اسے فورا دونوں کا ربط اور باہمی تعلق بتا دیا جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ازراہ کرم یہ معمّٰی حل فرما دیجیے۔

والسلام

شاہ منصور

اور جب مٹی جھڑنے لگی

آخر کار گولن گروپ کے مینار سے مٹی جھڑنا شروع ہوگئی ہے۔ ترکی میں اس کے زیرِعتاب آنے کی دیر تھی کہ پاکستان میں اس کے زیرِ سرپرستی چلنے والے اداروں نے اس سے اظہار براءت شروع کردیا ہے۔ اس طرح اس کا وہ جادو دم توڑ رہا ہے جو امریکا و اسرائیل کے تعاون سے اسلامی دنیا میں سیکولرازم اور مغربی مقاصد کو پروان چڑھانے اور ترکی کے اسلام پسندوں کے ارمانوں کا خون کرنے کے لیے پھونکا گیا تھا۔ ایک طرف تو ترکی میں ترک تاریخ کے مقبول ترین اور ذہین ترین وزیراعظم رجب طیب اردگان نے انتہائی دوراندیشی اور دلیرانہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے، ان 470 پولیس اہل کاروں اور 96 ججوں کو برطرف یا تبادلہ کردیا ہے، جنہوں نے اپنے فرائض و اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے مملکت سے وفاداری کے بجائے اپنے اس سرپرست کے کام آنے کی کوشش کی جس نے انہیں اس دن کے لیے تیار کرکے بھرتی کروایا تھا۔ دوسرے طرف پاکستان میں واقع پاک ترک اسکولز کی چین نے احقر کو خط لکھ کر وضاحت کی ہے کہ ان کا گولن گروپ سے کوئی تعلق نہیں، اور وہ ان سے کسی قسم کی وابستگی یا تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیں اتنی جلدی اس تبرّابازی کی امید نہ تھی۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ چٹان جو ان حضرات کے پاؤں کے نیچے تھی، اتنی جلدی

بھر بھری ریت کا تودہ ثابت ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ اس خط کا پیرا وار جواب اس انداز میں لکھوں کہ خط کے تمام اہم نکات پر قطعہ وار تبصرہ کیا جائے۔ میرے محترم کرم فرماؤں کی سہولت اوران کی تفہیم میں آسانی کے واسطے۔

خط کا شق وار خلاصہ کچھ یوں ہے: ''(1)..... یہ تعلیمی ادارے خالصتاً غیر سیاسی ہیں۔ ان کا مقصد تعمیر وترقی ہے۔ خاص طور پر غریب لوگوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنا، تاکہ وہ اپنا ذریعہ معاش تلاش کرنے کے قابل ہوسکیں۔

(2)..... پاک ترک سکولز فتح اللہ گولن اوران کی تحریک ''ہزمت'' سے مکمل طور پر لاتعلق ہیں۔ ان کی اس تعلیمی تحریک سے کسی طرح کی کوئی وابستگی نہیں۔

(3)..... جناب فتح اللہ گولن اوران کے فلسفیانہ افکار اور لاکھوں عقیدت مندوں کے باوصف ترکی میں حالیہ دنوں جو کچھ انہوں نے کیا اور پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے، اس کی ایک سے زائد تعبیرات کی جاسکتی ہیں۔

(4)..... جناب گولن نے اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر 60 سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا خلاصہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔''

اب ہم اہم شقوں پر ایک ترتیب وار نظر ڈالتے ہیں۔

(1)..... پہلی بات سے متعلق عرض ہے کہ جناب والا! دنیا کی تمام این جی اوز یا مشنری اسکولز کی طرح کائرس ہیملن ترکی میں سیکولر تعلیمی اداروں کے بانی نے بھی یہی کہا تھا کہ ''اسلام بول'' میں میرے کالج کا قیام قطعاً غیر سیاسی اور خالصۃً تعلیمی وفلاحی سرگرمی ہے۔ مگر بالآخر اس خالص رفاہی کام نے ''اسلام بول'' کو ''استنبول'' بنا کر چھوڑا اور یہاں کے پروردہ روزگار کے متلاشی طلبہ نے سرکاری مناصب میں جگہ حاصل کرکے مصطفیٰ کمال پاشا کی سربراہی میں ستر سال تک ترکی کو سیکولرازم کے جابرانہ چنگل میں جکڑے رکھا۔ اب ذرا

سانس لینے کی مہلت ملی ہے تو آپ ''تعلیم برائے روزگار'' کا نظریہ لے کر ''اسلام آباد'' تشریف لائے ہیں۔ ہم کیوں نہ ڈریں کہ کہیں یہ بھی ''آستانہ آباد'' نہ بن جائے۔ ترکی میں آپ کی طرف سے حکومت گرانے کی حالیہ کاوشوں سے ہم سبق نہ لیں تو کون لے گا؟ یہ بھی آپ نے خوب فرمایا ہے کہ ان اداروں کا مقصد غریب، مستحق اور ضرورت مند لوگوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنا اور روزگار کے قابل بنانا ہے۔ ''تعلیم برائے تہذیب'' کے بجائے ''تعلیم برائے روزگار'' کا نظریہ آپ نے خوب اپنایا، لیکن کیا آپ پورے پاکستان میں اپنا ایسا اسکول دکھا سکتے ہیں جو غریب علاقے میں ہو یا جس میں اکثریت غریب بچوں کی ہو، انہیں مفت یا سستی تعلیم دی جاتی ہو؟ آپ کے اسکول مہنگے علاقوں میں ہیں اور ان کی مہنگی فیسوں کو غریب خاندان کبھی ادا کر ہی نہیں سکتے۔

(2)..... ''پاک ترک'' اسکول کا گولن گروپ سے لاتعلقی اور ہمہ قسم وابستگی کا یکسر انکار ہمارے دور کا حیرت انگیز واقعہ قرار دیا جائے گا۔ ایک مشہور کہاوت ہے: ''فتح کے دعویدار شمار نہیں ہوتے اور شکست کے وارث ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔'' یہ محترم گولن صاحب کے لیے انتہائی عبرت کا مقام ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو دھندلے شیشے والے محل میں بند کر کے جو تعارف بنایا تھا، وہ ان کی زندگی ہی میں ترکی کی موجودہ حکومت کے خلاف اپنے تعلیم یافتہ لوگوں کو امریکا کے اشارے پر میدان میں لانے سے تباہ و برباد اور مسخ و فسخ ہو گیا۔ اس حد تک کہ ان کے پروردہ، ان کے تیار کردہ، جو کل تک ان سے وابستگی پر فخر کرتے تھے، آج کھلم کھلا ان سے یکسر براءت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خدا جانے یہ تُرک اسلام پسندوں کی قربانیوں کے ثمرات ہیں یا ترکی کے ستم رسیدہ اور دل گرفتہ مشایخ اور عوام کی دعائیں ہیں کہ طیب اردگان نے اس گروپ کی طرف سے کھڑے کیے گئے مصنوعی بحران پر فوراً ہی قابو پانے کے بعد پوری ذہانت اور شجاعت سے پولیس اور عدلیہ سے ان کا تصفیہ کرنے کا بھرپور

آغاز کامیابی کے ساتھ کر دیا ہے۔ اور اس نے اعلان کیا ہے کہ وہ اب غیر ملکی طاقتوں کے اشارے پر چلنے والے ان معلّمینِ قوم کو ان کے بلوں سے نکال کر دم لے گا۔ غیر ملکی طاقتوں کی آشیر باد اور یورپی یونین کی حمایت کے علی الرغم تمام مخالفین اردگان کی استقامت کے سامنے بونے نظر آ رہے ہیں۔ اور اپنے شیخ و مرشد اور رہنما و مقتدا (گولن صاحب ''جماعت نور'' کے روحانی سر پرست بھی ہیں) سے اتنی جلدی لاتعلقی کا اعلان کر رہے ہیں کہ وفاداریاں بدلنے کے ریکارڈ میں پاکستانی سیاست دانوں کو پیچھے چھوڑنے کے ساتھ اپنے دنیا بھر کے عقیدت مندوں کو بھی حیرت زدہ کر دیا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ لاکھوں عقیدت منداس انکار کے بعد کیا سوچیں گے جو آج تک اس تعلیمی تحریک سے محض اس لیے وابستہ تھے کہ وہ گولن صاحب کی سر براہی میں چل رہی ہے۔

پاک ترک اسکول کا گولن گروپ سے لاتعلقی کا اظہار بالکل ایسے ہے جیسے اماوس کی رات کہے: ''میرا اندھیروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ازراہِ کرم اس کو محض ادبی تشبیہ نہ سمجھیے گا۔ پاک ترک اسکول کی رجسٹریشن کے کاغذات سے لے کر ترکی کے کالج و یونیورسٹیز میں موجود آپ کے بھیجے ہوئے پاکستانی طلبہ تک اس کا ثبوت ہیں کہ گولن گروپ کی تعلیمی تحریک کے علمبردار پاک ترک اسکول ہی ہیں۔ قارئین کی تسلی کے لیے چند باتیں پیش خدمت ہیں، جن سے سرکاری، صحافتی اور سیاسی سطح پر ان تعلیمی اداروں اور گولن گروپ کے تعلقات کی وسعت، گہرائی اور گیرائی بخوبی واضح ہو جائے گی۔ بقیہ چیزیں محفوظ ہیں۔ بوقت ضرورت جب سند درکار ہوئی، پیش کر دی جائیں گی۔

یہاں چند باتیں تحریر کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس گروپ کے پیدا کردہ مصنوعی بحران سے ترکی کو بچا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے اور امت کس طرح سے ایک بڑے المیے یا نئے زخم سے بچ گئی ہے۔ میں الحمدللہ اس شخصیت کو بھی جانتا ہوں جس

نے آج سے بیس سال پہلے پہلی مرتبہ 1994ء میں ان تعلیمی اداروں کے لیے پاکستان میں ''پاک ترک'' اسکول کا نام تجویز کیا۔ پاکستان میں کام کے آغاز میں ان کے بے لوث تعاون کی بنا پر گولن صاحب نے ان کو انقرہ بلایا اور دنیا بھر سے آئے ہوئے تحریکی کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں تین دن ان کو اپنا خصوصی مہمان رکھا۔ تینوں دن صبح دونوں حضرات کا ناشتہ ایک ہی تھال میں ہوتا تھا۔ بعد میں ان صاحب کو جیسے ہی اصل حقائق و مقاصد اور امریکہ و اسرائیل سے گولن صاحب کے روابط کا علم ہوا تو انہوں نے ان سے یکسر لاتعلقی اختیار کر لی۔ آج انہوں نے اپنے نام کے ساتھ یہ باتیں لکھنے کی اجازت دی ہے، لیکن میں فی الحال ان کے تعارف کو مناسب وقت کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔ پاک ترک اسکول کے پہلے ڈائریکٹر شکری اسلان تھے۔ ان کے بعد برھان چیچک۔ یہ دونوں صحافیوں کے روپ میں پاکستان آئے حالانکہ ان کا صحافت سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ پاک ترک اسکول کے رجسٹریشن فارم سے ان امور کی بخوبی تصدیق ہوسکتی ہے۔ چند سال بعد 1996ء میں ان دونوں نے ترکی واپس جا کر اس ادارے سے نامعلوم وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا۔ ان وجوہات کی نوعیت خفیہ راز رہتی اگر تین ممالک میں یکے بعد دیگرے اس تنظیم کے تعلیمی اداروں پر پابندی نہ لگتی۔

سب سے پہلے روس نے ان پر پابندی لگائی اور وجہ یہ بتائی کہ یہ سی آئی اے کے لیے کام کرتے ہیں۔ پھر ایران اور اس کے بعد آذربائیجان نے انہیں ممنوع قرار دیا اور وجہ یہ بتائی کہ یہ سی آئی اے اور موساد کے لیے مشترکہ طور پر کام کرتے ہیں۔ اس وقت فلسطین میں اس تحریک کا کوئی سکول نہیں، البتہ اسرائیل میں اس تعلیمی مشن کے قیام کے لیے گولن صاحب اور اسرائیل کے چیف ربائی بخشی دوران کے درمیان 25 فروری 1998ء کو استنبول میں باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ اس میں تحائف کے تبادلے اور بھرپور خیرسگالی کے اظہار کے ساتھ گروپ کے تعلیمی اداروں

کے اسرائیل میں قیام میں دلچسپی ظاہر کی گئی تھی۔ اس ملاقات میں فریقین کے درمیان ترجمان کی مکمل ترجمانی روئیداد بمع تصاویر محفوظ ہے۔ جو صاحب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

http://www.turkishpolicy.com/dosyalar/files/101-114.pdf

قادیانیوں کے تل ابیب مرکز اور بہائیوں کے ''حیفہ'' مرکز کی طرح گولن گروپ، جماعت نور اور ہزمت تحریک کے یہودیوں سے تعلقات اس تحریک کی نظریاتی حیثیت پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہیں۔ ان دو فرقوں کے بعد گولن گروپ تیسری جماعت ہے جس سے شدت پسند اسرائیلی ربائی ملاقاتیں کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ طیب اردگان کا بار بار کہنا کہ حالیہ بحران کا تعلق چند غیر ملکی خفیہ ہاتھوں سے ہے، یہ ہرگز مقامی مسئلہ نہیں، کس طرف اشارہ کرتا ہے؟

وزیر اعظم پاکستان محترم جناب نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف سے پرزور درخواست ہے کہ طیب اردگان اور فتح اللہ گولن میں فرق کریں۔ اسلام پسند اور سیکولر ذہن کو الگ الگ تناظر میں دیکھیں۔ صرف اسے ہی بھائیوں کا درجہ دیں جو خود اپنے ملک میں بدنام یا زیر عتاب نہیں۔ ترکی حکومت کے زیر عتاب گروپ کو پاکستان میں کھل کر کام کی اجازت دینا ترک ملک سے ہمارے تعلقات میں رخنہ ڈال سکتا ہے۔ پاکستان میں مشرف دور کی ابتدا میں ان کے ادارے پر ملکی سلامتی کے ذمہ دار اداروں کی طرف سے سخت تفتیش کی گئی ہے، جو نہایت سنگین بات ہے۔

(3)..... گولن صاحب کے فلسفیانہ افکار کی بات بہت خوب ہے اور ان کی 60 سے زائد کتابوں کا حوالہ بھی نہایت برمحل ہے۔ نجانے آپ نے جہان نیوز ایجنسی اور زمان اخبار کا حوالہ کیوں نہیں دیا؟؟ کیا ہارون یحیٰ صاحب نے ان سے زیادہ معرکۃ الآراء کتابیں نہیں لکھیں؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی ان کی اپنی تحریر کردہ ہے؟ ان عالمی سطح کے

مصنف سے جب شوقِ ملاقات پورا ہوا تو پتا چلا کہ پروفیسر اور پی ایچ ڈی پر مشتمل پینل کتابیں لکھ لکھ کر ہارون یحییٰ کے فرضی نام سے شائع کرتا ہے اور ہمارے ممدوح مصنف (جن کا اصل نام عدنان اوکٹر ہے) استنبول کے پوش علاقے میں شام سے رات گئے تک محفلیں سجانے اور دن کو سونے کے علاوہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتے۔ ان کے عقیدت مندوں کو اب بتانا ضروری ہو چکا ہے کہ ذمہ دارانہ نظریاتی صحافت اور سوداگرانہ تعلیم یا تجارتی صحافت میں کیا فرق ہوتا ہے؟

(4)..... آپ گولن صاحب کی کتابوں کے خلاصہ کی پیش کش کرتے ہیں، ترکی میں ان کے موجودہ افسوسناک کردار کی وہاں کے تحریکی کارکنوں کی تعبیر سے ہٹ کر توضیح کے امکان پر بھی زور دیتے ہیں، گولن صاحب کے ملک اور بیرون ملک درجنوں عقیدت مندوں کی یاد دہانی بھی کراتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی یا دفاع کا ارادہ نہیں۔ یعنی بھرپور ساتھ بھی دے رہے ہیں، باتوں باتوں میں ان کے فضائل کا اظہار اور در پردہ حمایت بھی کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صورتحال بزبان غالب: ''ہر چند کہیں ہے نہیں ہے'' کا کیسا بھرپور مصداق ہے؟ میں آپ سے اس رویہ کی توقع نہیں کرتا جس میں ایک سانس میں دو متضاد رویّے اپنائے گئے ہوں۔ از راہِ کرم آپ حق گوئی کی روایت کو قائم کرتے ہوئے صرف حقائق کو پیش نظر رکھیں۔ یہ رویّہ جماعت نور جیسی تنظیم کے سربراہ اور فلسفی و دانش ور کی شہرت رکھنے والی شخصیت کے پیروکاروں سے جوڑ نہیں کھاتا۔

قالین صاف کرنے والی مشینیں

گولنسٹ اور مکالمسٹ حضرات کا انوکھا تعارف

☆

یہ عالمِ اسلام پر مسلط کی گئی ''عسکری جنگ'' کے متوازی ''نظریاتی جنگ'' کا ایک حصہ ہے
جس میں مسلمانوں کے ملکوں، حکمرانوں اور جسموں کے بعد ان کی عقلوں کو فتح کرنا مقصود ہے۔

☆

علمائے حق کو چاہیے کہ کامل استغناء اور زہد و قناعت کا ثبوت دیتے ہوئے اکابرین کی روایات کو زندہ کریں۔
ایسی پُرفریب دعوت کو سختی سے ٹھکرا کر اپنے بڑوں کی روایت کو زندہ کریں۔

☆

پاکستان میں جناب فتح اللہ گولن صاحب نے اپنی تعلیمی تحریک کے آغاز کے لیے 1994ء میں دو حضرات کو بھیجا۔ ایک کا نام شکری ارسلان جب کہ دوسرے کا نام بہران چپچیک تھا۔ دونوں معلمین حضرات پاکستان میں بطورِ صحافی آئے تھے۔ انہوں نے سرکاری صحافیانہ مراعات بھی حاصل کیں تا کہ وہ پاکستان میں اعلیٰ سرکاری تقریبات اور حکومتی دفاتر میں داخل ہوسکیں۔ درحقیقت ان دونوں افراد کا صحافت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ساتھ ساتھ

انہوں نے ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی بھی قائم کی جس کے ذریعہ سے بہت اچھے معیار کی قالین صاف کرنے والی مشینیں درآمد کی گئیں۔ ان مشینوں میں خفیہ آلات نصب تھے، جن کی بنیاد پر ان کی قیمت بہت زیادہ تھی، لیکن دام کم رکھے گئے تاکہ کسی کی گندی قالین صاف ہو یا نہ، لیکن ان کے سامنے تمام دھندلے مناظر صاف نظر آئیں۔ یہ اپنی جگہ بیٹھ کر امراء کی بیٹھکوں میں ہونے والی مشاورت اور گفتگو صاف سن سکیں۔ ویکیوم کلینرز کے ذریعے امرا کے بیڈ روم میں پہنچنا ایک انوکھا اور دلچسپ طریقۂ واردات ہے۔ خفیہ اداروں نے 2000ء کی دہائی کے شروع میں اسلام آباد میں ان کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ انکشافات کی حقیقت آج بھی سربستہ ہے۔ اتنی بات طے ہے یہ ''صحافی'' حضرات اس مشین کے ذریعے بڑے بڑے امراء کے گھروں میں داخل ہوئے۔ ان سے رابطے بنائے اور معلومات حاصل کیں۔ یہ معلومات کس نوعیت کی ہوتی ہیں، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ''صحافت'' اور ''تجارت'' کے بعد تیسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ ترکی کے ''زمان اخبار'' کے نمایندہ ہونے کے حوالے سے یہاں پر حکومتی مراعات حاصل کیں۔ اس اخبار کا ایک دفتر قائم کیا۔ میڈیا کے میدان میں کام کرتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک نیوز ایجنسی ''جہان'' بھی یہاں رجسٹرڈ کروائی۔ ''جہان نیوز ایجنسی'' اور ''زمان اخبار'' ترکی میں گولن تحریک نے شروع کیے تھے۔ یہی یہاں بھی شروع کردیے گئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں اس کے مقاصد کیا تھے؟ تعلیم، صحافت اور تجارت کے ذریعے ملک کے طبقہ اشرافیہ میں جگہ بنانا اور چابی والی کرسیاں اپنے ہاتھ میں لینا اور بوقت ضرورت انہیں استعمال کرکے آج کے ترکی جیسے حالات پیدا کرنا، اس تحریک کے نمایاں مقاصد میں سے ہے۔

ان سب کچھ کے علاوہ اس تحریک کا ایک اہم طریقۂ واردات یہ ہے کہ اثر ورسوخ رکھنے والے امیر گھرانوں کے بچوں کو..... اور ضرورت پڑے تو ان کے ذریعے ان کے

والدین کو.....ترکی کے پرکشش و پرتعیش تفریحی دورے کرواتے ہیں۔ اس کے بعد قالین صاف کرنے والی مشینوں کو ان بااثر گھرانوں میں پہنچانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو ایک مرتبہ ان کی پرتعیش میزبانی سے لطف اندوز ہو جائے، وہ خود ہی ان کے لیے خودکار مشین بن جاتا ہے۔ چُنے ہوئے امرا کے بچے حتیٰ کہ ان کے والدین کو ترکی کی سیر کروا کے ان خاندانوں میں اثر و رسوخ قائم کرنا ان کا مشہور اور مخصوص طریقۂ کار ہے۔ اس طریقِ کار کے تحت بہت سے اہم لوگ ان کے زیر دام آ چکے ہیں اور خطرناک بات یہ ہے کہ ان کا یہ تعلق یا ربط ضبط پاک ترک دوستی یا ملت کے مشترکہ برادرانہ مفادات کے لیے نہیں، امریکا اور اسرائیل کے مفادات کے لیے استعمال ہوگا۔ محافظانِ وطن کو اس کا شعور ابھی سے ہو جانا چاہیے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ”ترکی یاترا“ کی یہ مہم اب علماء اور دینی مدارس کے ذمہ داروں یا ان کے صاحبزادوں کو ہدف بنا کر چلے گی۔ فقیر جیسے لوگ تو ان کی قانونی چارہ جوئی کی دھمکی میں نہ آئے، اب وہ حضرات جن کے متعلق اندیشہ ہے کہ ان کی اصلیت سے واقف ہو کر ان سے متنفر ہو جائیں گے، انہیں کسی کانوکیشن، سیمینار وغیرہ کے عنوان سے ترکی لے جایا جائے گا اور گولنسٹ حضرات کی خدمات سے متعارف کروانے کے نام پر پُرتعیّش تفریحی دورے کروائے جائیں گے؟؟؟ ہوشیار ہو جائیں کہ ایسے دعوت نامے ان کی طرف بھیجنے کی منصوبہ بندی جاری ہے۔ علمائے حق کو چاہیے کہ کامل استغناء اور زہد و قناعت کا ثبوت دیتے ہوئے اکابرین کی روایات کو زندہ کریں۔ ایسی پُرفریب دعوت کو سختی سے ٹھکرا کر اپنے بڑوں کی روایت کو زندہ کریں۔

اسلام آباد میں چھاپہ پڑنے کے بعد جب مطلوبہ کاروباری سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں تو انہوں نے اپنا کاروبار یا طریقۂ واردات لاہور منتقل کر دیا اور وہاں پر ایک بزنس فورم قائم کیا۔ لاہور میں ان کی سرگرمیاں اسی پلیٹ فارم کے دم قدم سے قائم ہیں۔ پاکستان میں

انہوں نے ایک اور ادارہ ''رومی فورم'' کے نام سے رجسٹرڈ کیا۔ یہ ''رومی فورم'' درحقیقت امریکا میں رجسٹرڈ ہے اور حسب عادت دھوکا دینے کے لیے مولانا رومیؒ جیسی شخصیت کے نام پر رکھی گئی ہے۔ اصل میں رومی فورم کی بنیاد واشنگٹن میں رکھی گئی تاکہ مولانا جلال الدین رومیؒ کا نام استعمال کر کے عوام میں یہ تاثر دیا جائے کہ ہم نرم مزاج اور تصوف پسند لوگ ہیں، چنانچہ یہ فورم اسی نام سے پاکستان میں بھی کام کر رہا ہے۔ بدعتی یا جاہلی تصوف کے ذریعے مسلمان معاشروں میں نفوذ حاصل کرنا آج کی مغربی دنیا کا مرغوب طریقہ واردات ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ''مکالمہ بین المذاہب'' نامی مہم کے ذریعے اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے موقف کے حوالے سے متزلزل کرنے کے لیے جو شعبدہ بازی چل رہی ہے، رومی فورم اس کے مہروں میں سے ایک ہے۔ اس فورم کو جناب فتح اللہ گولن کی جانب سے قیام امن اور مکالمہ بین المذاہب کی عالمی کوشش کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ فورم گولن صاحب کی نظریاتی تحریک گلوبل سوک (عالمی، شہری) تحریک ''ہزمت موومنٹ'' کا ایک حصہ ہے۔ پاکستان میں آنے سے پہلے یہ فورم ڈی سی، میری لینڈ، ورجینیا، ڈیلاویر، شمالی کیرولینا اور کنٹکی میں فعّال تھا اور ہے۔ اس کے متعلق ہم تحقیق کرنے جائیں تو اس قرآنی اصول کا سہارا لیں گے: ''تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم ان کی پیروی نہ اختیار کر لو۔'' (البقرۃ:120)

گولن صاحب سے یہود و نصاریٰ نہ صرف خوش ہیں بلکہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مثلاً: جیک گولڈسٹون۔ جارج میسن یونیورسٹی کے مشہور یہودی پروفیسر ہیں۔ وہ گولن صاحب کی اس تحریک کے متعلق اپنے اطمینان بھرے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''میرے خیال کے مطابق فتح اللہ گولن ایک قابل احترام فلسفی ہیں۔ مجھے اس کے

اثر ورسوخ سے خوشی ہے کہ اس کے تمام پیروکار صدقہ، بین المذاہب امن اور تشدد کی مذمت جیسے مقاصد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے اس امر پر تکلیف ہوتی ہے کہ ان کے خلاف بولنے والے ان کو ’’گولنسٹ‘‘ کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اس بات پر دُکھ ہوتا ہے کہ ان (گولن) کے بارے میں لوگوں کو ذرا برابر علم نہیں۔ یہ لوگ گولن کی تصنیفات، اس کی تنظیموں اور اداروں کے پیچھے سازشی ہاتھ دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس کا کوئی وجود نہیں، لیکن ہم بھی انسان ہیں، جذبات اور احساسات رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم چیزوں پر لیبل لگا دیتے ہیں اور میرا تجربہ تو یہ ہے کہ گولن سے متعلقہ ادارے تنظیمیں مکمل طور پر مثبت پہلو رکھتی ہیں۔ میں ایک یہودی استاد ہوں۔ امریکا میں پیدا ہوا ہوں۔ والدین یورپی ہیں اور ہر فرد مجھے اس معاشرے کا فرد سمجھتا ہے اور ہم ان مقاصد کی حمایت کرتے ہیں۔ میں فتح اللہ گولن کے سیاسی واقعات سے متعلق تمام تر بیانات دیکھ چکا ہوں اور اس کے ساتھ بوسٹن بمباری کے متاثرین کے حوالے سے بیانات پڑھ چکا ہوں۔ یہ سب ہمیشہ تشدد کے خلاف اور امن کے حق میں ہوتے ہیں۔ اور تمام مذاہب کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ میں اس مماثلت اور مشابہت سے بہت خوش ہوں جو میں نے گولن اور اس کی تحریک سے حاصل کی۔ میں اس کے حامیوں کی سرگرمیوں سے بھی خوش ہوں جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ عظیم سرگرمیاں رکھتے ہیں اور میرے خیال کے مطابق ان کی تنظیم بھی عظیم ہے۔‘‘

مایۂ ناز یہودی دانش وروں کا گولنسٹ حضرات کی تحریک اور مقاصد سے اتفاق اور اس پر اعتماد نہ صرف ان کے باہمی رشتوں کی نقاب کشائی کرتا ہے، بلکہ ’’مکالمہ بین المذاہب‘‘ نامی اس جدید عصری فتنے کی اصلیت سے بھی آگاہی دیتا ہے۔ یہ عالمِ اسلام پر مسلط کی گئی ’’عسکری جنگ‘‘ کے متوازی ’’نظریاتی جنگ‘‘ کا ایک حصہ ہے جس میں

مسلمانوں کے ملکوں، حکمرانوں اور جسموں کے بعد ان کی عقلوں کو فتح کرنا مقصود ہے۔ درج بالا تحریر کا لفظ لفظ بتا رہا ہے اور اس میں استعمال کی گئی ہر اصطلاح پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسے یہودی زعمانے تخلیق کیا ہے اور وہ ''مکالمسٹ'' حضرات کے حامی بلا وجہ نہیں، بلکہ اس وجہ سے انہیں پروان چڑھا رہے ہیں کہ یہ میدان جنگ سے پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں میں ان کا کام آسان کر رہے ہیں۔

ان کی یہ مہم مزید آگے چلتی تو نجانے کیا گل کھلاتی کہ اتنے میں ان سے وہ فحش غلطی ہوئی جس کا ذکر ہم پچھلے کالموں میں کر چکے ہیں۔ امریکا کے کہنے پر اپنے ہی ملک کی حکومت کو سبق سکھانے کے لیے یہ کھل کر میدان میں آگئے۔ میڈیا، پولیس اور عدلیہ میں بھرتی کیے گئے اپنے آدمیوں کے ذریعے اردگان حکومت کو گرانے اور امریکی سفیر کی پیش گوئی پوری کرنے کے لیے کسی قسم کا تکلف یا حجاب کیے بغیر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ سامنے اردگان جیسا مضبوط اعصاب کا مالک تھا جس نے نہ صرف فراست و شجاعت سے ان کا سامنا کیا، بلکہ جواباً کھل کر کہہ دیا کہ یہ تحریک سی آئی اے اور موساد کے سرمائے سے چل رہی ہے تا کہ مخصوص ممالک میں اپنے سرپرستوں کو رجال کار مہیا کرے۔ نیز اس نے ان کے افسران کے تبادلے اور تعطلی کے ساتھ 15 فروری 2014ء کو پارلیمنٹ سے عدلیہ کو قابو میں کرنے کا قانون بھی منظور کروالیا تا کہ آئندہ عدلیہ میں موجود ان کے افراد قواعد سے تجاوز کر کے من مانی نہ کریں اور قانون کا سہارا لے کر لاقانونیت نہ پھیلائیں۔

بدلتی رُتوں کی داستاں

ترکی یورپ کی سرحد پر واقع ہے۔ گویا ایشیا کی جانب سے یورپ میں داخل ہونے کا پہلا اور مرکزی دروازہ ہے۔ حکومت بھی سیکولر اور پڑوس میں بھی سیکولر براعظم۔ گویا نیم پر چڑھے کریلے جیسے معاشرے میں اسلام پسندوں نے جو بے مثال کامیابیاں حاصل کیں، اس کی وجوہات کا جائزہ لینا ان تمام دینی شخصیات اور اداروں وتحریکوں کے لیے ضروری ہے جو روئے زمین پر کسی بھی اپنی دینی جگہ احیائے دین اور غلبۂ اسلام کی محنت کر رہے ہیں۔ ترکی کے اسلام پسندوں نے اپنے ملک کو دینی اعتبار سے رفتہ رفتہ بہتری کی طرف لے جا رہے ہیں، اس کے ساتھ انہوں نے دنیا بھر کے غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں کی فلاح ونصرت کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے اور دنیاوی اعتبار سے دنیا اپنے ملک کو دنیا کی دس بڑی معاشی طاقتوں میں سے ایک بنانے کے ساتھ یوری یونین کو بھر ملا کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں آپ کا رُکن بننے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو ہمیں اپنا اہم رکن بنانے کی ضرورت ہے۔

چند برس پہلے سیکولر طبقے کے ہاتھوں تباہ شدہ ملک پر صرف آئی ایم ایف کے 23 ارب ڈالر کا قرض واجب الادا تھا۔ چند ہفتے قبل ترکی نے نہ صرف اس کی آخری قسط (412 ملین ڈالر) چکا دی ہے، بلکہ اس کے خزانے میں اس وقت 125 ارب ڈالر جمع ہیں۔ یہ سب کچھ

کیسے ممکن ہوا؟ سچ یہ ہے کہ یہ کسی ایک شخصیت یا ایک تحریک کا کارنامہ نہیں۔ چند ایک عناصر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی حکمت وتدبر اور محنت وفراست سے ترکی کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ ایک دوسرے کے احترام اور رواداری کے ساتھ اس طرح کی مختلف انداز سے محنت جو بھی کرے گا اس کے نتائج ان شاء اللہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

(1) رجوع الی الخیر کی تحریک اٹھانے میں سب سے پہلے تو ترکی کے صوفیاء اور خانقاہوں کا نام آتا ہے۔ خصوصاً مجدد وقت حضرت محمود آفندی نقشبندی دامت برکاتہم کا۔ انہوں نے اس وقت روشنی کا چراغ جلایا جب ہرسُو اندھیرے کا راج تھا اور انتہائی نامساعد حالات میں صفر سے شروع کیے گئے کام کو ماشاء اللہ اس پیمانے تک لے گئے کہ ان کے خلفاء، مریدین جگہ جگہ ’’اللہ ھو‘‘ کی صداؤں کے ذریعے دلوں کو بدلنے اور ان میں سے غیر اللہ کو نکالنے کی محنت میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ترکی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے عوام کو بے دینی کے چنگل سے نکال کر دینداری کی راہ پر ڈالا اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کے بنیادی نظریے اور اساسی افکار کا رُخ ایک مرتبہ دین کی طرف ہو جائے تو اس کے کردار و کارگزاری کا پرنالہ بالآخر اس جھیل میں گرتا ہے جہاں خیر کے سب چشمے آکر جمع ہوتے ہیں۔

(2) تصوف کے بعد سیاست کو لے لیجیے۔ پروفیسر نجم الدین اربکان کی ’’رفاہ پارٹی‘‘ نے اس وقت اسلام پسندوں کی طرف سے اس میدان کارزار میں پہلا قدم رکھا، جب سیاست کو دینداروں کے لیے شجرِ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ انتہائی ناموافق حالات میں یہ شخص علماء ومشائخ کے پاس جاتا۔ ان سے دعاؤں اور توجہ کی درخواست کرتا۔ اسکول، کالج کے طلبہ سے لے کر تاجروں اور ملازمت پیشہ لوگوں سے بھی رابطوں میں رہتا۔ کرتے کرتے ترکی کے سیاسی افق پر اسلام پسندوں کے ستارے بھی جگمگانے لگے۔ آج فلسطین کے مظلوم مسلمان ترکی کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں تو اس کا بڑا سبب استاد اربکان کا لگایا ہوا وہ پودا

ہے جس نے رجب طیب جیسے ذہین اور صاحب دل حکمران پیدا کیے۔ جنھوں نے ترکی کو فلاح وترقی کے راستے پر ڈال کر عالمی معاشی غارت گری سے نجات دلوانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی اور دنیا بھر کے مظلوموں کی حمایت کو بھی اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔

(3) تیسرے درجے پر ترکی کے ان فلاحی اداروں کا نام نمبر آتا ہے جن کے خلوص اور بے لوث خدمت پر اس وقت پوری دنیا کے مفلوک الحال مسلمان اور غریب انسان رشک کر سکتے ہیں۔ آئی ایم ایچ یعنی ''انسانی حق وحریت'' کے نام سے اس وقت جو فلاہی ادارہ دنیا کے مختلف غریب اور پسماندہ ممالک میں مثالی رفاہی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کی بنیاد استاد نجم الدین اربکان، وزیراعظم طیب اردگان اور آئی ایم ایچ کے موجودہ صدر بلند یلدرم نے مل کر جرمنی میں رکھی تھی۔ یہ وہی ادارہ ہے جس نے پاکستان کے زلزلہ اور سیلاب میں تمام بیرونی این جی اوز سے زیادہ قابل قدر اور معیاری خدمات انجام دیں اور ان حادثات کا ریلا گزر جانے کے بعد بھی وہاں طویل المیعاد تعلیمی ورفاہی منصوبے چلا رہا ہے۔

ترکی کی ان معیاری اور سلیقے سے انجام دی جانے والی خدمات کی بدولت ترکی حکومت اور ترکی عوام دنیا بھر کی دعائیں اور محبتیں سمیٹی ہیں۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی نیک تمناؤں اور غائبانہ تشکرات کی بدولت ترکی کی ساکھ کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ [اسلام آباد میں ''خبیب فاؤنڈیشن'' کے نام سے قائم کردہ رفاہی ادارہ انہی کے توسط سے پاکستان میں تعلیم اور فلاح عامہ کے مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی پیش کر رہا ہے۔] اس ادارے کے ماتحت یتیم بچوں کے لیے قائم ہری پور اور مانسہرہ جیسے شہروں میں بلا معاوضہ وہ تعلیمی اور رہائشی سہولتیں دی جاتی ہیں جو کسی اعتبار سے کیڈٹ کالج کے طلبہ کو بھاری بھر کم اجرتیں دینے کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ یہ تعلیمی اور رفاہی ادارے سے بیرون ملک ترکی کے سفارتخانے ہیں جو اس کے لیے محبتیں کماتے اور فاصلے سمیٹتے ہیں۔

(4) ایک چیز جس نے اسلام پسندوں کی حکومت کے لیے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ اور فکری موافقت رکھنے والے رجال کار مہیا کیے اور سیکولر شاہی کی بلیک میلنگ سے نجات دلوائی، وہ ہاسٹل والے لوگ ہیں۔ یہ سلسلہ زیادہ تر شیخ بدیع الزماں نورسی والوں نے قائم کیا۔ انہوں نے ترکی کے بڑے شہروں میں چھوٹے شہروں سے آنے والے اسکول، کالج کے طلبہ کے لیے ہاسٹل قائم کیے۔ یہاں رہائش اور خوراک کی ایسی سہولتیں طلبہ کو دی جاتی ہیں کہ پانچ ستارے والے ہوٹل میں بھی کیا ہوتی ہوں گی؟ راقم اگر خود اس صفائی و نظافت اور معیار وسلیقے کا مشاہدہ نہ کرتا جو ان ہاسٹلز میں عام طلبہ کو دی جارہی ہیں تو ضرور اسے مبالغہ سمجھتا، لیکن مشاہدے کے بعد یہ سب کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور ہے جو بچشم خود دیکھی اور محسوس کی۔

ان طلبہ میں غیر محسوس طریقے سے ایسے تربیت یافتہ طلبہ کو شامل کر دیا جاتا تھا جو نئے طلبہ کا اکرام اور حسنِ اخلاق کی بنیاد پر تعلقات بڑھاتے اور راہ و رسم قائم کر کے ان کے اچھے مستقبل کے لیے ان سے تعاون کرتے ہیں۔ نماز کا وقت آجانے پر انہیں براہِ راست نماز کی دعوت دینے کے بجائے ان کے سامنے اہتمام اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے اور انہیں یہ تأثر دیتے ہیں کہ انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے اپنی سی کوشش کے ساتھ مذہبی عبادات بھی ضروری ہیں۔ آہستہ آہستہ نئے طلبہ دین کی طرف راغب ہو جاتے اور پھر جب پکا دینی ذہن لے کر یہاں سے نکلتے تو ترقی کر کے جہاں بھی پہنچتے، اس محتاط انداز میں دین کی تبلیغ کرتے اور ماتحتوں کو دین سے جوڑتے۔ موجودہ حکومتی قیادت اور اس کا ساتھ دینے والی مشینری اسی طرح کے ہاسٹلز سے تربیت پا کر نکلتی ہے۔

اس نظام میں ڈھل کر نکلنے والے یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جاگیردارانہ ذہنیت اور وڈیرہ پن والا مزاج ان میں نہ تھا۔ مشقت اور تربیت کی بھٹی سے گزرنے کے بعد یہ کندن بن گئے اور اسلام پسندوں کی حکومت کے لیے ایسے ستون اور

ان کی حکومتی مشینری کے لیے ایسے کل پرزے ثابت ہوئے جنھوں نے ایسے وقت میں اپنے محسنین کا خاموش اور بھرپور ساتھ دیا جب سیکولر فوج، سیکولر طبقے اور عالمی طاغوتی طاقتیں اسلام پسندوں کی حکومت کی جان کو آچکی تھیں۔ حکومتی مشینری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اور عوامی زندگی میں بلند سماجی حیثیت رکھنے والے یہ افراد صرف اپنے ملک اور اپنی پسندیدہ حکومت کا ہی درد نہیں رکھتے بلکہ ان کے دل میں پوری اُمت سے ہمدردی اور ان کے اہداف میں پوری امت کی خیر خواہی شامل ہے۔ ہاسٹل کی شکل میں ترکی کے اسلام پسندوں کی یہ اختراعی ایجاد ان کے لیے معاشرے میں ہر طرح کے کارآمد لوگ اور نظریاتی کارکن مہیا کرتی ہے جو انہیں بہت سے غموں سے نجات دلا دیتے ہیں۔

(5) ایک اہم عنصر ''پھولوں کا ٹیلہ'' اور ''چاند کی روشنی'' جیسے نام رکھنے والی بیٹھکیں ہیں۔ احقر ان کا تفصیلی تذکرہ کر چکا ہے کہ یہ کس طرح گلی محلے کی سطح پر بچوں، نوجوانوں اور ادھیڑ عمر مرد و خواتین کی باتوں باتوں میں ذہن سازی کرتے اور انہیں اجتماعی دھارے سے جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ عوامی سطح پر ذہن سازی میں ایسی بیٹھکوں اور اوطاقوں نے تاریخی کردار ادا کیا ہے اور یہاں تعلیم و تربیت کے علاوہ معاشی و سماجی مسائل کے حل اور باہمی تعاون کے تناظر میں جس طرح عالمی سوچ اور اجتماعی فکر دی جاتی ہے وہ قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔

(6) ایک کامیاب کوشش ان نامعلوم کارکنوں کی ہے جو غبارے بیچتے بیچتے سر پر عزت کی ٹوپی اور ہاتھ میں بہادری کی تلوار تھما دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار کارکن ترکی میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اپنے اپنے انداز میں غیر محسوس طریقے پر اسلامی شعائر کی اہمیت دلوں میں بٹھانے اور دینی جذبات پروان چڑھانے کی محنت اسی طور سے جاری رکھے ہوئے ہیں کہ ان کے رب کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں۔ اس طرح کے لوگوں میں سے ایک کا ذکر جو اتفاقاً

ہماری نظر میں آ گئے، ٹوپی اور ''تلوار'' نامی مضمون میں آ چکا ہے۔

(7) اس فہرست میں آخر میں ان لوگوں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو خطاطی کے نمونوں اور اسلامی کتبوں اور طغروں کے ذریعے اسلامی ثقافت کو اُجاگر کر رہے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خطاطی، پھر پتھر، لکڑی، چمڑے، کپڑے وغیرہ پر انتہائی نفاست سے اس کی نقش کاری جہاں سجتی ہے وہاں دیکھنے والے کی نظر ایک مرتبہ ضرور کھینچ لیتی ہے اور یہ نظر ہی ہوتی ہے جو انسان کی زندگی بدلنے اور اسے کہیں سے کہیں جا پہنچانے میں کبھی کبھار اس انداز سے اثر انداز ہوتی ہے کہ ساری عمر کی تفصیلی تبلیغ بھی ویسا نہیں کر سکتی۔

ممکن ہے اور بھی ایسے عناصر ہوں جن کا برادر مسلم ملک کا معاشرہ تبدیل کرنے اور انقلابی سوچ پروان چڑھانے میں کردار ہو، لیکن ہر مسافر یا مشاہدہ کرنے والا اس چیز کو دیانت داری سے بیان کرنے کا پابند ہوتا ہے جو اس کے سامنے آئی۔ لہٰذا مجھے کسی کی خدمات کے اعتراف سے انکار نہیں، البتہ جو کچھ سامنے آیا، کوشش کی ہے کہ ان صاحب دل اور صاحبِ ذوق قارئین تک پہنچا دیا جائے جو مسلمانوں اور نظریاتی تحریکوں کی کامیابی کے اسباب جاننے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ حکیم لقمان علیہ السلام اور امام غزالیؒ کا طرزِ اصلاح یہ ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کو دیکھا جائے اور اپنی خامیوں کا احتساب کیا جائے تو زوال کی گھٹا چھٹ سکتی ہے اور عروج کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

عجوبے کا ظہور

☆

دوسروں کی کامیابی اور اپنی ناکامی میں سبق چھپا ہوتا ہے۔ ہمیں موجودہ معرکے سے سبق لینا چاہیے۔ جو یہ سبق پڑھ لے وہ ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کرسکتا ہے۔

☆

ترکی میں عجوبے کا ظہور ہوگیا ہے۔ اُمت مسلمہ ایک گھاؤ لگنے سے بچ کر ہلکی پھلکی مسکراہٹ کی حق دار ہوگئی ہے۔ ترک اسلام پسندوں اور ان کے سربراہ نے جہاں فراست اور شجاعت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو مسلم حکمرانوں میں دور دور نظر نہیں آتا، وہیں ترک عوام نے بھی حیرت انگیز طور پر سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور سیکولر قوم پرستوں کی جھوٹی منافقانہ سیاست کو قطعاً مسترد کردیا۔ پاکستانی قائدین اور عوام کے لیے اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ موجود ہے، اگر ہم بند آنکھوں سے لکیر پیٹنے کے بجائے کھلی آنکھوں سے کچھ سیکھنا چاہیں۔ جتنی مشکلات زیادہ تھیں، اسلام پسندوں نے اسی حساب سے غیر معمولی نتائج حاصل کیے اور عجوبہ در عجوبہ کی شکل میں ملت کو تحفہ دیا۔ آیئے! رکاوٹوں اور کامیابیوں کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں۔

صورتحال یہ تھی کہ اپنے پرائے سب ایک کمان بن کر اردگان اور اس کے اسلام پسند ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نام نہاد دائیں بازو نے بائیں بازو کے ساتھ متحد ہو کر بے ہودہ الزامات اور افواہ سازی کے ایسے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جن کے بارے میں مہذب معاشرے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ دشمنی میں اندھے ہو کر تہذیب کی حد پار کر جانے والے اس بھان متی کے کنبہ نما اتحاد میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے اور سامنے اکیلا اردگان اور اس کے نظریاتی ساتھی تھے۔ اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو دشمن کے دعوے درست ثابت ہو جاتے۔ یہ دعوے اور پیش گوئیاں کچھ اس طرح تھیں: ’’اسلام پسندوں کو ان بلدیاتی انتخابات میں شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ 36 فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل نہ کرسکیں گے۔ نتیجتاً ان کی پارٹی میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جائے گی۔ 75 ارکان اسمبلی مستعفی ہونے پر مجبور ہوں گے۔‘‘ غرض کہ وہ تمام باتیں جو ہمارے ہاں کی جاتی ہیں، وہاں بھی کی گئیں، لیکن اسلام پسندوں کی جہد مسلسل، حکمت و جرأت، اور وظائف و دعاؤں کی بنا پر غلط ثابت ہو گئیں۔

مخالفین میں سب سے پہلے اسرائیل، اس کی بدنام زمانہ خفیہ تنظیم موساد اور اس کی ہمنوا و ہم منصب امریکی تنظیم تھی۔ اس کے بعد مشہور سکالر جناب فتح اللہ گولن صاحب جوان بیرونی قوتوں کے مقاصد کو پورا کرنے میں اس قدر آگے چلے گئے کہ ان سیکولروں سے کھلا اتحاد کر لیا جنہوں نے ان کے استاذ محترم بدیع الزمان نورسی صاحب کو بدترین ظلم وستم کا شکار بنانے کے بعد ان کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ ان کے جنازے میں کسی کو شریک نہ ہونے دیا تھا اور کسی ایسے نامعلوم مقام پر خفیہ تدفین کی تھی کہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ان کی قبر کہاں ہے؟ امریکا و اسرائیل کے علاوہ چند یورپی ممالک بھی دینی رہنماؤں اور سیکولر لیڈروں کے اس غیر فطری اتحاد کی پشت پر تھے جنہیں ترکی کی معیشت اور مصنوعات کی وجہ سے اپنی معیشت اور مصنوعات کو خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ چند عرب ممالک بھی اردگان کی اس شہرت

سے خائف تھے جو اس نے غزہ کے محصورین کے لیے امداد بھیج کر اور پھر اسرائیل کے جارحانہ حملے میں ترک شہیدوں کا ہرجانہ وصول کر کے حاصل کی تھی۔ اس تاریخی واقعے میں اسرائیل کو معافی مانگنی پڑی اور امریکی صدر کو اس ہرجانہ کی ادائیگی کی ضمانت دینی پڑی تھی۔ یہ اسلامی ممالک بھی برادرانِ یوسف کا کردار ادا کرتے ہوئے اردگان کے مخالفین کو ہلا شیری دینے میں مصروف تھے اور مصر کے اخوان کے ساتھ کیے گئے سلوک کو دہرانا چاہتے تھے۔

ان سب نے مل کر موجودہ دنیا کی منافقانہ پروپیگنڈہ ساز سیاست کا بدترین مظاہرہ کیا۔ اردگان کی اپنے وزراء اور اہل خانہ سے بات چیت کو خفیہ ریکارڈ کیا گیا۔ اس میں کانٹ چھانٹ کر کے حسبِ منشا مفہوم بنا کر عوام میں پھیلایا گیا۔ اردگان کے خفیہ ادارہ نے ریکارڈنگ کے آلات کے پیچھے چھپے مرکز معلومات کا سراغ لگایا تو وہ باسفورس کے کنارے ایک ''وِلا'' نکلا۔ اس مہنگے محل میں نصب جاسوسی کے آلات کا تعلق امریکا اور برطانیہ میں موجود سراغ رسانی کے مرکز سے تھا۔ وہاں سے حسبِ ضرورت کاٹ پیٹ کر کے یہ کلپ گولن صاحب اور ان کے پیروکاروں کو فراہم کیے جا رہے تھے۔ ان کے بل بوتے پر گولن صاحب کا ''ہزمت'' یعنی خدمت گروپ سیکولروں سے دشمنی بھلا کر اسلام پسندوں کی پشت میں چھرا گھونپنے میں مصروف تھا۔

اس سب کچھ کے باوجود اردگان نے اپنی مسلسل خدمت، دیانت دارانہ سیاست اور جرأت کے ساتھ مخالفین پر جوابی، لیکن اخلاقی یلغار کا ایسا مظاہرہ کیا کہ کہا جا رہا ہے اس وقت دنیا میں اس جیسا حکمران نہیں جس نے 12 سال تک چار مرتبہ حکومت حاصل کی ہو۔ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہوں۔ پانچویں بار کے لیے اس نے کھل کر اعلان کیا ہے وہ ان شاء اللہ 60 فیصد نمائندگی حاصل کر کے رہے گا۔ کامیابی کا تناسب حیرت انگیز ہے۔ اردگان نے بپھرے شیر کی طرح جوابی مہم چلائی اور نہ صرف یہ کہ ان تمام شہروں میں

اپنی برتری کو برقرار رکھا اور بہتر بنایا جو اس کے ہم فکر ساتھیوں کے پاس تھے، بلکہ انطا کیہ اور چند ایک دوسرے شہر جو 2009ء میں پیپلز پارٹی [یعنی ترکی کی پیپلز پارٹی] کے پاس چلے گئے تھے، ان پر بھی دوبارہ گرفت حاصل کر لی۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو 36 فیصد کے بجائے 45 فیصد ووٹ پڑے اور انہوں نے مخالفین کے برپا کردہ طوفان بدتمیزی کا رُخ موڑنے کے ساتھ کامیابیوں کا نیا ریکارڈ قائم کر کے تاریخ کا رُخ بھی موڑ کر رکھ دیا۔ اس موقع پر ترکی کے تین بڑے شہروں میں برپا ہونے والے معرکے کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انقرہ ترکی کا دارالحکومت، استنبول بڑا شہر اور ازمیر تاریخی اور تفریحی شہر ہے۔

انقرہ میں اسلام پسندوں کا ناظم شہر ابراہیم ملیح کیوکچک تھا۔ یہ شخص 1994ء، 1991ء اور 2001ء، 2009ء میں چار مرتبہ مسلسل ناظم کا انتخاب جیت کر ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔ اس کی یہ جیت اردگان کی نظامت کے زمانے کی طرح صرف اور صرف اہل شہر کی خدمت اور ناقابل یقین ترقی پر مشتمل منصوبوں کی بنا پر تھی۔ سیکولروں نے اس مرتبہ ان کے مقابلے میں گولن صاحب سے دائیں بازو کا ایک ''کلہاڑی دستہ'' منصور یاوہ مستعار لے کر کھڑا کیا، تاکہ دائیں بازو والوں کے ووٹ تقسیم ہو سکیں۔ اسے اس بُری طرح شکست ہوئی کہ منہ چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی۔

استنبول میں اردگان کا قدیمی ساتھی قادر توپ باش دو مرتبہ ناظم رہ کر اپنی بہترین عوامی خدمت کی بنا پر تیسری مرتبہ مضبوط اُمیدوار تھا۔ اس کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کا موجودہ چیئرمین تھا، جسے گولن صاحب کی حمایت کھل کر حاصل تھی۔ نتیجہ وہی ہوا۔ دونوں مل کر تا ترک کے سیکولر نظریات کا ڈھول پیٹتے رہے، اردگان حکومت پر الزام تراشی کرتے رہے اور استنبول کے عوام نے اسے اپنا خادم و ناظم منتخب کیا جو دو مرتبہ خود کو اس کا اہل ثابت کر چکا تھا۔

ازمیر میں صورتحال سب سے زیادہ دلچسپ تھی۔ یہ شہر سیکولروں کا گڑھ سمجھا جاتا

تھا۔ اسے کسی زمانے میں ترکی کا پیرس کہتے تھے، لیکن یہ سیکولروں کی بدعنوان سیاست کے ہاتھوں تیسری دنیا کی شہروں کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ اردگان نے اپنے ایک قریبی ساتھی بن علی یلدرم کو یہاں کھڑا کیا جو اپنے اختراعی منصوبوں کی بنا پر خدمت اور ترقی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ پھر عوام سے کہا: ''اب جو چاہو خود منتخب کرلو۔ یا تو ترکی کے دوسرے شہروں کی طرح جہاں کی سہولیات زندگی ہم نے یورپ کے معیار تک لے آئی ہیں، ان کو حاصل کرلو یا اسی طرح پسماندہ رہو جیسے تمہیں لادین اور بدعنوان حکمرانوں نے آج تک بنا رکھا ہے۔'' عوام نے اردگان کے وعدے پر اعتبار کیا اور اپنا پورا وزن اس کے پلڑے میں ڈال دیا۔

بلدیاتی انتخابی مہم کے دوران اردگان کی تقریر میں جذبات کا طوفان بھی ہوتا تھا اور دلیل کی قوت بھی۔ وہ عوام کے سامنے واضح کرتا تھا کہ ترکی دنیا کے 10 بڑی معاشی طاقتوں میں کس کی جدوجہد کی بنا پر شامل ہوا؟ سیکولروں کے دور میں بدعنوانی کا دور دورہ تھا۔ فی کس سالانہ آمدنی ڈھائی ہزار ڈالر تھی جو اب ساڑھے دس ہزار سالانہ سے متجاوز ہوچکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ پر اس غیر معمولی عزم و یقین کا مظاہرہ کرتا تھا جو اس کی اصل طاقت ہے۔ حتیٰ کہ انتخابات سے پہلے استنبول کے آخری جلسے میں...... جس میں ریکارڈ تعداد کے مطابق تقریباً 20 لاکھ افراد شریک ہوئے...... اس نے ترکی کے عظیم شاعر ''ضیاء غوک اللب'' کے وہی اشعار پڑھے جن کو پڑھنے کی بنا پر اسے چند سال قبل نام نہاد سیکولر قانون کے تحت دو سال کی سزا ہوئی تھی۔ محض چند سالوں میں جہد مسلسل سے دنیا بدل چکی تھی۔ جگہ بھی وہی تھی، شعر بھی وہی اور شعر خواں بھی وہی۔ اردگان نے جذبات کی طوفان برپا کرتے ہوئے ایمانی کیفیت سے بھرپور یہ اشعار دوبارہ پڑھے اور دنیا کو پیغام دیا کہ ہماری اصل طاقت اپنے ربّ پر ایمان کی ہے۔ اشعار کا ترجمہ کچھ یوں ہے: ''مسجدوں کے مینار ہمارے نیزے ہیں۔ مسجدوں کے گنبد ہماری آہنی ٹوپیاں ہیں۔ مسجدیں ہماری چھاؤنیاں ہیں۔ اہلِ

ایمان ہمارے لشکر ہیں۔ ہمارے ایمان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔'' اس مرتبہ اس کو سزا کیا ہوتی؟ استنبول کا 20 لاکھ کا مجمع اس کے ساتھ مل کر یہی اشعار دہرا رہا تھا اور دنیا کو بتا رہا تھا کہ دیانت و خدمت جس حکمران کا شعار ہو، اسے خداداد کامیابی اور مقبولیت سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ہم میں سے جو لوگ ترکی جاتے اور تفریحی مقامات میں بے پردگی دیکھ کر اسلام پسندوں کی محتاط اور مجبور سکڑی سمٹی پیش رفت کو نہیں سمجھتے، انہیں کچھوے کی چال اور خرگوش کے خواب میں فرق کرنا چاہیے۔ جو لوگ وہاں کے سیکولروں کی بنائی ہوئی بے ہودہ فلموں کو درآمد کر کے ماضی کے داغ دھونے کے بجائے لادینوں کے ہاتھ مضبوط کرتے اور غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ ان ڈاکومنٹریز کو درآمد کریں جو وہاں کے اسلام پسندوں نے مشہور مسلم قائدین اور سپہ سالاروں کے حوالے سے بنائی ہیں۔

دوسروں کی کامیابی اور اپنی ناکامی میں سبق چھپا ہوتا ہے۔ ہمیں موجودہ معرکے سے سبق لینا چاہیے۔ جو یہ سبق پڑھ لے وہ ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ جو نہ پڑھ سکے، اس کی کامیابی اگلے معرکے کی ناکامی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

انتہا پسندی کی ایک مثال

زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے انسان کو ہنسی آتے آتے رُک جاتی ہے، یا وہ جواب دیتے دیتے خاموشی بہتر سمجھتا ہے۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہم نے اس وقت محسوس کی جب ''اسلام پسند اتاترک'' نامی کالم پڑھا۔ ہمارے ایک محترم قلم کار نے جو انقرہ سے ترکی پر کالم لکھتے ہیں، ''اسلام پسند اتاترک'' کے نام سے کالم لکھ کر صحافت کے طلبہ کے لیے ایک مثال پیش کی ہے۔ قلم کار چاہے تو دن کو رات اور سیاہ کو سفید کہنے کا محاورہ یوں سچ کر دکھاتا ہے کہ ساری دنیا کے عقلمند مل کر بھی ایسا غیر معقول شاہکار نہ گھڑ سکیں۔ انہوں نے پہلے سیکولرازم کی تعریف کی ہے۔ پھر اس کی رو سے اتاترک کو اسلام پسند بھی قرار دیا ہے۔ گھٹنا مارنے سے آنکھ پھوٹے یا ہرن کے پاؤں میں تیر لگے اور سر سے جا نکلے، اس پر اتنا تعجب نہیں، جتنا کسی ایک کو سیکولر مان کر اسے اسلام پسند تسلیم کروانے پر ہے۔ بھلا بتایئے! ہنسی آتے آتے کیوں نہ رُکے گی؟ اتاترک کو اسلام پسند ماننے سے بہتر ہے خود کو عقل کا دُشمن قرار دے لیا جائے، پھر جو چاہے انسان کرتا پھرے۔

آیئے! پہلے سیکولرازم کی تعریف جو خود اسی کالم میں درج ہے، پر نظر ڈالتے ہیں۔ پھر اس کی روشنی میں اتاترک کا سیکولر قد کاٹھ اور اس میں اسلام پسندی کا عنصر آسانی سے

دریافت کیا جاسکے گا۔ ’’ہمارے مذہبی حلقوں نے سیکولرازم کو کافرانہ نظام قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت شروع کردی، حالانکہ سیکولرازم کافرانہ نظام نہیں ہے، بلکہ مذہبی حلقے جان بوجھ کر سیکولرازم کا ترجمہ لادین (جس کا کوئی دین نہ ہو) کرتے رہے ہیں، جبکہ سیکولرازم کی صحیح تعریف کچھ یوں ہے: ’’تمام مذاہب کے ساتھ رواداری، غیر جانبداری اور ملکی نظم ونسق، سماجی، تعلیمی اور سیاسی معاملات میں تمام مذاہب کے اور فرقوں کو مملکت کی نظر میں مساوی حیثیت دینے ہی کا نام سیکولرازم ہے۔‘‘ اتاترک کے وہ کارنامے جن کی بنا پر بجا طور پر اسے ’’اسلام پسند‘‘ کہا جاسکتا ہے اور ایسا کہتے ہوئے زبان ذرا بھی نہیں لڑکھڑاتی، درج ذیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے سیکولرازم تمام مذاہب کے ساتھ جس رواداری، غیر جانبداری اور تمام مذاہب کو ملک میں جو مساوی حیثیت دینے کا قائل ہے۔ وہ کس قدر دل فریب بات ہے۔

اتاترک نے اقتدار کا ہُما سر پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا جو کام کیا وہ مساجد اور مدارس پر پابندی تھی۔ کئی سوسالہ قدیم تاریخی مساجد اور مدارس پر تالے ڈال کر نماز حرام اور دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی...... عربی زبان میں اذان اور نماز پر مکمل پابندی عائد کردی گئی۔ اتاترک کی وفات کے بعد جب اسلام پسند عدنان میندریس نے اس پابندی کو ایک قرارداد کے ذریعے منسوخ کر کے تمام صوبوں میں یہ پیغام بھجوا دیا کہ مسلمان عربی میں اذان اور تکبیر کہہ سکتے ہیں تو وہ ترکی کی تاریخ میں جشن کا دن تھا۔ مؤذنین اذانیں دیتے ہوئے ہچکیاں لے کر روتے ہوئے پائے گئے۔ بعض مساجد میں کئی سالوں تک دو اذانیں دی جاتی رہیں۔ ایک ادا اور ایک قضا...... حج وعمرے کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔ اس پر پابندی ختم کرتے کرتے ’’عدنان میندریس‘‘ جیسے صدر کو بھی 25 سال لگ گئے۔ 25 برس تک ترک سرزمین پر سوئے حرم جاتے ہوئے ایک لبیک نہ کہنے کا ثواب اتاترک کے ساتھ ان تمام قلم کاروں کو بھی پہنچ رہا ہے جو اسے اسلام پسند قرار دیتے ہوئے دادِ تحقیق چاہتے

ہیں۔ گذشتہ سال عبداللہ گل وہ پہلا ترک حکمران تھا جو 70 سال بعد حج کے لیے جا سکا۔ اس پر بھی سعودیہ میں ترکی سفیر نے وضاحت ضروری سمجھی کہ ترک رہنما کے حج کے لیے آنے کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ ترکی سیکولر ملک نہیں ہے۔ ترکی کا قانون سیکولر ہے اور فوج اس قانون کی محافظ ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں صرف ترکی کو حاصل یہ امتیاز اتاترک کی اسلام پسندی کا تحفہ ہے۔ اسلام پر مر مٹنے کا یہ رویہ تو شعائر اسلام کے ساتھ تھا۔ اب اسلامی اصطلاحات وعلامات کی طرف آیئے۔

مردوں کے لیے ڈاڑھی، ٹوپی اور خواتین کے لیے حجاب کو قابلِ دست اندازی پولیس جرائم قرار دیے گئے۔ اس فرمان میں جو رواداری اور غیر جانبداری کی روح کارفرما ہے، وہ ہر سیکولرازم کے دعوائے مساوات کو شرمانے کے لیے کافی ہے...... ایک بڑا کارنامہ جس کا ذکر ہمارے ممدوح کالم نگار نے بڑی شد و مد سے کیا ہے، یہ کہ مذہبی امور کا محکمہ قائم کیا گیا۔ اس محکمے کا کام یہ تھا مذہب پسند لوگوں کی کڑی نگرانی کرے۔ اگر کسی کی جیب سے کوئی عربی دعا یا اوقاتِ صلوٰۃ کا نقشہ نہیں، صرف اسلامی قمری تقویم نکل آئے تو اسے قید و بند کی ان صعوبتوں سے گذارا جائے جو اسے آیندہ اس حرکت سے سختی سے باز رکھ سکیں...... ایک ہمیشہ کے لیے سیئہ جاریہ بن جانے والا کارنامہ جسے ترک قوم پرست بھی ترک سیکولروں کے ماتھے کا داغ قرار دیتے ہیں۔ یہ تھا کہ ترکی زبان سے عربی الفاظ ختم کر کے متبادل الفاظ شامل کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی۔ جس کی سفارشات پر عمل ہر فرد کے لیے لازم تھا۔ جب ملکی تعلیم میں تمام مذاہب سے یکسا سلوک کا یہ عمل مکمل ہوا تو اگلے اقدام کے طور پر ترکی زبان جو عربی، فارسی، اردو رسم الخط کے طور پر دائیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھی۔ اس کو بائیں ہاتھ سے انگریزی حروف میں رومن طرز پر لکھنے کا لازمی حکم دے کر اسے بالجبر نافذ کروایا گیا۔ کسی فرقے کو کسی پر برتری نہ دینے کی اس شاندار مثال نے ترکی کی تمام نئی نسل کو ترک تاریخ

، ترک ادب اور ترک تہذیب سے کاٹ ڈالا۔ وہ آج تک اپنے قابلِ فخر ماضی سے کٹی ہوئی ہے۔ اس کا جمہوریت کی پرستش کرنا اور اسلامی خلافت وسلطنت سے پوری دنیا کو محروم کرنا شاید وہ خوبی ہے جس کی بنا پر سیکولرازم کے گن گانے والے قلم کار اور ان کی سر پرست اور ''برادری'' اسے پہلے اتاترک (بابائے ترک) کہلواتی تھی۔ اب ''اسلام پسند اتاترک'' کہلواتی ہے۔

محترم کالم نگار نے لکھا ہے: ''اتاترک کی مذہبِ اسلام اور قرآن کریم سے محبت کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے: ''قرآن کریم کی تلاوت سن کر طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے جسم میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔'' لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کیا قرآن کریم سے یہ وہ محبت تھی جس کی بنا پر اتاترک نے مصحف شریف کو (نعوذ باللہ) شیخ الاسلام کے سر پر اس وقت دے مارا جب وہ اس سے ان اقدامات پر بات کرنے آئے تھے جو مذہب کی یکسر نفی کے مترادف تھے۔ قرآن کریم سے محبت اس کی تلاوت سے نئی روح حاصل کرنا اور قرآن کی طباعت پر پابندی کے ساتھ اس کی زبان سے اس قدر بیزاری کہ اس کی زبان والے الفاظ کو چن چن کر ترکی سے نکال دیا جائے، تاکہ ترک بچے عربی یا قرآن کریم پڑھ ہی نہ سکیں، اس اسلام پسندی کی کوئی مثال پوری روئے زمین کے سیکولر پسند مل کر بھی تلاش نہ کر سکیں گے۔

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ اتاترک انتہا پسندی کے سخت خلاف تھے۔ خدا جانے انتہا پسندی کا مطلب کیا ہے؟ اسلامی احکامات، اسلامی اصطلاحات، اسلامی علامات کے بعد اتاترک نے ہر اس چیز کو مٹانے کی کوشش کی جس پر مذہب کا کوئی عکس بھی پڑتا تھا۔ وہ دارالحکومت کو استنبول سے...... جو مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے...... منتقل کر کے انقرہ لے گیا۔ وہاں مساجد کی تعمیر پر پابندی لگادی۔ یہ انتہا پسندی نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ تاریخ کے کس

کس حرف کو جھٹلائیں گے؟ لطف تو تب آیا جب اتاترک کی وفات کے بعد اس کی قبر کے عین سامنے ''عدنان مینڈریس'' نے نئی مسجد تعمیر کر کے کفارہ دینے کی کوشش کی۔ بہر حال! کئی بے مثل کارنامے ایسے ہیں جو اس کی متانت، اعتدال پسندی، رواداری، حب الوطنی کے سارے بھرم کھول دیتے ہیں۔ آپ کو اس کے ان کارناموں کے حوالے سے آخری تبصرہ پڑھ کر بہت مایوسی ہوگی، لیکن کیا کریں کہ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ کامران رعد اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''فری مسنری اور دجال'' میں لکھتے ہیں: ''مصطفیٰ کمال اتاترک نوجوان ترک تنظیم کا لیڈر اور جدید ترک ریاست کا بانی 1923ء سے اپنی موت 1938ء تک صدر رہا۔ اتاترک ایک اطالوی لاج کا رکن Macedonia Resorta E Veritas ایک فری میسن اور ترکش لاج کا گرینڈ ماسٹر تھا۔'' (ص: 212)

اس کے ثبوت کے لیے امیر عبدالقادر جزائری جو فری مسنری کی فرانسیسی لاج کا رکن رہا تھا، کے ساتھ موازنے کی ضرورت نہیں، ''گیلری آف فیمس فری میسنز'' پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ اس میں اتاترک کا نام اس کارنامے پر درج ہے کہ اس نے اسلامی طرز حکومت ''خلافت'' کو ختم کر کے اس پر پابندی لگائی۔ خلیفۃ المسلمین کے تسلط سے فلسطین کو چھڑوا کر قوم یہود کا ناجائز تسلط ممکن بنادیا۔ نیز خلافت کے ادارے اور خلیفۃ المسلمین کے خاندان کو ایسا منتشر کیا کہ کبھی دوبارہ قائم یا یکجا نہ ہو سکیں۔ اس کی جگہ ایسا مستقل نظام نافذ کیا جو واپس اسلام یا اسلام کے واحد حکمرانی نظام کی طرف نہ جانے دے۔ اتاترک کی اسلام پسندی کی اس سے بڑی شہادت شاید تلاش نہ کی جاسکے۔ کالم کا آخری پیرا بڑا دلچسپ ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''اتاترک نے 7 فروری 1923ء میں پاشا جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے اسلام کو دنیا کا مثالی مذہب قرار دے کر تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام رقم کرلیا۔ کیا اس سے بہتر اسلام پسندی کی کوئی مثال ہو سکتی ہے؟''

اگر اسلام کو مثالی مذہب قرار دینے سے تاریخ میں اسلام پسند رہنما کے طور پر نام درج ہوسکتا ہے تو جارج برنارڈ شا کو اسلام پسند ماننے میں کیا تامل ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتا تھا کہ اسلام سب سے بہترین مذہب ہے، البتہ اسلام کا قائل ہونے کے باوجود اس نے مسلمانوں سے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اتاترک نے تو اسلام کے ہر ہر نشان سے بیزاری دکھاتے ہوئے اسے مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس دوغلے کردار کا نام سیکولرازم ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، مگر خدارا! اسے اسلام پسندی کہتے ہوئے کچھ تو خیال کریں۔ کہیں فتح اللہ گولن اور ہارون یحییٰ...... دونوں حضرات ترکی سے تعلق رکھتے ہیں...... جیسے نام نہاد اسلام پسند سیکولرسن لیں تو وہ بھی اس پر اسلام پسندی کے لفظ کی توہینِ عرفی کا دعویٰ نہ کردیں۔ نجانے حقائق سے 180 درجے منحرف اس طرح کے کالم لکھے کیوں جاتے ہیں؟ ایک بڑے اخبار کے مدیران گرامی کی نظر سے گذرنے کے باوجود بھی چھاپے کیوں جاتے ہیں؟ جس شخص کو بعض محققین ''رونمہ'' نسل کا یہودی قرار دیتے ہیں...... یہ لوگ اندر سے یہودی ہوتے ہوئے موقع کے مطابق کوئی بھی دین قبول کر لیتے تھے...... اسے خالص اسلام پسند قرار دینا اور تمام دوسرے لکھنے والوں کو غلط قرار دینا، ماضی قریب کی مسلّمہ تاریخ کو یکسر رد کر دینا، کالم نگاری کی دنیا میں کن رویّوں کو جنم دے گا؟ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ انتہا پسندی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لکھنے والے اور لکھے کو چھاپنے والے اگر اس کا خیال نہ رکھیں گے تو معاشرہ مزید انتہا پسندی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کے چند المناک ورق

خلافتِ عثمانیہ (خلافتِ راشدہ، خلافت امویّہ اور خلافتِ عباسیہ کے بعد) اسلامی تاریخ کی چوتھی بڑی خلافت تھی۔ اس میں تقریباً 642 سال از 1282ء تا 1924ء تک 37 حکمران مسند آرائے خلافت ہوئے۔ پہلے 8 حکمران سلطان تھے۔ خلیفۃ المسلمین نہ تھے۔ انہیں اسلامی سلطنت کی سربراہی کا اعزاز تو حاصل تھا، خلافت کا روحانی منصب حاصل نہ تھا۔ 9 ویں حکمران سلطان سلیم اوّل سے لے کر 36 ویں حکمران سلطان وحید الدین محمد سادس تک 30 حضرات سلطان بھی تھے اور خلیفہ بھی، کیونکہ خلافتِ عباسیہ کے آخری حکمران نے سلطان سلیم کو منصب و اعزاز خلافت کی سپردگی کے ساتھ وہ تبرکاتِ نبویہ بھی بطور سند و یادگار دے دیے تھے جو کہ خلفائے بنوعباس کے پاس نسل در نسل محفوظ چلے آرہے تھے۔ یکم نومبر 1922ء کو چونکہ مصطفیٰ کمال پاشا نے مغربی طاقتوں اور “برادری” کی ایما پر ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ذریعے سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کی قرارداد منظور کر کے خلیفہ اسلام، عثمانی سلطان محمد وحید الدین ششم کی اٹلی کی طرف ملک بدری کے احکامات جاری کر دیے تھے، اس لیے اس نامبارک دن سلطنت ختم ہوگئی، البتہ خلافت اب بھی باقی تھی۔ سلطان وحید الدین ششم کی جلاوطنی کے بعد ان کے پہلے قریبی رشتہ دار عبدالمجید آفندی کو آخری عثمانی

خلیفہ بنایا گیا، مگر 3 مارچ 1924ء کو ترکی کی قومی اسمبلی نے ایک مرتبہ پھر اسلام دشمنی اور مغرب پروروں کا ثبوت دیتے ہوئے اتاترک کی قیادت میں اسلامی خلافت کے خاتمے کا قانون بھی منظور کرلیا۔ اس طرح آخری خلیفہ جو سلطان نہ تھے، خلیفہ عبدالمجید دوم کی اپنے محل سے رخصتی اور پہلے سوئٹزرلینڈ پھر فرانس جلاوطنی کے ساتھ ہی سلطنت عثمانیہ کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا المناک سانحہ بھی پیش آ گیا۔

محقق مؤرخین اور محقق معاصرین کے مطابق ان 37 حکمرانوں میں سے آخری تین محض برائے نام حکمران تھے۔ اصل طاقت ان خفیہ قوتوں کے ہاتھ میں تھی جو سلطنت اور خلافت کے خاتمے کے درپے تھے جنہوں نے جمہوریت کے سحر میں دنیا کو گرفتار کرنا تھا۔ وہ اچھے وقت کے انتظار میں ان کو برائے نام سامنے رکھ کر باگیں اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے تاکہ ان پر کسی قسم کا الزام نہ آئے اور زوال کی تمام وجوہات خود عثمانی حکمرانوں کی طرف منسوب ہوں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے اسباب اور اتاترک جیسے دین دشمنوں کے برسرِ اقتدار آنے کے عوامل پر مختلف حضرات نے اپنے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ہم کہانی کو ذرا پیچھے جا کر 30 ویں عثمانی حکمران سلطان محمود دوم سے شروع کریں گے، کیونکہ زوال کا ظہور اگرچہ آخری تین حکمرانوں سے ہوا تھا، مگر اس کی بنیاد اسی حکمران کے والد سلطان مصطفیٰ چہارم کے حرم میں ایک خاتون کے آنے سے ہوا تھا۔ اس داستان کے دوران وہ اسباب خود بخود سامنے آتے جائیں گے جو اس المناک سانحے کا اسباب کی دنیا میں ظاہری سبب ہے اور امت کو سائبان خلافت سے محروم کر گئے۔ آخر میں ہم ان اسباب کی واضح تعیین اور ان کے خوفناک نتائج کی صاف نشاندہی بھی کریں گے۔ مقصد اس داستان اور اس کے نتائج کا یہ ہے کہ اس طرح کے اسباب پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک میں کھلے ڈلے پائے جاتے ہیں۔

کہانی بحرِظلمات کے پار واقع ایک گمنام جزیرے سے شروع ہوتی ہے۔ 1492ء میں امریکا کی دریافت کا تمغہ سجانے کے بعد 1502ء میں کرسٹوفر کولمبس نے ویسٹ انڈیز کے مشرق میں ایک جزیرہ دریافت کیا۔ ''بحرظلمات'' کے پار ''برّطلسمات'' کی تلاش میں سرگرداں یورپی کے درمیان ان نو دریافت جزائر پر قبضے کے لیے رسہ کشی جاری تھی۔ 1635ء میں اس جزیرے کو فرانسیسی حکومت نے آباد کیا، لیکن برطانوی بھی حسب روایت وہاں پہنچ گئے۔ پھر کئی برسوں تک فرانس اور برطانیہ کے درمیان آویزش کے بعد اسے فرانس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ ''مارٹینیق'' کہلاتا ہے۔ 18ویں صدی کے وسط میں یہ جزیرہ کولمبس کے ساتھ آنے والی ''برادری'' کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں وہ کیا کررہے تھے؟ ایسی دوشیزاؤں کی تربیت کررہے تھے جن سے حسب منشا کام لے سکیں۔ ''مارٹینیق'' میں 2 لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کی فتنہ خیز کارروائیوں نے دنیا بدل کر رکھ دی۔ بنی نوع انسان کے لیے ایک امتحان بن گئیں۔ ان 2 کو دو الگ الگ اہداف کی طرف بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ ایک کا ہدف مشکل تھا، دوسری کا آسان۔

ان میں سے ایک جوزفین تھی۔ یہ 1763ء میں پیدا ہوئی۔ شاہِ فرانس نپولین بونا پارٹ کی بیوی بنی۔ جوزفین کا ہدف زیادہ دُشوار نہیں تھا۔ اسے صرف فرانس پہنچنا تھا۔ پھر نپولین تک رسائی مغربی اقدار کی وجہ سے آسان تھی، البتہ اس کی کزن ''میری مارتھا'' کا کام ذرا مشکل تھا۔ اسے ترک سلطان کے حرم میں پہنچنا اور مشکوک ہوئے بغیر رہنا تھا۔ یہ کام کافی مشکل تھا۔ نہ حرم تک آسانی سے پہنچا جاسکتا تھا اور نہ اندر پہنچنے کے بعد مطلوب ہدف تک رسائی آسان تھی۔ حرم کے اردگرد چار پانچ میل تک حفاظتی اقدامات کیے جاتے تھے۔ اور یہاں متعین تندخو پہرے دار جنہیں ''بوستانجی'' (اسپیشل گارڈ) کہا جاتا تھا، سخت قسم کا پہرہ دیتے تھے۔ اس طرح غیر لوگوں کے حرم تک براہِ راست رابطے کے امکانات ختم

ہو جاتے تھے، البتہ ایک صورت ایسی تھی جو محفوظ بھی تھی اور یقینی بھی۔ یہ صورت کیا تھی؟ جو لوگ حرم کے اندر نقب لگانا چاہتے تھے، ان کا بھیجا ہوا ایک جاسوس لکھتا ہے:

''یونانی اور فرانسیسی خواتین بعض اوقات حرم میں بیگمات سے ملنے جاتی ہیں۔ ان کے شوہر سوداگروں اور ترجمانوں کے روپ میں قلیوں کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ خواتین یورپ کے نوادرات دکھانے اور فروخت کرنے کے بہانے حرم میں داخل ہوتی ہیں۔ حرم کے بارے میں درست معلومات ایسے مواقع پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ کچھ اسی طرح میں بھی یہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' (فری میسنری اور دجال از کامران رعد)

الغرض! خاطر خواہ معلومات حاصل کرنے کے بعد 1784ء کے قریب ایک خوبصورت 14 سالہ دوشیزہ استنبول میں لائی گئی۔ مختلف نسلوں کے ملاپ نے اسے طلسماتی حسن اور کرشماتی ذہانت کا پیکر بنا دیا تھا۔ اس کے خیرہ کن حسن نے کسی کو بولی دینے کی جرأت نہ کرنے دی۔ فروخت کنندہ ہر ایک کو بتاتا یہ لڑکی نئی سرزمین (امریکا) میں آباد ہونے والے ابتدائی فرانسیسی یا ہسپانوی مہم جوؤں کی اولاد میں سے ہے۔ اسے قزاقوں نے اغوا کر لیا تھا۔ بعد ازاں ان سے بازیاب کرا لیا گیا۔ اس نے کبھی نہ بتایا اسے قزاقوں سے کس نے بازیاب کرایا؟ یہ لڑکی سلطان عبدالحمید اول از 1774ء تا 1789 تک کے دور میں بازار لائی گئی۔ آخر کار اس کے غیر معمولی فتنہ خیز حسن کی شہرت شاہی محل تک پہنچ گئی۔ فروخت کنندہ نے کسی اور کی بولی کو کامیاب ہونے دینا تھا نہ سلطان کے حرم کے علاوہ کسی اور تک اسے جانے دینا تھا۔ اس 14 سالہ لڑکی کو حرم میں ''نقشِ دل'' کا نام دیا گیا۔ یہ نام پوری سلطنت عثمانیہ میں مشہور ہوا۔ جب ''نقشِ دل'' حرم میں داخل ہو گئی تو ''بڑا کھیل'' شروع کر دیا گیا، لیکن مسئلہ یہ تھا حرم کے اندر سے جوابی معلومات حاصل کیسے کی جائیں؟ نقشِ دل کیا کر رہی ہے؟ اس نے مزید کیا کرنا ہے؟ معلومات کی برآمدگی اور ہدایات کی درآمدگی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا صورتحال میں یہ ناممکن تھا، لیکن ''برادری'' ہماری طرح جلد باز نہیں، لہٰذا ناممکن کے لفظ سے آشنا نہیں۔ جلد باز شخص ہی ممکن اور ناممکن کی تفریق میں پڑا رہتا ہے۔ تحمل مزاجی اور استقامت ایسی چیز ہے کہ ناممکن کے لفظ کو لغت سے خارج کر دیتی ہے۔ باورچیوں، خانساماؤں، خصوصی محافظوں اور خادموں کی شکل میں ماہر اور تجربہ کار افراد کی حرم سلطانی میں بھرتی کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ رابطہ کاری اور پیغام رسانی کی ایک زنجیر تیار ہوگئی۔ انہیں سات آٹھ سال لگ گئے، لیکن انہوں نے تحمل کے ساتھ انتظار کیا۔

جب سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو مغرب نے تبصرہ کیا ''بڑا کھیل ختم ہو گیا''۔ یہ ایک حیرت انگیز جملہ تھا۔ کیا یہ ایک طنزیہ تبصرہ تھا یا پھر واقعی کوئی بڑا کھیل کھیلا جا رہا تھا؟ اس لڑکی نے بہت جلد ترکی زبان سیکھ لی۔ شاید وہ پہلے سے جانتی تھی۔ اپنی مخصوص تربیت کی بنا پر اس نے سلطان کے دل میں اترنے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔ 20 اگست 1785ء کو اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس کا نام ''محمود'' رکھا گیا۔ بعدازاں وہ محمود ثانی دوم کے نام سے 30 واں سلطان (1808ء تا 1839ء) بنا۔ ''نقشِ دل'' کے بطن سے جنم لینے والے اس بچے کو اس کے بہت سارے بھائیوں اور چچازادوں کی موجودگی میں تخت تک پہنچایا گیا۔ یہ محلّاتی سازشوں سے پُر ایک طویل داستان ہے جس کا آغاز سلطان سلیم سوم کو تخت سے اتارنے سے ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ''ینی چری'' سے زیادہ موزوں کوئی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ نقش دل نے ان کو ہاتھ میں لینا شروع کیا۔

ینی چری سلطنت عثمانیہ کا ایک خصوصی لشکر تھے۔ انہیں سلطان کے محافظوں کی حیثیت سے بھرتی کیا جاتا تھا۔ ینی چری بنیادی طور پر یتیم بچے تھے جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت کسی مذہبی امتیاز کے بغیر سلطان کی سرپرستی میں کی جاتی تھی۔ انہیں بلوغت کے بعد مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تعلیمات دی جاتی تھیں۔ پھر نہایت اعلیٰ عسکری تربیت دینے

کے بعد سلطان کے محافظ دستہ میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ یہ محافظ براہِ راست سلطان کے ماتحت اور صرف اس کو جواب دہ تھے۔ سلطان سے ان کی وفاداری اور ناقابلِ یقین بہادری نے انہیں عزت و وقار کی علامت بنا دیا تھا۔ اس بات نے نہ صرف انہیں فوج میں اعلیٰ مقام دلا دیا، بلکہ ان کی اطاعت اور اثر و رسوخ میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا یہ لوگ بذاتِ خود ہر سلطان کے لیے خطرہ بن گئے اور وہ پھر بادشاہ گر بن گئے۔ یہاں پہنچ کر قارئین خود سمجھ گئے ہوں گے کہ جس طرح محل کے اندر نقشِ دل کو پہنچایا گیا تھا۔ اسی طرح ینی چری یوں میں کسی ''وفادار'' کو داخل کرنا ہی وہ منصوبہ ہو سکتا تھا جو دوطرفہ رابطوں کے لیے قابلِ عمل تھا۔

سلطان سلیم سوم اس امر کا ادراک کر چکا تھا کہ بادشاہ گر قوتیں حرکت میں ہیں۔ وہ ینی چری یوں کی قوت کو تشویش کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان کے تسلط سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نئی پیادہ فوج بنائی۔ اسے Nizami Cedits یا ''نیو آرڈر'' کہا گیا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ''نقشِ دل'' جو پس پردہ بیٹھی طاقت کا کھیل کھلوا رہی تھی، کا داؤ چل گیا۔ اس نے ینی چری کے ایک سردار سے پینگیں بڑھا کر ینی چری یوں کو حسب منشا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ نقشِ دل (بظاہر) ایک ینی چری علی آفندی سے ملی جو البانیہ کے گھوڑوں کے سوداگر کا بیٹا، اور وینیشین عیسائی تھا۔ علی آفندی کرفو کا رہنے والا تھا۔ اس کے ذریعے آہستہ آہستہ نقشِ دل نے ینی چری یوں کو حسب منشا استعمال کرنے کا راستہ پیدا کر لیا۔ ینی چری بادشاہ گر تھے اور برادری اپنے لوگوں کو اس بات کی خصوصی تربیت دیتی تھی کہ وہ بادشاہوں کو نہیں بادشاہ گروں کو قابو کریں۔ نقشِ دل نے ہر حال میں اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھانا اور آخر کار سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کرنا تھا، کیونکہ وہ اسے اپنا نہیں ترک سلاطین کا بیٹا سمجھتی تھی۔ وہی سلاطین جن کے حرم میں اسے خصوصی اہداف کے تحت داخل کیا گیا تھا۔ پھر

بھی انہوں نے اس سے اچھا سلوک کیا تھا۔ سلطان سلیم معزول کر دیا گیا۔ اسے 28 مئی 1807ء کو تخت سے اتار کر قید کر لیا گیا۔ یہ کام ینی چریوں (Janissaries) نے کیا جو طاقتور عثمانی رجمنٹ تھے۔ (جاری ہے)

دل کش نعروں کی آڑ میں

(دوسری قسط)

سلطان سلیم کی معزولی کے بعد سلطان محمود دوم کو 28 جولائی 1808ء کو تخت نشین کردیا گیا۔ اب نپولین اور جوزفین کی رشتہ دار ''مارتھا'' یعنی نقشِ دل، والدہ سلطان کے مرتبہ پر فائز اور اس کا دور کا بھانجا اسلامی دنیا کا طاقتور ترین حکمران تھا۔ نمک حرام مارتھا کی کوشش تھی کہ خود اپنی جنم دی ہوئی نسل کو طاقت اور سلطنت سے محروم کر کے دنیا سے ''خلافت'' نامی مثالی طرزِ حکومت کا خاتمہ کردے۔ بڑا کھیل اپنے پہلے نصف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''مارتھا'' اگلے 29 برس تک زندہ رہی۔ وہ مسلمانوں کے بادشاہ کی انتہائی بااثر فرانسیسی ماں تھی۔ اس نے کھیل کے لیے تیزی سے میدان سجانا شروع کیا۔ عثمانی تہذیب مفقود اور فرانسیسی تہذیب غالب آتی گئی۔ محمود دوم نے پگڑی اور جبّہ وغیرہ پہننا چھوڑ دیا۔ یورپی لباس اپنا لیا۔ آخری دو خلفاء...... 36 واں اور 37 واں حکمران...... جن کی تصاویر ملتی ہیں، اسی لیے یورپی لباس میں ملبوس دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ سے ناواقف قاری تعجب کرتا ہے کہ ان کی سلطنت تو کمزور ہوئی تھی، ان کے حلیوں کو کیا ہوا؟ 30 ویں نمبر کے اس حکمران جو نقشِ دل کا فرزند ہونے کی بنا پر یورپی نقوش کو عثمانی آثار پر مسلط کررہا تھا، تمام عمائدین

سلطنت اور سرکاری اہلکاروں کو اپنی تقلید کا حکم دیا تاکہ ترقی کو جلد از جلد آزادی کے ذریعے حاصل کر سکے۔ آزادی کس سے؟ کیا وہ غلام تھے؟ نام نہاد جمہوری آزادی جس نے ترکی کو سیکولر یورپ کی غلامی میں دھکیل دیا۔ سلطنت کے عاملین کا ڈھانچہ یورپی نظام کے مطابق سول سروسز کے طرز پر قائم کیا گیا۔ بہادر عثمانی افواج کی تربیت کے لیے غیر ملکی فوجی ماہرین کی خدمات حاصل کر کے ان کا مزاج تبدیل کرنے کی اور بعد ازاں قابو میں کر لینے کی کوشش شروع کی گئی۔ ترکی پر مغربی تہذیب کے دروازے کھول دیے گئے۔ ذہین طلبہ کو خصوصی تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جانے لگا۔ یورپ پلٹ طلبہ کو بڑے بڑے عہدے دیے جانے لگے۔ یہی طلبہ آگے چل کر ''نوجوان ترک'' نامی اس جماعت کی بنیاد بنے جس نے قدیم خلافت کے خاتمے اور جدت پسند جمہوریت کے نفاذ کی تحریک چلائی۔ برادری کا سفر اپنے ہدف کی طرف درست سمت میں جاری تھا۔ یورپ پلٹ خصوصی تربیت یافتہ طلبہ دلکش نعروں کی آڑ میں سلطنت پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ بساط کا ہر مہرہ اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ شیطانی جمہوریت کے پیالے میں اسلامی خلافت کے سقوط کا عکس نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔

سلطان محمود دوم یکم جولائی 1839ء کو تپ دق اور ضعفِ جگر کے عوارض میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔ ہر وقت کی شراب نوشی نے اس کی موت کو تیزی سے قریب کر دیا تھا۔ اس سے فراغت کے بعد آگے کی نئی حکمران نسل پر ویسے ہی محنت ہو رہی تھی، جیسے آج کل عرب شہزادوں پر ہوتی ہے۔ اس کا جانشین اور بیٹا سلطان عبدالمجید اوّل ......1839ء تا 1861ء...... زیادہ وقت باسفورس والے پرتعیش محل میں گزارتا، جو قرض لے کر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی ترجیح مغربی موسیقی سننا تھی۔ مغربی تعلیم اثر دکھا رہی تھی۔ شراب جسم کو اور موسیقی روح کو گھائل کر رہی تھی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے مغرب یا برادری مسلمان حکمرانوں کو ڈھب پر لاتی ہے۔ ہمارے ہاں فحاشی پھیلانے اور مانع حمل گولیاں تقسیم کرنے

کی منطق بھی یہی ہے۔ نوجوان ترک طلبہ کی یورپ میں تعلیم و تربیت کے بعد اب وقت آ گیا تھا کہ عثمانی سلاطین کے لیے بھی غیر ملکی دوروں کا اور ان میں دیے جانے والے خصوصی پروٹو کول کا جال بچھایا جائے تا کہ وہ وہاں سے رنگ اور روشنی لے کر اپنے تاریک و پسماندہ ملک کو لوٹیں۔ 600 سالہ قدیم سلطنت کے ایوانوں میں بالآخر عورت، شراب اور موسیقی نے دراڑیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ ''نقشِ دل'' کے جادو کا نقش سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا مسلم حکمرانوں کو یورپی زندگی کے نظاروں سے لبھا کر کھیل کو تیزی سے آگے بڑھایا جائے۔

سلطان عبدالعزیز...... 1861ء تا 1876ء...... سلطان محمود دوم کا بیٹا اور 32 واں سلطان پہلا مسلمان خلیفہ تھا جس نے 1867ء میں یورپ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اس کے ساتھ اس کا بیٹا ''یوسف عزالدین'' اور دو بھتیجے مراد...... 33 واں سلطان...... اور عبدالحمید...... 34 واں سلطان...... بھی تھے۔ اس دورے کی دعوت اسے لوئیس نپولین نے دی۔ اس کا مقصد ''عظیم عالمی نمائش'' دیکھنا تھا۔ سلطان کا بھتیجا، مراد اپنی سنجیدگی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اسے ممکنہ طور پر اگلا جانشین باور کیا جاتا تھا۔ وہ اتنا سنجیدہ اور متین شخص تھا کہ زندگی بھر کبھی نہ مسکرایا۔ یورپ کے دورے کے دوران اسے شراب اور چاکلیٹ پیش کی گئی۔ اس نے خلافِ عادت مسکرا کر ملکہ فرانس کا شکریہ ادا کیا۔ وار چل چکا تھا۔ یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس کے چہرے پر دیکھنے میں آئی۔ یورپ والوں کے لیے یہ ایک مثبت اشارہ تھا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ نوجوان شہزادہ یورپی شراب اور برانڈی کے ساتھ چاکلیٹ کا ذائقہ بھی واپس وطن لے جا رہا تھا۔ یہ انتہائی خطرناک علامت تھی۔ مستقبل کا سلطان رنگین یورپی مشروبات اور حرام آمیز ماکولات کا عادی ہونے جا رہا تھا۔ اسلام دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بالآخر ''امّ المفاسد'' (غیر مسلم بیوی) کے بعد ''اُمّ

الخبائث“ کو بھی سلاطین کی خلوت گاہوں میں پہنچا دیا تھا۔

سلطان عبدالعزیز کے بعد حسبِ توقع اس کا بھتیجا مراد پنجم اگلا سلطان بنا۔ یورپی برانڈی اور شراب کا جو ذوق وہ یورپ کے دورے سے اپنے ساتھ لایا تھا، بہت جلد ایک ضرورت بن گیا۔ اب وہ ایک عادی شرابی تھا۔ کثرت شراب نوشی سے وہ، ذہنی مریض بھی بن گیا۔ اس کے ساتھ دوطرفہ حربے کھیلے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو فتنہ انگیز حسن کی مالک دوشیزائیں جنہیں حرم تک پہنچانے کا سلسلہ نقشِ دل قائم کر گئی تھی، کے ذریعے کاروبارِ سلطنت اور حریف یورپی ممالک کے مقابلے میں ترقی و جہدو جہد سے غافل کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے خلاف ملک بھر میں پروپیگنڈہ جاری تھا کہ وہ ہر وقت نشے میں ڈوبا اور دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے کاندھے ریاست کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں۔ ملک کو نئے حکمران، بلکہ حکمرانی کے نئے نظام کی ضرورت ہے۔ کون سے نظام کی؟ سلطنت و خلافت کے سقوط کے بعد جمہوریت کے علاوہ اور کون سا نظام مغرب کی نظر میں اسلامی ممالک کے لیے بہترین ہو سکتا تھا؟

اس طرح ”برادری“ نئے سیکولر ترک جمہوریہ کے لیے پس منظر تیار کر رہی تھی۔ ان کے پروپیگنڈا اور پمفلٹوں نے نوجوانوں کی ذہنی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ نئے پمفلٹ قدیم اسلامی طریقوں کا استہزا اڑانے کے لیے تحریر کیے گئے۔ ان پمفلٹوں میں خاکہ دیا جاتا کہ خلیفہ وحشیانہ ڈاڑھی اور مونچھوں کے ساتھ قدیم اسلامی لباس میں ایک زنگ آلود تلوار پکڑے ہوئے ہے، جبکہ پس منظر میں ایک صاف ستھرے لباس میں ڈاڑھی منڈا، خوش وضع فرانسیسی کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں جدید رائفل ہے۔ یہ سب کچھ نوجوان نسل کا ذہن مسموم کرنے اور رائے عامہ متحرک کرنے کے لیے تھا، تاکہ عوام اپنے ہی بھائیوں کے خلاف لڑنے مرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جنہیں گنوار ملا کہا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ فری میسنری

کے نام پر اور شیطان ازم کے کہنے پر کیا جا رہا تھا۔ یہی کام ہمارے ہاں برصغیر میں انگریزی تہذیب کے غلبے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہی کام آج افغانستان میں ''اسلامی امارت'' کے احیا کے خطرے کے پیش نظر پہلے پڑوس ملک میں ''میرا سلطان'' نامی فلموں کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ طالبان کی ساکھ خراب کرنے اور ان کے بے مثل بہادری کے کارناموں پر گرد اڑانے کا کوئی موقع ہمارا ''فنڈ خور'' آزاد اور ''غیر جانبدار تابع فرمان میڈیا'' ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

سلطان مراد کے بعد خوش قسمتی سے سلطان عبدالحمید دوم 34 واں سلطان بنا۔ یہ وہ آخری شخص تھا جو برادری کے زیر اثر نہ تھا، بلکہ ان کی چالوں کو سمجھتا اور ان کے توڑ کی فکر میں رہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی دشمن کا جال کھونٹے گاڑ چکا تھا۔ برادری نے اس کو جب ڈھب پر لانے کی کوشش کو ناکام ہوتے دیکھا تو ترکیب نمبر دو شروع کی۔ اس کے خلاف پروپیگنڈے اور قاتلانہ حملے شروع ہو گئے تاکہ اگلے فری میسن حکمران کا راستہ صاف کیا جائے۔ اس کے خلاف پروپیگنڈے کے طوفان کا یہ عالم تھا کہ یورپی وظیفہ خور قلم کار اسے مردود عبدل کہتے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے برادری اس رکاوٹ کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر کس حد تک برافروختہ ہو چکی تھی؟

سلطان عبدالحمید دوم نے قاتلانہ حملوں اور گمراہ کن پروپیکنڈوں کے باوجود حکمرانی جاری رکھی۔ اس کے مخالفین کی قیادت برادری کا تیار کردہ جرنیل محمود شفقت پاشا کر رہا تھا۔ وہ سالونیکا میں تیسری فوج کا کمانڈر تھا۔ اس نے اپنے مقدونی سپاہیوں کے ساتھ اپریل 1909ء میں استنبول کا محاصرہ کر لیا۔ 22 اپریل 1909ء کو بہت سے منتشر ارکان ایوان اور وزرا خفیہ طور پر سان سٹیفانو میں جمع ہوئے۔ انہوں نے فری میسن ایجنٹ سعید پاشا کی چیئر مین شپ میں فیصلہ کیا کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا جائے، چنانچہ اس کا اقتدار 27 اپریل 1909ء کو ختم ہو گیا۔ دو دن بعد اسے سالونیکا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے اپنی بقیہ

زندگی وہیں گزاری۔ اس کا جرم کیا تھا؟ ’’جرمِ ضعیفی‘‘ کے بعد اس کا اصل جرم تھا اس نے برادری کے کہنے پر اسے فلسطین منہ مانگی رشوت کے عوض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آئیے! اس کی روئیداد بھی سن لیجیے:

’’1901ء میں صہیونی تحریک کے سربراہ تھیوڈور ہرٹزل نے خلافتِ عثمانیہ کے 25 ویں خلیفہ اور عثمانی سلطنت کے 34 ویں سلطان، سلطان عبدالحمید ثانی کو پیشکش کی کہ اگر آپ سرزمین فلسطین میں یہودی آبادکاری کی اجازت دے دیں تو ہم آپ کو سونے کے 150 ملین برطانوی پونڈز دیں گے۔‘‘ سلطان نے جواب دیا: ’’اگر تم مجھے 150 ملین برطانوی پونڈز کے بجائے وہ سارا سونا بھی دے دو جو پوری دنیا میں پایا جاتا ہے تو بھی مجھے تمہاری پیشکش قبول نہیں، کیونکہ میں پچھلے 30 سال سے اسلامی دنیا اور اُمت محمدیہ کے مفادات کا نگہبان ہوں۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا جس سے مسلمانوں، میرے آباء و اجداد اور خلفا و سلاطین پر دھبہ لگے۔ میں یہودیوں کو سرزمین فلسطین کا ایک انچ بھی نہیں دینے والا، کیونکہ یہ میری ملکیت نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے جنہوں نے اس کے دفاع کے لیے خون کی ندیاں بہائی ہیں۔‘‘

یہ جواب سن کر صہیونی زعما پھنکارتے سانپ کی طرح غصے سے بے تاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنی توپوں کا رُخ سلطان کی طرف پھیر دیا۔ زبانیں زہر اُگلنے لگیں۔ قلم ناگ کی طرح پھنکارنے لگے۔ تمام وسائل جھونک دیے گئے۔ مہرے متحرک کر دیے گئے۔ سلطان کو معزولی اور پھر جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن فلسطین بیچنے کا داغ ماتھے پر لینے سے بچ گیا۔ یہ کلنک کا ٹیکا برطانیہ کی قسمت میں لکھا تھا۔ جو اس نے ’’اعلان بالفور‘‘ کی شکل میں اپنے ماتھے پر سجایا۔ سلطان عبدالحمید دوم کی معزولی کے بعد برادری کے رستے میں رکاوٹ نہ رہی۔ اگلی نسل اس کی تیار کردہ تھی۔ کھیل آخری لمحات کی بڑھ رہا تھا۔ ’’نقشِ دل‘‘ کا نقشِ اوّلین اب

نقشِ ثانی و ثالث کی شکل میں ڈھل رہا تھا۔ سلطان عبدالحمید کے بعد کوئی بھی سلطان، کسی طاقت اور اختیار کا مالک نہیں تھا۔ سب سلطان ''نوجوان ترک'' قیادت کے اسیر تھے۔ ان کے ذریعے اتحادیوں اور اتحادیوں کے ذریعے اتاترک کے قیدی تھے۔ اتاترک عوام کو دھوکا دیتے ہوئے مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ سلطان اتحادیوں کا قیدی ہے۔ اس کی بحالی صرف اس وقت ہوگی جب قومی وقار اور اقتدارِ اعلیٰ بحال ہوگا، لیکن یہی سلطان اس وقت آزاد ہوتا تھا جب اس کا نام استعمال کرنے اور غلط طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگلے ساڑھے 3 برس فری میسن جوڑ توڑ سے بھڑکنے والی جنگوں کی ایک بھرپور مثال تھے۔ اتاترک کو قوم کا ہیرو بنایا جانا تھا تاکہ قوم سلطان کو بھول جائے۔ مسلمانوں کے سامنے ایک متبادل قیادت پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ فری مینسز نے یہ فراہم کردی۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے، لیکن ہم اسے کسی اور کی کارستانی سمجھ کے بھول جاتے ہیں۔ مثلاً: ہم نہیں جانتے دنیا میں نیویارک وہ پہلا شہر ہے جس میں گورنر ہاؤس اور فری میسن کا لاج آمنے سامنے ہیں۔ اب دوسرا شہر جس میں گورنر ہاؤس کے بالکل سامنے چار گھروں کی شکل میں فری میسن لاج موجود ہیں، ہمارے ملک میں ہے۔ بلیک واٹر کا مرکز بھی اسی شہر میں تھا۔ وہ یہیں سے کنٹرول ہوتے تھے۔ (جاری ہے)

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(تیسری قسط)

سلطان عبدالحمید دوم کے بعد ترکی کے تخت پر تین اور سلطان بیٹھے: **محمد پنجم**، **محمد وحیدالدین ششم** اور **عبدالمجید دوم**، لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ خالص عثمانی خون اور عثمانی مزاج پر تھا نہ وہ حقیقی طور پر صاحبِ اختیار تھا۔ ''نقشِ دل'' کا جادوئی نقش چل چکا تھا۔ وہ غیرتمند عثمانی خون میں دوغلے خون کی آمیزش کر کے 29 سال کے عرصے میں اپنا کام کر چکی تھی۔ آخری 2 میں پہلے سے تو محض سلطنت عثمانیہ کے سقوط اور دوسرے سے خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا کام لیا گیا۔ تمام نیک دل مسلمان حسرت سے عثمانی سلطنت کی ڈوبتی ہوئی نبضیں دیکھ رہے تھے۔ سرکاری طور پر تمام اقتدار GNA (گرینڈ نیشنل اسمبلی) کے پاس تھا اور اس کے ذریعے فری میسنز کے پاس۔ اخیر الذکر دونوں حکمرانوں میں سے پہلے یعنی سلطان محمد وحیدالدین ششم کو سلطنت سے معزول کیا گیا۔ دوسرے کو خلافت سے بھی معزول کر دیا گیا، لیکن وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ بھی نہ سکے۔ کھیل کے آخری لمحات کی داستان انتہائی المناک اور دل کا خون کرنے والی ہے۔ آیئے! اس دلخراش داستان سے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ شاید یہ حسرت وندامت ہمیں مستقبل میں دشمن کے بدلتے پینتروں کو سمجھنے

اور اس کے وار سے بچنے میں مدد دے سکے۔

سلطنت عثمانیہ جس کے آخری 2 حکمرانوں کی رگوں میں اگرچہ عظیم سلاطین آل عثمان کا خون تھا، لیکن اس میں یہودی و عیسائی حسیناؤں کے خون کی آمیزش ہو چکی تھی۔ 36 ویں سلطان (یعنی آخری سے پہلا حکمران جس کا پورا نام سلطان وحید الدین محمد سادس (Muhammad VI) تھا) محلاتی سازشوں کی یلغار میں وہ جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اصل اقتدار جمہوری تماشے کے ذریعے ترکی کی گرینڈ اسمبلی کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ جس نے یکم نومبر 1922ء کو اجلاس بلا کر سلطنت عثمانیہ ختم کرنے کی منظوری دے دی۔ ساتھ ہی بغیر کوئی جرم بتائے سلطان کو ملک بدر کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ انگلینڈ، اسپین، تھائی لینڈ حتیٰ کہ نیپال جیسے ملکوں میں جمہوری تماشے کے ساتھ بادشاہت پائی جاتی ہے، لیکن واحد ملک جس میں فرضی بادشاہ کے وجود کو بھی برداشت نہیں کیا گیا، ترکی تھا۔ جمہوریت دراصل وجود میں اس لیے لائی گئی ہے کہ امارت یا خلافت کا شرعی نظام باقی نہ رہے جو اسلام کی نظر میں حکمرانی کا واحد مثالی نظام ہے۔

سلطان محمد سادس نے کوئی چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے جلاوطنی کے احکامات، فرد جرم سنے بغیر بلا چوں و چرا قبول کر لیے۔ ان کو ملک سے لے جانے کے لیے فوری طور پر جو بحری جہاز منگوایا گیا، وہ برطانیہ کی ملکیت تھا۔ جی ہاں! وہی برطانیہ جو اپنے ہاں بادشاہت کو آج تک یادگار کے طور پر باقی رکھے ہوئے ہے۔ اسے مسلمانوں کا بادشاہی نظام ختم کرنے میں اتنی جلدی تھی کہ تاریخ کے طلبہ کے ہاتھوں لعن طعن سے نہ گھبرایا اور ملایا نامی جہاز قسطنطنیہ کی بندرگاہ بھیج دیا۔ یہ جہاز 1913ء میں بنایا گیا تھا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد 1948ء میں اسے توڑ دیا گیا۔ سلطان اپنے چند رفقاء جن میں شیخ الاسلام نوری آفندی اور وزیر اعظم احمد توفیق پاشا کے ہمراہ اس بحری جہاز میں سوار ہو کر اپنے گھر سے بے گھر اور وطن

سے بے وطن ہوگئے۔ جہاز انہیں لے کر ''برادری'' کی طرف سے طے شدہ منزل یعنی پہلے مالٹا کی بندرگاہ اور پھر اٹلی کی ساحلی پٹی (Riviera) پہنچا۔ جی ہاں! وہی مالٹا جہاں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء نے خلافت کی حفاظت کی پاداش میں قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اسی مالٹا سے ہوکر آخر سلطان اٹلی لے جائے گئے، جہاں انہیں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارنے تھے۔ وہاں وہ 4 سال تک زندہ رہے۔ پھر 16 مئی 1926ء کو آپ کی وفات سان ریمو (San Remo) نامی شہر میں ہوئی۔

سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی طرح سلطنتِ عثمانیہ کے آخری تاجدار سلطان وحید الدین ششم کو بھی دفن کے واسطے کوئے یار میں دو گز زمین نہ ملی۔ بات وہی ہے اسلام کی ہر چیز کی طرح، بلکہ ہر چیز سے زیادہ ''برادری'' کو یا اس کے مرغِ دست آموز مغرب کو مسلمانوں کے نظام حکومت ''سلطنت'' یا اسلام کے نظام ریاست ''خلافت'' سے نہایت چڑ ہے۔ انہیں بس جمہوریت کا نظام دنیا بھر میں رائج کرنا ہے جو خالصتاً فری میسن ایجاد ہے۔ یہ وہی نظام ہے جس کے تحت ہمارے ہاں جمہوریت کی تلاش میں ہونے والے 19 انتخابات کے ذریعے 5 جمہوری جماعتیں مکمل شخصی وراثت بن گئی ہیں۔ سلطان کے جسد خاکی کو ترکی منتقل کرنے کی اجازت بھی نہ ملی۔ آخر کار انہیں شام کے دارالحکومت دمشق منتقل کیا گیا جہاں کی مشہور عثمانی مسجد ''تکیہ'' (Tekkiya) سے ملحقہ تاریخی قبرستان میں انہیں سپرد خاک کردیا گیا۔ یہ وہی مسجد تھی جسے ان کے جدِّ امجد 10 ویں عثمانی، عظیم الشان سلطان سلیم قانونی نے عالم اسلام کے مشہور، ماہر تعمیرات سنان نامی معمار سے بنوایا تھا۔

سلطان وحید الدین سادس کی جلاوطنی کے ساتھ ہی، بلکہ اس سے پہلے عثمانی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا تھا۔ ان کی جلاوطنی (17 نومبر 1922ء) کے 2 دن

بعد یعنی 19 نومبر 1922ء کو سلطان عبدالمجید آفندی کو ’’خلیفہ‘‘ بنایا گیا۔ ’’سلطنتِ عثمانیہ‘‘ کے خاتمے کے بعد اب خلافتِ عثمانیہ کا منصب رہ گیا تھا، جسے پورا عالم مغرب اور ’’برادری‘‘ کے شیطان چیلے ختم کرنے کے درپے تھے۔ وہ دونوں دینی وروحانی مناصب کو بیک وقت ختم کر کے کوئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ شیطان کا کام جلدی کا ہے، لیکن وہ اس شیطانی منصوبے کو دھیرے دھیرے پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے۔ عثمانی سلطنت آخری عثمانی سلطان کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ اب عثمانی خلافت رہ گئی تھی، جسے بچانے کے لیے پوری دنیا کے مسلمان خصوصاً ہندوستان کے علمائے دیوبند ’’تحریکِ خلافت‘‘ 1918ء تا 1924ء جیسی مہموں کے ذریعے پورا زور لگا رہے تھے۔ یہ چیز آج تک ترکوں کو یاد ہے، لہٰذا وہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے بے لوث محبت اور شکر گزاری کا جذبہ رکھتے ہیں۔ تحریک خلافت کا نقطۂ عروج کراچی کے خالق دینا ہال میں علی برادران پہ غداری کا مقدمہ تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کی والدہ بی اماں جن کا اصل نام ’’آبادی بانو بیگم‘‘ تھا اور بے شمار خواتین میدان میں آ گئیں۔ اس دوران نظم:

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کو تاریخی شہرت حاصل ہوئی۔ بچے بچے کی زبان پر یہ شعر تھا۔ تمام ہندوستانی مسلمانوں میں خلافت کے نظام کو بچانے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دے رہے تھے۔

اُدھر جمہوریت کے نام پر قائم کی گئی ترک اسمبلی نے یکم نومبر سے 19 نومبر کے درمیانی عرصے میں جب کوئی عثمانی حکمران موجود نہ تھا، تمام نام نہاد قانون سازی کرتے ہوئے سلطان کے تمام اختیارات سلب کر لیے۔ اب عثمانی خلیفہ اور عثمانی خلافت دونوں بے اختیار اور برائے نام ہو چکے تھے، لیکن غیرت مند مسلمانوں کی کوشش تھی اس ادارے میں

روح پھونکی جائے، جبکہ ''برادری'' اسے ہر حال میں جان کنی کی حالت میں مبتلا کر کے معدوم کر دینا چاہتی تھی۔ تقریباً 2 سال تک یہ کشمکش چلتی رہی۔ آخر کار مصطفیٰ کمال پاشا نامی شقی القلب نے جسے اس مقصد کے لیے برسر اقتدار لایا گیا تھا، 3 مارچ 1924ء کو جدید جمہوریت اسمبلی کے ذریعے قرار داد منظور کروا کر ''اسلامی خلافت'' کے خاتمے کی نامبارک حرکت کر ڈالی۔ 1924ء سے لے کر 19 ویں صدی کی آخری دہائی تک کا عرصہ زمین پر خلافت کے وجود سے خالی تھا۔ تا آنکہ ملا عمر حفظہ اللہ نے امارت اسلامیہ افغانستان کی بنیاد رکھ دی۔ دنیا کو اس شعر کا مصداق نظر آ گیا:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس حیرت انگیز کامیابی پر مغربی دنیا اور فری میسن کی صفوں میں تہلکہ برپا ہو گیا۔ تمام قوتیں اس امارت کے خاتمے کے لیے متفق ہو کر میدان میں کود پڑیں۔ دوسری طرف دنیا بھر کے بچے کھچے، بے سرو سامان، نہتے مجاہدین تھے۔ ان قلندروں نے مقابلے کو دوبارہ صفر سے شروع کر کے 100 کے قریب پہنچا دیا اور عالم اسلام کو پھر ایک موقع فراہم کیا کہ ''برادری'' کے ہتھکنڈوں سے نکل کر اپنی اصل شناخت دوبارہ سے قائم کرے۔

ہم داستان بیان کرتے کرتے حالات حاضرہ کی طرف آ گئے، جبکہ ابھی آخری حصہ باقی ہے۔ آیئے! اسے مکمل کر کے دیکھتے ہیں کہ ہم اس سے کیا عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں؟ آخری سلطان تو ترکی سے جا چکے تھے۔ اب آخری خلیفہ کی روانگی کا تذکرہ دل پر پتھر رکھ کر سنیے! پتھر رکھنے کا مطلب یہ کہ ماضی کے دُکھوں یا غلطیوں پر بے صبری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، البتہ اگر ان سے پیدا ہونے والے غم و غصے کا رخ موڑ کر اسے اپنی اصلاح، دشمن سے انتقام اور ہدف کے تعاقب پر لگا دیا جائے تو تلافی مافات کی راہ نکل سکتی ہے۔ اس دل

نگار واقعے کی منظر نگاری سے غرض صرف اتنی ہے کہ ہم یہ سمجھ جائیں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ ہم آج کا کام آج کر لیں اور خوش فہمی یا مایوسی دونوں سے بچ کر چلتے رہیں تو بڑے سے بڑے دکھ کا مداوا ہو سکتا ہے۔ ہم نے خلافت سے ہاتھ دھونے کے بعد اسے سرے سے بھلا دیا ہے۔ یہ تو ہمارا آبائی ورثہ اور اجتماعی امانت ہے۔ اس سے غافل ہونے کا مطلب یہ ہے ہم مقصدِ زندگی حاصل کرنے کے لیے نہیں معیاری زندگی بڑھانے کے لیے جی رہے ہیں۔ یہ تو حیوان بھی کر لیتا ہے۔ ہمارا مرتبہ تو بہت بلند اور اس کے تقاضے ہماری پہنچ سے بہت زیادہ دور نہیں۔ بعض خدا پرست دیوانے اس منصب کو پھر سے زندہ کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے غم تازہ کر کے ان کے مداوے کے لیے ان بوریا نشینوں کا ساتھ دیں تو اس قعرِ مذلت سے نکل سکتے ہیں۔ تو آیئے! یہ اندوہناک منظر ہراتے ہیں۔ شاید کوئی قبولیت کا آنسو آنکھ سے ٹپک پڑے۔

یہ 3 یا 4 مارچ 1924ء کی درمیانی شب اور تہجد کا وقت تھا۔ استنبول میں خلفائے اسلام کی سرکاری رہائش گاہ ''دولما باشی'' محل کی لائبریری اس وقت بھی روشن تھی، کیونکہ عثمانی خلیفہ عبدالمجید قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ کاش! وہ قیام کے اس وقت میں سجدے میں نہ گرتے، اور قرآن پاک کی تلاوت کے بجائے قرآن پاک کے احکامات کی تلاوت و تنفیذ کرتے، تاہم محل کے باہر پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ ایسی خاموشی جس کے پیچھے طوفان چھپا ہوتا ہے۔ پھر ہوا یہ کہ ترکی کی نیشنل آرمی کے دستوں نے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک نمایندہ خصوصی پیغام کے ہمراہ محل میں بھجوایا۔

''آؤ!'' خلیفہ نے دروازے پر دستک سنتے ہی کہا۔ خلیفہ کے جانثار ملازم نے اطلاع دی محل کو ہر طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور استنبول (قسطنطنیہ) کے گورنر آپ سے ملنا

چاہتے ہیں۔ فری میسن سیکولر گورنر ڈاکٹر عدنان نے خلیفہ سے ملاقات کرتے ہوئے انہیں اسمبلی کے فیصلے سے آگاہ کیا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنا سامان باندھ لیں۔ انہیں فوراً ہی محل خالی کرنا ہوگا۔ ''برادری'' انہیں برداشت کرنے پر تیار نہ تھی۔ خلیفہ کے خاص ملازم نے خلیفہ کو آگاہ کیا کہ انکار کی صورت میں موت کے گھاٹ اتارنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ یعنی بغیر کسی جرم کے جلاوطنی کی سزا اور اس سزا کو قبول نہ کرنے پر سزائے موت۔ خلیفہ نے کچھ سوچنے کے بعد احکامات پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہیں ذہنی طور پر اتنا ہراساں کردیا گیا تھا کسی قسم کی مزاحمت کی ہمت وہ خود میں نہ پاتے تھے۔

ایک گھنٹے بعد معزول عثمانی خلیفہ، اس کی اہلیہ، بیٹی اس حال میں محل سے نکلے کے ان کے پاس چند جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ وقتِ تہجد تھا جو بس رخصت ہی ہونے والا تھا اور فجر کی اذان ہونے ہی والی تھی۔ خلیفہ کو خاندان سمیت ترک نیشنل آرمی نے گھیرے میں لے لیا۔ انہیں استنبول ریلوے اسٹیشن لے جایا جارہا تھا، جہاں ''اورینٹ ایکسپریس'' کے ذریعے انہیں سوئٹزرلینڈ جلاوطن کیا جانا تھا۔ یہ طویل فاصلہ کے لیے چلنے والی ٹرین تھی جو ترکی سے یورپین ممالک تک جاتی تھی؟ اس کا آغاز 4 اکتوبر 1883ء کو ہوا تھا۔ اسٹیشن پہنچتے ہی خلیفہ کو ایک لفافہ پکڑادیا گیا جس میں 2 ہزار برطانوی پاؤنڈ تھے۔ یہ تھا تین براعظموں پر مشتمل حکومت سے دستبرداری کے عوض خطیر نذرانہ۔ ٹرین کی سیٹی بجی تو خلیفہ اہلِ خانہ سمیت سوار ہوئے اور ٹرین سوئٹزرلینڈ کے لیے روانہ ہوگئی۔ سوئٹزرلینڈ میں کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد حکومت نے ان کو اور ان کے اہلِ خانہ کو داخلے کی اجازت دے دی، بشرطیکہ وہ کوئی ایسا عمل نہیں کریں گے جو سوئس حکومت کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔ آخر تو تین براعظموں پر حکمران خاندان کے فرد پر یہ شرط تو لگائی جانی تھی، تاکہ وہ ارضِ حرمین یا ہندوستان نہ جاسکیں۔ (جاری ہے)

تاریخ کے چند سبق

(چوتھی قسط)

خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی پوری کوشش تھی کہ آخری خلیفہ کو ارضِ حرمین میں پناہ مل جائے یا پھر وہ ہندوستان آجائیں۔ ارضِ حرمین مرکز اسلام ہے۔ یہاں ان کے آجانے سے شمع توحید و خلافت کے پروانے پھر ان کے گرد جمع ہو جاتے اور کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کی اجتماعی نمایندگی کی واحد ریاستی شکل یعنی ''خلافت'' کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتی۔ ہندوستان آجاتے تو یہاں علمائے دیوبند کی شکل میں حریت و جہاد کے بے لوث علمبردار موجود تھے۔ ایسی زوردار تحریک چلتی کہ انگریز کو مقبوضہ ممالک پر قبضہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اسرار عالم اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''دجال'' جلد سوم میں لکھتے ہیں:

''سقوطِ خلافت 1923ء سے لے کر 1990ء تک اس امت مرحومہ پر پانچ عظیم قیامتیں ٹوٹیں: 1923ء میں (Dntertainment) کے تحت ترکی میں جمہوریت قائم کرنے، خلافت عثمانیہ کے بقیہ تمام علاقوں پر قبضہ کر لینے اور ان پر لیگ آف نیشنز (League of Nations) انتداب کا اعلان کر دینے اور پھر ترکی میں قائم کی جانے والی اس جمہوریت کے ذریعے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کروانے اور خلیفہ کو ملک بدر کر دینے کے بعد

پوری دنیا میں خلیفہ کے لیے زمین تنگ کر دینا وہ پہلی قیامت تھی جو بیسویں صدی عیسوی میں امت پر ٹوٹی۔ اس کی تین صورتیں سامنے آئیں:

(۱)　یہودیوں نے برطانیہ اور فرانس کے توسط سے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ کوئی آزاد یا نیم آزاد مسلم ملک اور وہاں کا سربراہ خلیفہ کو اپنے یہاں پناہ دے نہ اپنے یہاں خلافت کے نظم کو قائم کرنے دے۔ چنانچہ دنیا کہ تمام مسلم ملکوں اور ان کے حکمرانوں نے ایسا ہی کیا اور کسی نے خلیفہ کو پناہ دی نہ انہیں اپنے یہاں آنے اور خلافت کے نظام کو زندہ رکھنے کی اجازت۔

(۲)　خلیفہ نے اس بات کی کوشش کی کہ اگر کوئی مسلم ملک اسے اپنے یہاں پناہ دیتا ہے اور نہ اپنے یہاں نظم خلافت کے قائم رکھنے کی اجازت تو کم از کم یہ صورت پیدا ہو جائے کہ وہ حرمین شریفین، یعنی مکۃ المکرّمہ اور مدینۃ المنورہ میں پناہ گزیں ہو جائیں۔ لیکن پہلے شریف مکہ نے اور پھر بعد میں عبدالعزیز بن آل سعود نے انہیں ایسا کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ کو اس کی اجازت دینا اس معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی جو قوم پرست عرب حکمرانوں نے خلافت عثمانیہ کی تباہی کے لیے برطانیہ اور فرانس سے کر رکھے تھے۔

چونکہ ہے کسی صورت کے باقی نہ رہ جانے کی حالت میں خلیفہ کے لیے اس نظم کو قائم رکھنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ لہٰذا خلافت ختم ہوگئی۔

(۳)　خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد امت مسلمہ نے جب اس بات کی کوشش کی کہ اگر وہ خلافت بچائی نہ جاسکی تو کم از کم کوئی دوسری خلافت قائم ہو جائے۔ لیکن یہودیوں اور عالمی فری میسن تحریک (Freemason Movement) نے کم از کم تین قطب قائم کر کے مسنری (International Freemasonry) نے ایک ایسی کشش

پیدا کردی جس میں دو فریق یعنی سابق شریف مکہ (اردن کے موجودہ شاہی خاندان کے جدّ امجد اور آغا خان مثبت نما کردار ادا کر رہے تھے، یعنی یہ کہ خلافت قائم ہو اور وہ خلیفہ بن جائیں اور عبدالعزیز آل سعود منفی نما، یعنی خلافت سرے سے قائم ہی نہ ہو اس لیے کہ ان کے مطابق اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہر دو صورتوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خلافت کی باز یافت کی کوشش ناکام ہوگئی۔'' (اسرار عالم، دجال: 3 / 88)

برادری کے پروردہ سیکولر جمہوری ترک حکمرانوں نے انہیں کسی بھی مسلم ملک کی طرف ہجرت نہ کرنے دی۔ انہیں بالجبر وسطی یورپ کے ملک سوئٹزرلینڈ روانہ کر دیا گیا تا کہ کسی بھی مسلمان معاشرے یا تحریک سے ان کا رابطہ نہ ہو سکے۔ اس کارِ خیر میں پورا مغرب، یعنی پورا جمہوریت پرست اور خلافت دشمن مغرب شریک تھا۔ 4 مارچ 1924ء کی صبح جب ترکی کے مسلمان بیدار ہوئے تو انہیں علم ہوا کہ قیامت بیت چکی ہے۔ آخری عثمانی خلیفہ کو بھی جدت پسندی کے حصول اور قدامت پرستی سے فرار کے فریب آمیز نعرے کے تحت ترکی سے جلاوطن کیا جا چکا ہے۔ خلافت کا ادارہ ختم ہو گیا ہے۔ ان کے سر سے سائبان چھن چکا ہے۔ بدلے میں کیا ملا؟ آزادی! کس سے آزادی؟ وہ تو بدترین جانبدارانہ نظام کے غلام ہو چکے تھے۔ ترقی! وہ تو ان سے کوسوں دور تھی۔ طیب اردگان تک وہ ترقی خواب ہی رہی جو حریت کے نام پر اسے جھانسہ دیا گیا تھا۔ ترکی کی معیشت بدترین حد تک گر گئی۔ ترقی یافتہ یورپ کے پڑوس میں ہوتے ہوئے وہ افریقہ کے کسی قحط زدہ ملک کی طرح بدعنوانی، شہری سہولتوں کے فقدان، جرائم کی بھرمار اور اندھیرے مستقبل کا معمار قرار دیا جاتا تھا۔ جمہوریت کا راگ الاپنے والے اپنے پیچھے فری میسن کی شیطنت کے علاوہ کچھ نہ چھوڑ کر گئے تھے۔ عثمانی خاندان کے ساتویں اور سلسلہ خلافت کے آخری حکمران خلیفہ عبدالمجید آفندی نے بہادر شاہ ظفر کی طرح چپ چاپ جلاوطنی قبول کر کے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ انہیں اندرونِ خانہ

موجود ایجنٹوں کے ذریعے خوفناک طریقے سے سہا دیا تھا۔ ان کے آخری ایام فرانس کے دارالحکومت پیرس میں گزرے۔ پیرس کے بیس انتظامی اضلاع ہیں۔ ان میں سے آپ کی رہائش گاہ سولہویں ضلع میں تھی۔ اس کا پتا یہ تھا:

Boulevard Suchet Parice Xvle France. 16th arrondissement (Arrondissement de passy)

دوسری جنگ عظیم (45-1939ء) کے دوران 23 اگست 1944ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔ فری میسن کے لیے یہ دوسری بڑی خوش خبری تھی۔ خلافت کے بعد اب خلیفہ بھی اس دنیا میں نہ رہے تھے۔ اس نے اس لفظ کے اتنے غلط استعمالات دنیا میں اور لغت کی کتابوں میں پھیلائے کہ اس لفظ کے استعمال سے لوگ شرمانے لگے۔ اس لفظ کو اس کا حقیقی وقار اور اس منصب کو اس کا حقیقی افتخار لوٹانا آج کے مسلمان کا فرض ہے۔

آخری سلطان عثمانی کی طرح آخری عثمانی خلیفہ کو بھی غیر متعصب جمہوری حکمرانوں نے وطن میں دفن کے لیے چند گز زمین دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر انہیں مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔ اب پہلے خلیفہ اسلام سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آخری خلیفہ چند قدموں کے فاصلے پر مدفون ہیں۔ دنیا والوں کو کون یہ باتیں سنائے اور یاد دلائے کہ ہمارا نظام حکومت ''خلافت'' ہے، جمہوریت نہیں۔

خلافت کے خاتمے کے بعد اس خاندان کے آخری فرد کا انتقال تقریباً پانچ سال پہلے 27 ستمبر 2009ء کے دن ہوا۔ ان کا نام ارطغرل عثمان تھا اور یہ آخری خلیفہ عبدالمجید آفندی کے پوتے تھے۔ عثمانی شاہی خاندان نے دور رشتے باہر کیے تھے۔ دونوں کی آخری نسل کی آج کچھ خبر نہیں۔ کسی کو علم ہو تو راقم کو اطلاع دے۔ ایک تو ہم لوگوں یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں۔ آخری خلیفہ کی ایک صاحبزادی شہزادی درشہوار کی شادی ریاست حیدر آباد

دکن کے ساتویں اور نظام میر عثمان علی خان کے سب سے بڑے صاحبزادے شہزادہ نواب اعظم خان سے ہوئی تھی۔ دوسرے انہی خلیفہ کے پوتے ارطغرل عثمان کا نکاح افغانستان کے آخری شاہ امان اللہ خان کی قریبی رشتہ دار شہزادی زینب ترزئی سے ہوا تھا۔ ارطغرل عثمان 1912ء میں پیدا ہوئے، 1924ء میں وہ آسٹریا میں زیرِ تعلیم تھے۔ (یہاں وہی غلطی دہرائی جا رہی تھی کہ عثمانی خاندان کے افراد یورپی ممالک کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے جہاں وہ فری میسن کا آسانی سے شکار ہو جاتے تھے۔) انہیں اطلاع ملی کہ اتاترک نے ان کے خاندان کے تمام افراد کو جلاوطن کر دیا ہے۔ انہوں نے تعلیم پانے کے بعد اپنی زندگی کا بیشتر حصہ (تقریباً 60 برس) نیویارک میں ایک ریستوران کے اوپر واقع چھوٹے سے فلیٹ میں شہزادی زینب کے ساتھ گزار دیا۔ وہ تو خیر گذری کہ ستمبر 2009ء میں بعمر 97 سال ان کے انتقال کے وقت ترکی میں کسی سیکولر بچہ جمہورے کی نہیں، طیب اردگان جیسے شخص کی حکومت تھی جس کے دل میں ایمان کی چنگاری بہرحال روشن ہے۔ اس نے ان کے جسدِ خاکی کو نہ صرف وطن واپس لانے کی اجازت دی، بلکہ ہزاروں مسلمانوں کی نمازِ جنازہ کے بعد انہیں ان کے دادا سلطان عبدالمجید کے خاندانی قبرستان میں دفن کی اجازت بھی دی۔ رہے نام اللہ کا۔ اللہ باقی، سب فانی۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ہمیں یہود و نصاریٰ سے دوستانہ تعلقات سے منع کیا گیا تھا۔ ہم نے ان کو اپنا اور اپنے بچوں کا مربی بنالیا۔ مشنریز کو اسکول بنانے اور این جی اوز کو نام نہاد فلاحی ادارے چلانے کی کھلی چھوٹ دی گئی۔ ہمارے ذہین طلبہ کو اسکالرشپ پر بیرون ملک لے جانے پر شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے۔ تعلیم کے راستے یورپی تہذیب تیزی سے سرایت کرتی جاتی ہے۔ ”نوجوان ترک“ جیسی نئی نسل تیار ہوتی جاتی ہے۔ دلفریب ناموں نے مرکزِ خلافت کا خاتمہ کر چھوڑا۔ مغربی تعلیم، مغربی تہذیب کو اور مغربی تہذیب مغرب کے

پروردہ حکمرانوں کو جنم دے رہی تھی۔ ترقی اور آزادی کے نام پر بدترین پسماندگی اور غلامی کا جال بنا جا رہا تھا۔ فری میسنز نے انتظار کیا مسلسل انتظار، خاموشی اور تحمل سے۔ ان کے پاس بہت وقت تھا۔ انہوں نے صدیوں تک برداشت کیا، بالآخر انہوں نے مسلمان خلافت کے سقوط کیسے ایک عورت کے ذریعے وہ کام کر دکھایا جو لاکھوں سپاہی اور ان گنت صلیبی جنگیں نہ کر سکیں۔ اس داستان سے ہمیں کیا پتا چلا؟

☆ ......سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہوا: دشمن کا پہلا وار عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ زن، زر اور زمین میں سے سب سے خطرناک شیطانی ہتھیار ''زن'' ہے۔ پاکستان سمیت عالم اسلام کے بہت سے سابقہ حکمرانوں کی بیویاں یا سیکریٹریاں غیر ملکی تھیں۔ اور ''اتفاقیہ'' طور پر ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھیں۔ انور سادات کی بیوی جہاں سادات، یاسر عرفات کی بیوی سوہا عرفات، اردن کے پورے شاہی خاندان کی بیویوں کی طرح بشارالاسد کی بیوی اسماء اسد سب کی سب امریکی یہودی یا برطانوی عیسائی ہیں۔ انور سادات اور یاسر عرفات کو امن کا نوبل انعام کبھی نہ ملتا اگر وہ ان کافر حسیناؤں کے شوہر نہ ہوتے۔ افغانستان میں کرزئی کے بعد جن مجوزہ حکمرانوں کے نام سامنے آئے ہیں، ان کی بیویاں بھی غیر ملکی ہیں اور ''حادثاتی'' طور پر ان کا سنگ حاصل کر کے رفیقۂ حیات کے منصب پر فائز ہوئی ہیں۔ عبداللہ عبداللہ کے بعد زلمے خلیل زاد کی ناول نگار اور تجزیہ نگار اہلیہ محترمہ ''شیرل بینارڈ Cheryl enard'' امریکی یہودی اور اشرف غنی کی زوجہ صاحبہ لبنانی عیسائی ہے۔ ہمارے ممدوح کپتان جناب عمران خان نسل سے پختون اور غیرت مند تھے لہٰذا برادری کے ہاتھوں استعمال ہونے سے انکار کر کے اس راستے سے واپس چلے آئے، ورنہ برادری نے ان کی شکل میں پاکستان کا تاحیات حکمران ڈھونڈ لیا تھا۔ جناب کے سسر صاحب سر جیمز گولڈ کا تعلق دنیا کے ان سات بڑے یہودیوں سے تھا جو یہودیوں کے ایک

خاص کلب کے ممبر تھے جس میں بیک وقت سامی نسل کے خالص النسب سات افراد چنے جاسکتے ہیں، زیادہ نہیں۔ راقم بوجوہ وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ یہ فتنہ خیز کافر حسینائیں مسلمان شہزادوں، ولی عہدوں کو اپنی زلفوں کا اسیر بنانے کے گُر جاننے کے علاوہ ''کبالا'' نامی بر یہودی سفلی عملیات، جادو، ٹیلی پیتھی اور مسمریزم یا ہپناٹائزم تک کسی حربے کو نہیں چھوڑتیں۔ شراب میں مخصوص مقدار میں دماغ معطل یا سن کرنے والی دواؤں کی ہلکی آمیزش کرتی رہتی ہیں۔ جس کے بعد تو یہ سب حکمران ان کے لیے مکمل تابع فرمان ہوجاتے ہیں۔ اور ایسے ایسے تباہ کن فیصلے کر بیٹھتے ہیں، جن کے متعلق بعد انہیں خود سمجھ نہیں آتا کہ یہ معاہدہ ہم نے کر کیسے لیا؟

☆ ......زنا و شراب، رقص و موسیقی شیطان کے پھندے ہیں۔ اس کے ذریعے سے وہ اور اس کے چیلے انسانوں کو شکار کر کے پہلے اپنا پیروکار پھر اپنا پجاری بناتے ہیں۔ فحاشی و عریانی پھیلانے والے رسالے، چینل، ویب سائٹس، دوستی کلب سب کے سب برادری کا وہ جال ہیں جس سے توبہ کیے بغیر جو جتنا پھڑ کے گا اتنا پھنسے گا۔

☆ ......مغرب کے کچھ تعلیمی ادارے، کچھ مشرقی ممالک کے حکمرانوں اور ان کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کی تعلیم گاہوں کے طور پر مخصوص و معروف ہیں۔ یہاں ان پر خصوصی محنت اور ذہن سازی ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی دم چھلا یا دم چھلن یہیں سے ان کے ساتھ چپک جاتی ہے، یا چپکا دی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے نوجوان جب اپنے ملک جاتے ہیں تو ایسی کھوپڑی میں مغربی نظریات کی زنبیل ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ کی طرح اسلامی ملک کے زوال کے لیے مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مغرب سے مربوط تعلیم گاہیں، تعلیمی ادارے نہیں، اعلیٰ مناصب تک اپنے افراد پہنچانے کی کمندیں اور مقتدر قوت حاصل کرنے کی کارگاہیں ہیں۔ علامہ طاہر القادری اور

جناب فتح اللہ گولن جیسے لوگ بھی اس حربے کو استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ’’پڑھنے لکھنے کے سوا‘‘ کا نعرہ لگانے والے بھی دراصل اسی تھالی کے بینگن ہیں یا اسی تھیلی کے چٹے بٹے۔ اب تو بہت سی دینی جامعات اور اس کے مہتمم صاحبان کے ورثہ پر کھلم کھلا، زبردست محنت سرمایہ کاری ہو رہی ہے تاکہ مستقبل میں ان خاک نشین اداروں کی سمت درست کی جاسکے۔ بیرونی اداروں کے تحت کورس کرنا، مقابلوں میں حصہ لینا بھی اسی قسم کی قومی خدمت ہے۔

☆......نئی نسل کو مغرب کے قائم کیے ہوئے مغربی اسکولوں میں بھیجنا ان کی شرافت، مذہبیت اور مقصدیت سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ خاص کر یورپی ایڈ پروگرام کے تحت طلبہ یا اساتذہ کو اسکالرشپ پر تعلیم کے لیے بھیجنا تو مملکتِ خداداد کو ویسا ہی کھوکھلا کر دے گا، جیسا کہ سلطنتِ عثمانیہ ترک نوجوانوں کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئی۔

یہ چند ناقابلِ فراموش اسباق ہیں جو ہمیں آخری سلطنت خلافت کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتے ہیں۔ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنے والے کے لیے مستقبل کے راستے روشن رہتے ہیں اور اپنے احتساب سے بے خبر ہو کر ہوا کے رخ چلتے رہنے والوں کے لیے کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

پاکستان کو ہم نے کیسا پایا؟

پاکستان کے مدارس کو اپنی سوچ سے بڑھ کر عمدہ پایا

فتح اللہ گولن ترک حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں

پاکستانی علمائے کرام عوامی خدمات بھی سرانجام دیں

اظہارِ خیال: محمد خلیل جیجک، محمد طیب الجی، محمد طٰہٰ باران

انٹرویو پینل: مفتی ابولبابہ، شیخ خلیل الرحمٰن، انور غازی، عبدالمنعم فائز

عربی سے ترجمہ: عبداللہ مدنی

☆ اردگان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عزائم سے کسی کو مطلع نہیں ہونے دیتا، بلکہ کام کرتا ہے۔ باقی سیاسی لوگوں سے اس کی عادت بڑی مختلف ہے۔

☆ مصری فوج پیٹرول صحرا میں ضائع کر دیتی اور عوام کو نہ دیتی۔ جب پیٹرول کا بحران بڑھ گیا تو عوام حکومت کے خلاف سڑکوں پر آ گئی۔

☆ ہم مدرسوں میں جب جاتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے، لیکن باہر عوام کو دیکھ کر خوشی پریشانی میں بدل جاتی ہے۔

☆ پچھلے دنوں ترکی کے علما کا ایک وفد پاکستان کے مدارس کے دورے پر آیا اور یہاں

کے بڑے بڑے مدارس کا تفصیلی دورہ کیا۔ ان علماء کا تعلق ترکی کردستان سے تھا۔ یہ مسلکاً شافعی تھے۔ مختلف شہروں کے مدارس اور جامعات سے تعلق رکھتے تھے۔ جامعۃ الرشید میں ان کا تفصیلی قیام رہا۔ جامعہ کے بہت سے شعبوں کو دیکھنے اور جائزہ لینے کا انہیں موقع ملا۔ اس دوران ان کے ساتھ ایک مفصل نشست ہوئی جس میں ترکی کی موجودہ حکومت، مصر کی صورت حال، شام کا مستقبل اور عالم اسلام کے دیگر مسائل زیر بحث آئے۔ اُردو ترجمے کے ساتھ قارئین کے افادے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔

تینوں ترک مہمانوں کا تعارف کچھ یوں ہے: پہلے مہمان ''محمد خلیل جیجک'' ہیں۔ یہ 1961ء میں پیدا ہوئے۔ جامعہ بنگور میں کلیۃ الالٰہیات کے ذمہ دار ہیں۔ ترکی زبان میں تقریباً 6 کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح کئی مقالے بھی ہیں، جو عربی اور ترکی اخباروں میں چھپتے رہے ہیں۔ ''محمد خلیل جیجک'' کی چند کتابیں یہ ہیں: (1) **ثراء المعنى فى القرآن الكريم مطبوع** 1999ء (2) **دلالة أسماء سور القرآن الكريم مطبوع** 2001ء (3) **عالمية القرآن مطبوع** 2002ء (4) **عالمية القرآن و حضارته** (5) **دروس الأدعية القرآنية و رسالتها** 2012ء۔

دوسرے مہمان کا نام ہے ''محمد طیب الجی''۔ ان کے مختلف مناصب و خدمات حسب ذیل ہیں: ☆ **مؤظف مدرسة أهلية** ☆ **مؤظف رياسة شئون الدينيه** ☆ **مشارک فى مجلس لأمناء رابطة علماء أهل السنة** ☆ **مدّرس اللغة العربية و العلوم الشرعيه** ☆ **بانى: جمعية فى شرق تركيا.**

تیسرے مہمان کا نام ہے ''محمد طہ باران'' ان کی خدمات درج ذیل حوالوں سے ہیں: ☆ **موظف رياسة شؤون الدينية تركيا** ☆ **إمام و خطيب مسجد** ☆ ایک مدرسہ کے ذمہ دار بھی ہیں۔

☆☆☆

شیخ محمد خلیل جیجک کا پیغام:

پاکستانی بھائیوں سے ایک گزارش کرنا چاہوں گا کہ وہ عوام کا خیال کرنے کی طرف خاص توجہ دیں۔ صرف مدارس میں محصور ہو کر نہ رہیں تاکہ عوام اور علماء میں خلا پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمیں یہاں گندگی کے اتنے بڑے بڑے ڈھیر نظر آئے جس سے نہ صرف انسان کو بلکہ جانوروں کو بھی ایذاء پہنچتی ہے۔ اس لیے علماء ہی کسی قوم کے راہبر ہوتے ہیں، انہی کی تعلیمات پر عوام عمل کرتے ہیں۔ ترقی کے اس زمانے میں مسلمانوں کو ایسی باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

شیخ محمد طیب الجی کا پیغام:

ہم آپ کے پاس اس لیے آئے تاکہ آپ کے مدارس کا نصاب لے جاسکیں اور اپنے مدارس میں رائج کریں۔ ہم یہ سنتے تھے کہ پاک و ہند کے مدارس بہت اچھے انداز میں پڑھاتے ہیں، لیکن جب ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اپنی سوچ سے بہت بڑھ کر پایا۔ ہمیں یہ مدارس دیکھ کر دلی سکون اور اطمینان ہوا ہے۔ ہماری اس خوشی کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ البتہ میں اس موقع پر ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ جو کچھ ہم نے بازاروں میں دیکھا۔ اس سے بڑے پریشان ہوئے۔ پاکستانی عوام کی غربت ان کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔ ان دو دنوں میں ہمارے دل کی کیفیت بدلتی رہی۔ ہم مدرسوں میں جب جاتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے، لیکن باہر عوام کو دیکھ کر خوشی پریشانی میں بدل جاتی ہے۔ ہم آپ کی محنتوں کی قدر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مزید برکت کی دعا کرتے ہیں۔

شیخ محمد طٰہٰ باران کا پیغام:

ہم نے پاکستانی مدارس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن دیکھنے والا سننے والے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ خود دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم ایرپورٹ سے جب دارالعلوم کراچی پہنچے تو راستے میں عوام کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ امت اسلامیہ کو یہ فقر اور احتیاج جچتا نہیں، لیکن جب مدرسے میں داخل ہوئے تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ مکہ یا مدینہ میں آ گیا ہوں۔ آپ مدرسے سے باہر کی دنیا کو بھی بہتر بنائیں۔ ان شاء اللہ ہم اس نہج کے مدارس ترکی میں بھی بنائیں گے۔

☆☆☆

☆ ....آپ کو پاکستان دیکھنے کا شوق کیسے ہوا؟

◈ .... میں اس سوال کے جواب سے پہلے ایک تمہیدی بات کہنا چاہوں گا۔ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد جب سیکولرازم اور ان کے ہم نواؤں کا غلبہ ہوا، انہوں نے جہاں اور بہت نقصان پہنچائے، سب سے بڑا نقصان دینی اقدار و شعائر کو پہنچایا۔ مدارس دینیہ جو عوام کی دینی ضروریات پوری کر رہے تھے، انہیں کلی طور پر بند کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ”وحدة التعلیم“ کے نام سے ایک نیا قانون اور نظام تعلیم متعارف کروایا۔ جس میں دینی تعلیمات پڑھانے پر مکمل پابندی تھی۔ یہاں تک کہ عربی نصوص پڑھانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اسی وجہ سے ترکی عوام دینی علوم سے آہستہ آہستہ ناواقف ہوتے چلے گئے، چنانچہ آج پورے ملک میں کوئی ایسا عالم دین نظر نہیں آتا جو عوام کی مشکلات کا صحیح حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کر سکے۔ ان حالات میں ”کردوں“ کے دیہاتی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے مدارس میں چھپ کر کچھ نہ کچھ دینی علوم پڑھائے جاتے تھے، لیکن حکومت ان مدرسوں کو بھی وقتاً فوقتاً پتا چلنے پر بند کرا دیتی۔ دینی علوم پڑھانے کی اجازت صرف حکومت کے منظور شدہ اداروں میں تھی۔ جس کی وجہ سے عوام کو دینی علوم کے

میدان میں بڑی مشکل اور بے بسی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن 2002ء سے اردگان کی حکومت آنے کے بعد حالات میں کافی بہتری آئی۔ اردگان حکومت نے عوام کو ہر طرح کی آزادی دی۔ اللہ کا شکر ہے آج ترکی کے عوام اس آزادی سے مستفید ہو رہے ہیں اور لادین طبقہ خود بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حالات میں بہتری آنے کے بعد ہمارے مدارس میں دوبارہ حرکت پیدا ہوئی۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد مدارس کا رخ کرنے لگی۔ دوسری جانب پورے ملک میں پھیلی یونیورسٹیوں میں جو علوم شریعہ پڑھائے جاتے ہیں، وہ طلبہ کی کمزور استعداد کی وجہ سے عوام کی دینی ضروریات کو پورا نہیں کر رہے۔ نصاب میں فلسفہ غالب ہے۔ دین کے نور اور عمل سے دور ہیں۔ ایسے حالات میں ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ترکی میں مدارس دینیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ نسل نو کو اس بحران سے بچایا جا سکے۔ پس اس نکتۂ نظر سے ہم نے پاک و ہند کے مدارس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ وہاں سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور سہارنپور سے بڑے سپوت پیدا ہوئے۔ ہم نے پاکستان میں مدارس کے بارے میں بھی سن رکھا تھا کہ مدارس کا نظام بہترین ہے۔ اس لیے ہم نے پاکستان آنے کا اور مدارس کی زیارت کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆ .... آپ پاکستان میں کیا مقاصد واہداف لے کر آئے؟

◈ .... اس دورے میں ہم جاننا چاہیں گے مدارس کے قوانین، ان کو پڑھایا جانے والا نصاب، طلبہ کی استعداد اور ان میں پڑھائے جانے والے مختلف علوم۔ مزید یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا صرف علوم دینیہ پڑھاتے ہیں یا دنیاوی علوم کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے؟ میں پوری وضاحت سے کہنا چاہوں گا ہمیں یہ مدارس اپنے تصور سے بہت اونچے نظر آئے۔ ہم نے مدارس کی تربیت، ان کے طلبہ کا اخلاق وسلوک نہایت عمدہ پایا اور جیسا کہ

آپ کو معلوم ہے یونیورسٹیوں میں جو علوم دینیہ پڑھائے جاتے ہیں وہ نور سے خالی ہوتے ہیں۔ جبکہ ان علوم کو پڑھانے کا مقصد ہی اخلاق وسلوک سکھانا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اچھے اخلاق ہی سے انسان دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ہمیں یہاں مدارس کے طلبہ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ اچھی علمی استعداد کے مالک ہیں۔ مختلف علوم پڑھنے سے ان میں فکری تنوع پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو مدارس باقی ہیں ان میں صرف، نحو، منطق، عربی لغت اور فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ جبکہ الحمدللہ یہاں ایسا نہیں ہے۔

☆ .... سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد جب مدارس بند کر دیے گئے تو آپ لوگوں نے دینی تعلیم کیسے حاصل کی؟

◈ .... : جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ حکومت نے جب مدارس دینیہ پر پابندی لگا دی تو کچھ مدارس دینیہ غیر قانونی اور خفیہ طور پر قائم تھے۔ یہاں پر اپنے والد صاحب کا ایک قصہ ذکر کرنا چاہوں گا۔ میرے والد صاحب محکمہ صحت میں سرکاری ملازم تھے۔ ان کی ڈیوٹی دور دراز پہاڑوں میں ہوتی تھی۔ ان کے بقول قریب ترین پولیس اسٹیشن ہم سے چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس کے باوجود امام مسجد بچوں کو مسجد میں قرآن نہیں پڑھا سکتا تھا۔ صبح طلوع شمس کے بعد امام صاحب بچوں کو لے کر پہاڑوں کے دامن میں موجود ایک غار میں چلے جاتے تھے۔ شام تک وہیں پڑھاتے۔ سورج غروب ہو جانے کے بعد اندھیرے میں بچے اکیلے اکیلے اپنے گھروں کو جاتے۔ یہ حال دیہات کا تھا، جہاں حکومتی نگرانی کم ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا عربی پر مکمل پابندی تھی۔ اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ورق مل جاتا، جس میں عربی عبارت لکھی ہوتی وہ گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ میرے والد صاحب باشرع تھے۔ ایک بار انہوں بتایا کہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ مجھے پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ میری تلاشی لی تو جیب سے مواقیت الصلوۃ کا چارٹ نکلا۔ پولیس افسر نے مجھے کہا کہ

قرآن کے طالب علم لگتے ہو۔ اس پر میں کافی عرصہ جیل میں رہا۔ وہ فرماتے ہیں: ہم دینی نصوص جانوروں کے باڑوں میں چھپ چھپ کر یاد کرتے تھے۔

☆ ....اگر ترکی کے عوام آج دینی علوم سیکھنا چاہیں تو کس طرح یہ ممکن ہوگا؟

◈ ....ابھی بھی مشکلات ہیں۔ اب بھی کوئی بچہ جب تک ایف اے گورنمنٹ کے اداروں سے نہ کرے اسے اس وقت تک دینی علوم پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر تدریس کے مراحل و مشکلات ہیں۔

☆ ....ان دنوں تو حکومت اسلام پسند لوگوں کے پاس ہے، پھر یہ پابندیاں کیسی؟

◈ ....اگرچہ حکومت اسلام پسندوں کی ہے، لیکن وہ سب قوانین تبدیل نہیں کرسکتی۔ بہت سارے قوانین ہیں جو باوجود چاہنے کے وہ تبدیل نہیں کرسکتے۔

☆ .... پاکستان میں ’’پاک ترک اسکول‘‘ کے نام سے ایک جال بچھا ہوا ہے، آپ ان کے بانی فتح اللہ گولن کے بارے میں کیا کہیں گے؟

◈ ....: فتح اللہ گولن صاحب نے ترکی کے پرانے مدارس میں تربیت پائی۔ ابتدا میں انہوں نے ترکی کے عالم ربانی بدیع الزمان سعید النورسی کے اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے ان کے افکار اور ان کی کتابیں پڑھانا شروع کیں۔ پھر جب متبعین کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اپنی جماعت کے لیے نئے قوانین مرتب کیے۔ ’’رسائل النور‘‘ نامی لٹریچر سے انہیں کافی مقبولیت ملی۔ اس میں نئے نئے نصاب متعارف کرائے۔ شروع میں ان کی یہ خواہش تھی کہ ترکی کے اسکول کو پورے عالم اسلام میں ہونا چاہیے، جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مغربی دنیا سے ان کا کافی گہرا تعلق ہے۔ خصوصاً امریکا اور اسرائیل کے ساتھ کافی معاہدے اور اچھے تعلقات ہیں۔ اس وقت

ترکی میں فتح اللہ گولن کی تحریک اردگان حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے ہے۔ حالانکہ اس حکومت نے ترکی کے کافی مسائل حل کیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حکومت سے کچھ مطالبات کیے جسے حکومت نے تسلیم نہیں کیا، اس دن سے یہ حکومت کے مخالف ہیں اور کئی بار حکومت گرانے کی کوشش کر چکے ہیں۔ یہ درحقیقت یہودی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ اللہ تعالی ان کے شر سے ترک عوام کی حفاظت فرمائے۔ ہمارے ہاں 30 مارچ کو بلدیاتی انتخابات ہو رہے ہیں۔ گولن ہم نواؤں کی کوشش ہے کہ اردگان کی حکومت دوبارہ نہ بنے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ ہم لوگوں کے لیے جو کچھ اردگان کر رہا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کرے گا۔

☆ ....عوام کا تعلیم کی طرف کس قدر رجحان ہے؟

◈ .... چونکہ گذشتہ نوے سال سے تقریبا ترکی عوام دینی علوم کی بہاروں سے محروم اور پیاسے تھے۔ اس لیے عوام کو جب بھی کوئی ایسا موقع ملا اس نے ضائع نہیں کیا۔ نوے کی دہائی میں پورے ترکی کی یونیورسٹیوں میں دینی علوم پڑھانے کے لیے صرف بیس شعبے مختص تھے اور ان میں دو ہزار سے زائد طلبہ نہ تھے۔ الحمد للہ اس وقت ان شعبوں کی تعداد 90 سے زائد ہو چکی ہے اور تقریباً ہر یونیورسٹی میں دینی علوم کا ایک شعبہ قائم ہو چکا ہے۔ طلبہ کی تعداد بھی پندرہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ اس لحاظ سے الحمد للہ طلبہ کی رغبت شرعی علوم کے حصول میں کافی بڑھ گئی ہے، لیکن میں ایک بات کہنا چاہوں گا چونکہ اتنا عرصہ پابندی رہی اس لیے جو بنیاد تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لیے آزادی اور پابندی ختم ہونے کے بعد جو نتائج آنے چاہییں تھے وہ نہیں آ رہے۔ طلبہ کی علمی استعداد بھی کوئی قابل رشک نہیں۔

☆ ....بحیثیت لیڈر طیب اردگان کے لیے تین مرتبہ الیکشن جیتنا کیسے ممکن ہوا؟

◈ ....طیب اردگان صحیح معنی میں فلاحی سیاست کرنے والا ایک سیاسی آدمی

ہے۔ اس کی تربیت سیاسی ماحول میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ استنبول کا میئر بھی رہ چکا ہے۔ وہ مرکزی حکومت میں آنے سے پہلے بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ اس نے نوّے کی دہائی میں بھی کافی کام دینی لحاظ سے کیا جس سے اسلام پسند طبقے کی حمایت اس کے ساتھ ہوگئی۔ اردگان کی حکومت آنے کے بعد اس نے بڑے صبر و تحمل سے کام کرنا شروع کیا۔ تاکہ اندرونی و بیرونی سازشوں کا مقابلہ بآسانی کر سکے۔ دوسری بات جس کی طرف اردگان نے بڑی توجہ دی وہ عوام کی خدمت ہے۔ اردگان حکومت سے پہلے ترکی عوام بہت سی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ بے روزگاری، ناخواندگی، ہسپتالوں کی نایابی اور شہروں میں صاف و ستھرائی کا انتظام نہ ہونا وغیرہ طیب اردگان نے ان مشکلات کو ختم کرنے کے لیے اپنا دن رات ایک کیا اور ان پر بڑے مؤثر انداز میں قابو پایا۔ اس وقت ترکی میں ہسپتالوں کی حالت قابل دید ہے۔ مریضوں کا مکمل خیال رکھا جاتا اور ادویات مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اسی طرح مریضوں اور معذروں کے لیے ماہانہ تنخواہیں مقرر ہیں۔ غرض، حکومت ہر محتاج کی مدد کرتی ہے۔ اس لیے ترکی کے عوام طیب اردگان کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ اردگان نے ملکی معیشت کو بڑا مستحکم کیا ہے۔ بارہ سال قبل جب اردگان حکومت آئی تو ماہانہ اوسط آمدنی ایک ہزار ڈالر تھی جو اب 11 ہزار ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ ترکی کے تمام سرکاری اداروں کی حالت بہتر کی گئی ہے۔ اردگان حکومت سے پہلے ٹریفک کا نظام بڑی مشکلات کا شکار تھا۔ سڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ پورے ملک میں دو ہزار کلومیٹر پکی سڑکیں تھیں جو اب سترہ ہزار کلومیٹر تک ہو چکی ہیں۔ جہازوں کا کرایہ مہنگا ہونے کے سبب سفر کرنا ایک خواب تھا۔ اس وقت ترکی کے غریب لوگ بھی انقرہ سے استنبول جہاز پر سفر کرتے ہیں۔

☆...........آپ کیا سمجھتے ہیں کہ طیب اردگان آنے والے الیکشن میں بھی جیت جائے گا؟

◈ ....میں سمجھتا ہوں ان شاء اللہ اردگان اگلا الیکشن بھی جیت جائے گا۔

☆..........آپ کس بنیاد پر ایسا سمجھتے ہیں؟

◈ ....اس کی وجہ یہ ہے کہ اردگان نے عوام کو بہت آزادی دی ہے۔ مساوات کا بڑا خیال رکھا، تمام لوگ آزادی میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی طرح اردگان نے جو بڑی مشکل حل کی ہے وہ کرد عوام کو حقوق دینا ہے۔ کردوں کی مشکلات چھوٹے پیمانے کی نہ تھیں بلکہ بڑے بڑے سازشی ملک اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس کام میں اردگان کی حکومت بھی جا سکتی تھی، لیکن اردگان نے بڑی حکمت کے ساتھ اس پر قابو پایا۔ اگر چہ پورے طور پر ابھی تک یہ مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ لیکن وہ اپنی سی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہے۔

☆..........طیب اردگان نے کرد قوم کو اپنا حامی کیسے بنایا؟

◈ ....جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اردگان نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور بڑی حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ مجھے یاد ہے اسّی اور نوے کی دہائی میں کرد زبان بولنے پر پابندی تھی۔ ایک مرتبہ طالب علمی کے دور میں میں نے ایک PCO سے گھر فون کیا، میں کردی میں بات کر رہا تھا، اتنے میں ایک آدمی آیا اس نے کہا کردی میں بات کر رہے ہو؟ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ''کرد زبان'' بولنا منع ہے۔ اسی طرح کردی نظمیں، لٹریچر ہر چیز پر پابندی تھی۔ اردگان نے حکومت سنبھالنے کے بعد کرد قوم کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد ایک بار اردگان نے بیان دیا: ''ہم کرد قوم کی مشکلات سے ناواقف نہیں ہیں۔'' یہ بیان سابقہ سیاسی لوگوں کے موقف سے بڑا مختلف تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے کرد قوم کے متعلق جب بھی کوئی بات کرتا تو صرف دہشت گرد قوم کا تصور پیش کرتا۔ کرد قوم ہمیشہ اپنا دفاع کرتی۔ اردگان نے یہ بیان دے کر اپنے لیے راستہ ہموار

کیا۔ دوسرے مرحلے میں کرد قوم کے وجود کو منوایا۔ ترک لوگ یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ کرد ہمارے بھائی ہیں۔ کرد قوم ترکی کے عوام کا 20 فیصد ہیں۔ ظاہر ہے ان کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کرد قوم کے وجود کا بالکل انکار کرتے تھے۔ تیسرے مرحلے میں ایک چینل کھولا گیا جس میں چوبیس گھنٹے کرد زبان میں پروگرام نشر ہونے لگے۔ اس تدریج سے اردگان اس مشکل پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت کرد بڑے سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اردگان کی اسلامی سوچ کے پیش نظر مخالفین بھی ہیں۔ جن میں لادین طبقہ اور کچھ مغربیت پسند لوگ ہیں جو اردگان کو نہیں دیکھنا چاہتے۔ شاید اردگان عالم اسلام کا پہلا لیڈر جو صہیونی طاقتوں کے سامنے نہیں جھکا۔ ایک اجلاس کے دوران اردگان نے اسرائیلی وزیراعظم سے کہا: ’’تم بے گناہ لوگوں کو قتل کرتے ہو اور بچوں کے خون کے پیاسے ہو۔‘‘ پوری صہیونی دنیا میں لرزا برپا ہو گیا کہ ایک مسلم لیڈر کو کیسے جرأت ہوئی اسرائیلی وزیراعظم کو ان الفاظ سے مخاطب کرے؟ اردگان نے کئی معاملات میں اسرائیل کو ترکی سے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے یہودی ترکی حکومت سے بڑے خوف زدہ ہیں۔

☆ ....آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اردگان یہ سب کچھ سیاسی مقاصد کے لیے کر رہا ہے یا اس کے ذریعے وہ اسلام اور اسلام پسند طبقے کو آگے آنے کا موقع دے گا؟

◈ ....اردگان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عزائم سے کسی کو مطلع نہیں ہونے دیتا، بلکہ کام کرتا ہے۔ باقی سیاسی لوگوں سے اس کی عادت بڑی مختلف ہے۔ اردگان نے کبھی ایسی بات نہیں کہی جسے وہ نہ کر سکتا ہو۔ اس نے جو کچھ کہا اسے کر دکھایا۔ اس لیے ترکی کے عوام اس کی کارکردگی سے بڑے مطمئن ہیں۔ وہ ترک عوام کی اخلاقی و علمی کمزوری کو جانتا ہے، جس کے لیے اس کے پاس ضرور حل ہو گا۔

☆............ ترکی کے موجودہ بحران کے حوالے سے جو لوگ اردگان حکومت کو گرانا چاہتے ہیں ان کی تعداد کتنی ہے؟ وہ کیوں ایسا کرنا چاہتے ہیں؟

◈............ جی بالکل! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ایسی حکومت کی مخالفت کرنا جو عوام کی خدمت میں مخلص اور حقوق کا خیال رکھے۔ آزادی کا دروازہ ہر کسی کے لیے کھلا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مخالفین کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ اردگان کے مخالف کیوں ہیں؟ چاہیے تو یہ تھا کہ سب وزیر اعظم کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اسے ہر موقع پر کامیاب کراتے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں کی تعداد اس قدر نہیں ہے کہ وہ انتخابات جیت جائیں۔ ترکی کے عوام اردگان کو دوبارہ کامیاب کرائیں گے۔ ان شاء اللہ!

☆............ اردگان نے اقتصادی و معاشی بحران پر کیسے قابو پایا؟ سنا ہے ترکی میں معدنی ذخائر تو کم پائے جاتے ہیں؟

◈............ اس کے حل کے لیے اردگان نے تین کام کیے: پہلا یہ کہ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کیں جو اقتصادی امور میں ماہر تھے اور وسیع تجربے کے حامل تھے۔ خود ان کے بینک بیلنس کروڑوں اربوں میں تھے۔ جیسے علی بابا جان وغیرہ۔ دوسرا کام یہ کیا کہ رشوت ستانی پر قابو پایا۔ ملکی خزانے کی ایک بڑی مقدار جو ضائع ہو جاتی تھی، خزانے میں جمع ہونا شروع ہوئی۔ تیسرا یہ کہ ملکی سطح پر بڑی بڑی فیکٹریاں لگائیں جس سے معیشت مضبوط ہونا شروع ہوئی۔ میں یہاں یہ بات کہنا چاہوں گا کہ ترکی کے بارے میں جیسا کہ مشہور ہے وہاں معدنیات نہیں ہیں، یہ غلط ہے۔ ترکی معدنیات کے ذخائر سے مالا مال ہے البتہ سابقہ حکومتوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ موجودہ حکومت نے معدنیات نکالنے پر کام شروع کیا ہے۔

☆............ آپ اپنے پڑوسی ملک شام کے مسئلے کے بارے میں کیا کہیں گے؟

◈ .... بے شک شام کے مسلمان ایک بڑے امتحان سے گزر رہے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں: ایک، یہ کہ مغربی دنیا یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اسلام پسند طبقہ برسر اقتدار آ جائے گا۔ اور وہ اسلام پسندوں کو اقتدار میں کبھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ جتنے بے گناہ لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے وہ اس پر راضی ہیں لیکن اقتدار مسلمانوں کے پاس ہو وہ ان کو قبول نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں صدر مرسی کی حکومت جمہوریت کے ذریعے وجود میں آئی اور مصر کی سو سالہ تاریخ میں پہلی بار شفاف انتخابات ہوئے۔ مرسی 58 فیصد ووٹ لے کر اقتدار میں آیا۔ اس کے باوجود مرسی کے حکومت سنبھالتے ہی صیہونیت نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ مصری فوج پیٹرول صحرا میں ضائع کر دیتی اور عوام کو نہ دیتی۔ جب پیٹرول کا بحران بڑھ گیا تو عوام حکومت کے خلاف سڑکوں پر آ گئی۔ ہم شام پر بات کر رہے تھے تو اسی وجہ سے مغربی دنیا شام کے قتل عام میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی۔ انہیں معلوم ہے لڑنے والے اسلام پسند ہی ہیں۔ دوسری وجہ ایران کو مضبوط کرنا ہے۔ مغربی مما لک ایران کو کبھی کمزور نہیں ہونے دیں گے۔ تیسری وجہ یہ کہ شام میں قتل و غارت گری جاری رہے تا کہ ترکی کمزور ہو۔ ترکی کے قرب و جوار میں جتنا فساد رہے گا، وہ اسی قدر کمزور ہو گا۔ چوتھی وجہ میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ شام میں کوئی معدنی ذخائر بھی نہیں ہیں جس کی مغربی دنیا کو لالچ ہو اور وہ وہاں امن کی خواہاں ہو۔ ان بنیادوں پر شام کے مسلمان خالص دہشت گردی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

تین مسائل تین سبق

ترکی کی معاصر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مسائل تین تھے، ‘‘حسنِ اتفاق’’ سے ہمارے مسائل بھی وہی تین ہیں۔ انہوں نے جس طرح سے اسے حل کیا، اس سے تین سبق ملتے ہیں۔ ‘‘سوئے اتفاق’’ ہے کہ ہم انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ترکی کی ترقی کے چند سطحی مظاہر (بس، ٹرین، صفائی کی گاڑیوں، خوبصورت فٹ پاتھوں وغیرہ) پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر تحریر میں ...... جو اس سلسلے کی اختتامی تحریر ہے...... ہم مسائل اور اسباق کی تینوں اقسام پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

ترکی کے اسلام پسند 1995ء میں استاد نجم الدین اربکان کی قیادت میں برسرِ اقتدار آگئے تھے، لیکن 1996ء میں فوج نے ان کا تختہ الٹ کر ان کی جماعت رفاہ پارٹی پر پابندی لگادی۔ اس سے پہلے جب وہ اقتدار میں نہیں تھے، پہلے ‘‘ملّی نظام پارٹی اور پھر ‘‘ملّی سلامت پارٹی’’ کے نام سے کام کر رہے تھے۔ تب بھی ان پر پابندی لگ چکی تھی۔ ترک فوج نے ‘‘نیشنل سکیورٹی کورس’’ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے جس کی آڑ میں زمامِ اقتدار ترک فوج اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ یہ کونسل اسلام پسندوں کو کسی شکل اور کسی انداز میں چلنے نہ دیتی تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہمارے یہاں کے ایک قبضہ گیر حکمران جنہوں نے آتے ہی

آدھی آستینوں والی بغل میں دو کُتّا بچے پکڑ کر تصویر کھنچوائی تھی اور فرمایا تھا کہ کمال اتاترک ان کے لیے مثالی شخصیت ہے۔ انہوں نے اتاترک کے انداز میں ایسا ادارہ یہاں بھی بنانے کی کوشش کی تھی، مگر ناکام رہے۔

استاذ اربکان نے نئی پہچان سے میدان میں واپس آتے ہوئے ''فضیلت پارٹی'' بنائی، جس پر 2001ء میں پھر پابندی عائد کردی گئی۔ اس چوتھی پابندی پر اسلام پسندوں میں سے ایک ذہین نوجوان طیب اردگان نے مسائل کی جڑ کو سمجھ کر اپنے لیے الگ راستہ منتخب کیا۔ جب مسائل کی بنیاد حل ہوگئی تو وہ بعد کے تین ضمنی مسائل کی طرف آ گیا اور ان کو حل کرنے میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ آج تک نہ تو کوئی اس پر پابندی لگا سکا ہے اور نہ عوام اس کا ساتھ دینے سے پیچھے ہٹے ہیں۔

مذہبی ترکوں کا سب سے بڑا مسئلہ فوج اور اس کی پشت پر موجود مغربی ممالک تھے جو ان کے اسلامی ناموں سے چڑتے اور ان کی ترقی سے خائف تھے۔ اردگان نے فوج سے الجھنے یا سرمایہ دار مغرب سے ٹھاننے کے بجائے دامن کانٹوں سے بچا کر سیدھی سمت سفر جاری رکھا۔ اس نے اپنی جماعت کا نام سعادت یا فضیلت پارٹی کے بجائے ''ترقی وانصاف پارٹی'' رکھا۔ ایسا نام عموماً سیکولر پارٹیاں رکھتی ہیں۔ لیکن اس نام کے اندر چھپے کام کو تن دہی سے انجام دینے پر اسے سعادت وفضیلت بھی حاصل ہوگئی اور اسلام پسندوں کے علاوہ لادین، بے دین یا درمیانے قسم کے ترکوں کی دلی حمایت بھی ساتھ ہوگئی۔ اسلامی ریاست کے سربراہ کا پہلا فرض عوام الناس کو ترقی اور انصاف فراہم کرنا ہے۔ یعنی دینی و دنیاوی ہر طرح کی ترقی اور ہر سطح پر کھلا اور دوٹوک انصاف۔ صرف نام بدلنے سے اس نے اصل مسئلے اور ضمنی تین بڑے ضمنی مسائل کا حل نکالنے کے ساتھ اپنے کارکنوں کے لیے ترکی جیسے مغرب زدہ ملک میں لادین قوتوں کے ساتھ جاری معرکے میں درست سمت متعین کردی۔ اس کی

ذہانت کو داد دیے بغیر رہا نہیں جاتا، جب انسان دیکھتا ہے کہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے ایک طرف تو بظاہر کھلے ڈلے اسلامی نام اور مذہبی نعرے کے بجائے ایسا نام منتخب کیا جو قوم اور مغرب کو برافروختہ نہ کرے، لیکن دوسری طرف اپنے کارکنوں کو یہ ذہن دے کہ تم نے ملک اور عوام کی ترقی کے لیے جُت جانا ہے، اور خود سے بھی اور دوسروں سے بھی کڑا انصاف کرنا ہے۔ آیندہ نہ کوئی ملکی ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے ٹیکس چھپائے، نہ ملکی وسائل کو ضائع کرے یا قومی آمدنی میں خیانت کر کے اور نہ بے انصافی کرتے ہوئے ناجائز سفارش کرے، اور کسی نااہل کو قوم پر مسلط کر کے اپنی قربانیوں کا عوض اللہ سے لینے کے بجائے ہم سے اس کا بے جا مطالبہ کرے۔ تصور کیجیے! ایک نام کے اندر سو پیغام اور ایک دنیوی عنوان کرنے کیہزار دینی کام چھپے تھے۔ فوج اور مغرب سے پنجہ آزمائی کے بعد ترکی کے اصل دنیوی مسائل تین تھے: ۱- ملک بدترین معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ اخراجات زیادہ اور آمدنی بہت کم تھی۔ ۲- قومی محصولات وصول نہ ہو پاتے تھے۔ ٹیکس چوری عام تھی۔ طبقہ اشرافیہ سے کوئی ٹیکس نہ لے سکتا تھا اور عوام الناس دیتے نہ تھے۔ ۳- بدعنوانی کے دیمک نے ترکوں کو اندر سے چاٹ رکھا تھا۔ اس میں ہر طرح کی بدعنوانی شامل تھی۔ ناجائز سفارش، غیر قانونی بھرتیاں، غبن، رشوت، خیانت۔ غرض بدیانتی کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو ترک معاشرے میں سیکولر نظام نے رائج نہ کی ہو۔

طیب اردگان نے تمام مذہبی تحریکوں سے منفرد راستہ اختیار کرتے ہوئے اسلام کا نام نہ لیا، لیکن کام سارے کٹر بنیاد پرستوں والے کیے۔ قوم کو محنت و ایمانداری اور عدل و انصاف کی فراہمی کے ساتھ غیر ضروری اخراجات فوراً کم کر دیے۔ امتیازی مراعات روک دی گئیں۔ وزراء کی تعداد کم کر کے انہیں سادگی کا نمونہ بن جانے کا سبق پڑھایا۔ بین الاقوامی تجارت کو اتنا فروغ دیا کہ گذشتہ ادوار میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ٹیکس دہندگان کے لیے

سہولتوں اور مراعات کا اعلان اور نادہندگان کے لیے سخت قوانین نافذ کیے۔ عوام کا اعتماد بڑھایا کہ آپ ریاست کو اس کا حق دیں، وہ غبن ہونے کے بجائے واپس شہریوں پر لگے گا۔ صرف چار سالوں میں خسارے کا بجٹ منافع کے بجٹ میں تبدیل ہو گیا۔ مرد بیمار اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگا۔ آئی ایم ایف کے چنگل سے ایسا نکلا کہ یہ سود خور اور خون نچوڑ ادارہ ترکی سے پانچ ارب ڈالر قرض لینے کی سوچ رہا ہے۔ ترقیاتی کام اتنی تیزی سے ہوئے گویا جنات حرکت میں آ گئے ہیں۔ ایئرپورٹ 26 سے 50 ہو گئے۔ 2003ء سے 2011ء تک تقریباً 13500 کلومیٹر ایکسپریس وے تعمیر ہوئی جس سے حادثات 60 فیصد کم ہو گئے۔ صحت کو مفت یا سستا کر دیا گیا۔ معمر شہریوں کو وہ سہولتیں دی گئیں جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تعلیم کا بجٹ 7.5 بلین سے 34 بلین کر دیا گیا۔ درسی نصاب مفت کر کے ہر صوبے کو یونیورسٹی کے معاملے میں خود مختار کر دیا گیا۔ سیکولروں کی بدعنوانی کے ہاتھوں ستائی ہوئی ترک قوم کے لیے بنیادی انسانی ضرورتوں کی فراہمی کو اسلام پسندوں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ لوگوں کو تبدیلی اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ ترکوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ترقی اور انصاف کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو خصوصاً بدعنوانی اور محصولات چوروں کو ختم کرنے میں اردگان کا ساتھ دیں گے۔ چاہے وہ اسلام لائے یا خاموش اسلام کے راستے پر چلتا رہے۔ اردگان کا سفر ریاستی حقوق کی ادائیگی کے حوالے سے تیز ترین تھا، مگر ریاستی فرائض نافذ کرنے کے حوالے سے نرم و دل گیر۔ کامیابی کا تناسب حیرت انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

سبق ہمیں اس سے یہ ملتا ہے کہ مخالف قوتوں سے نمٹنے کا ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ وہ مزید بڑھکنے اور آتش گیر ہونے کے بجائے یا راستہ چھوڑ دیں یا ہم نوا ہو جائیں۔ پوری تیاری سے پہلے ان کے خلاف کھڑا ہونے یا ان کو اپنے خلاف کھڑا کرنے کے بجائے کام میں مگن

رہا جائے۔ اپنے بارے میں خوش فہمی اور سامنے والے کے بارے میں غلط فہمی سے بچا جائے۔ اپنی استعداد کا غلط اندازہ یا مقابل کی طاقت کا غیر حقیقی جائزہ واپس دھکیل کر وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔

یاد رکھنے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ عوام کی خدمت کے لیے ان کو وہ ریاستی حقوق اور بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں جو ان کا شرعی اور اسلامی حق ہے۔ ریاست وہ دینی ذمہ داریاں پوری کرے جو خلافت فاروقی کی پہچان ہیں اور عوام کا دل موہ لیتی ہیں۔ پھر آپ اسلام کا نام لیں یا نہ لیں، نعرہ لگائیں یا نہ لگائیں، لوگ آپ کے ساتھ اسلام سے بھی ازخود محبت کریں گے۔ پھر جتنا آپ ان کو احکام شرعیہ کے دائرے میں لائیں گے، وہ اسے اپنا فرض سمجھ کر آتے جائیں گے۔

آخری سبق یہ کہ تحریکی کارکنوں کو صاف ہاتھ اور صاف دامن رہنا چاہیے۔ ان کی دیانت، احتیاط اور مشتبہات سے دوری عوام میں ایسا اعتماد پیدا کرتی ہے کہ وہ چندہ بھی دیتے ہیں بندہ بھی۔ جان بھی دیتے ہیں اور آن بھی قربان کرتے ہیں۔ وہ وقت آجاتا ہے کہ لوگ ایک روپیہ عشر یا خراج چھپانے کو، یا بیت المال سے ایک درہم کی چوری کو ریاست کے ساتھ غداری اور اسلام سے منافقت سمجھتے ہیں۔ لوٹنے والے لٹانے والے اور لینے والے دینے والے بن جاتے ہیں۔ سفارش اور رشوت دو ایسے ناسور ہیں جن سے مذہبی تحریکوں کو پاک صاف ہونا چاہیے تاکہ وہ معاشرے کو تطہیر کے عمل سے گذاریں تو بدعنوانی کا عادی مجرم جرّاحی کے اس تکلیف دہ عمل پر اس لیے تیار ہو جائے کہ خود مسیحا اس عمل سے گزر چکا ہے۔ اگر سربراہ اور نظریاتی کارکن اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھنے پر تیار ہوں تو شہری اور عوام ایک پتھر باندھنے پر خوشی خوشی تیار ہو جاتے ہیں۔

الغرض! تیاری کے بغیر طاقتور سے ٹکرانے سے اجتناب، دیانت و امانت کا اعلیٰ

معیار قائم کرنے اور عوام کے معاشرتی مسائل و عملی مشکلات دور کرنے پر اتنا زور دینا جتنا دوسرے مظاہر دین پر دیا جاتا ہے اور اسے بھی دین کا حصہ سمجھنا، وہ تین سبق ہیں جو ہمیں معاصر مذہبی تحریک کے تجزیے و مشاہدے سے ملتے ہیں۔

کیا یہ ''حسنِ اتفاق'' ہے کہ ہم انہی مسائل میں گھرے ہوئے ہیں جن میں تُرک اسلام پسند ہم سے زیادہ شدت سے گھرے ہوئے تھے؟ پھر کیا یہ محض ''سوئے اتفاق'' ہے کہ ہم نہ اپنی ناکامیوں سے سبق لیتے ہیں نہ دوسرے کی کامیابی سے کچھ سیکھتے ہیں؟ اس دنیا کے کام اتفاقات سے نہیں ہوتے، تکوینی قوانین کے تحت ہوتے ہیں اور قوموں کی تقدیر پر وہی تکوینی قانون لاگو ہے جس کا بہت پہلے اعلان کر دیا گیا:

''اور اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت نہ بدلے۔''

فقط و السلام! واللہ اعلم بالصواب